گھر کے اندر گھر کے باہر

ممتاز عرب خواتین کے انٹرویوز

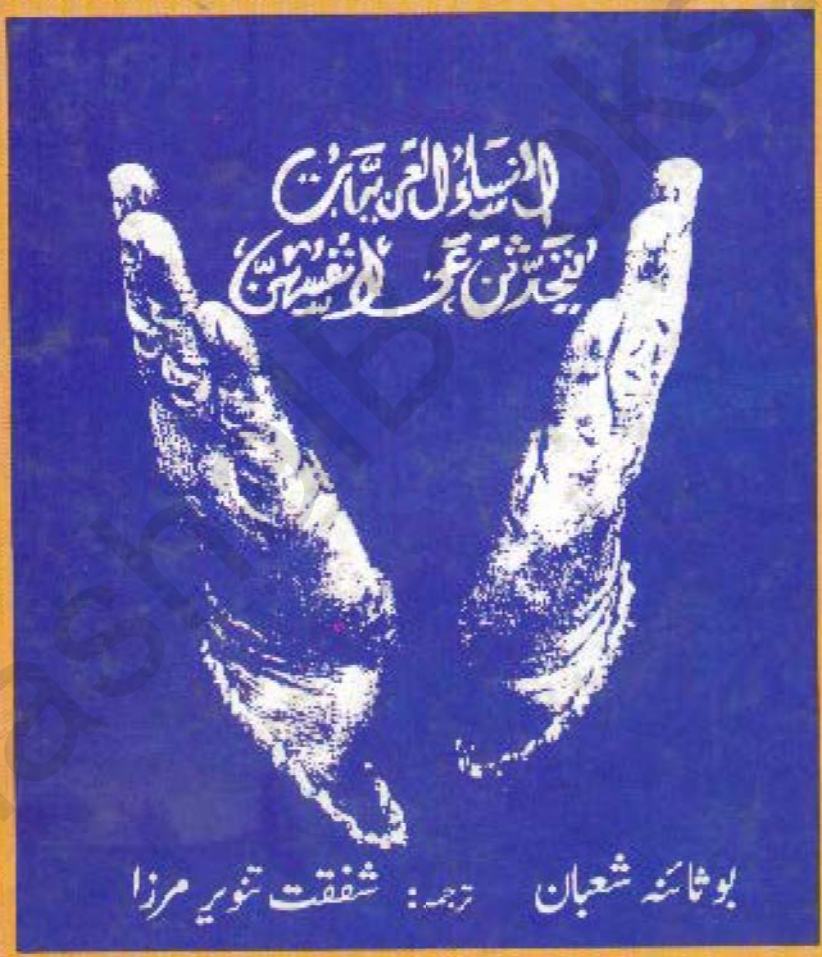

بوثائنہ شعبان ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

مشعل

MashalBooks.org

گھر کے اندر
گھر کے باہر

بثینہ شعبان

ترجمہ:

شفقت تنویر مرزا

مشعل بکس

آر بی۔5، سکینڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.org

Bouthaina Shaaban: Both Right and left Handed Arab womenTalk about their lives

بثینہ شعبان: گھر کے اندر گھر کے باہر

Copyringth C English 1988: Bouthaina Shaaban

کاپی رائٹ انگریزی 1988ء بثینہ شعبان

Copyringth C Urdu 1994: **Mashal Pakistan**

کاپی رائٹ اُردو 1994ء مشعل پاکستان

RB.Awami Compliex Usman Block New Garden Town Lahore Pakistan

آر بی۔5 عوامی کمپلیکس عثمان بلاک نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، پاکستان

Translation: Shafqat Tanveer Mirza

ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

Publisher: **MASHAL BOOKS**

پبلشرز: مشعل بکس

MashalBooks.org

عربی نام

عالم عرب کے مختلف علاقوں میں لہجے کے اختلاف کے باعث انسانوں اور مقامات کے ناموں کے ہجے اور تلفظ میں بڑا فرق ہے۔ بعض علاقوں میں فرانسیسی اثرات کے تحت ہجے اور تلفظ بالکل ہی مختلف ہو گئے ہیں۔ بعض کلاسیکی عربی نام بھی ہمارے لیے نئے ہیں۔ اس کتاب میں عربی ناموں کے صحیح تلفظ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ہم جناب سجاد رضوی کے شکر گزار ہیں کہ اس سلسلے میں اُنہوں نے ہماری مدد فرمائی۔

MashalBooks.org

فہرست

تعارف: عرب عورت کا انکار	7
شام ..... سب حقوق حاصل مگر گھر میں کچھ نہیں	39
حقوق کی مکمل ضمانت ..... مگر بیرون خانہ	39
مقبولہ شالاق	50
لبنان: برسرپیکار عورتیں	68
فلسطین	97
عورتوں کا طریق بقا	98
الجزائر: شریک جدوجہد	161
پس چہ باید کرد	226

MashalBooks.org

تعارف

عرب عورت کا انکار

1982 میں لندن میں قیام کے دوران مجھے یہ کتاب مرتب کرنے کا خیال آیا۔ وہ بہت لمبا اور تکلیف دہ زمانہ تھا ان دنوں اسرائیل لبنان پر حملہ آور ہوا تھا۔ ہر روز ٹیلی وژن کی سکرین بیروت میں ملبے سے نکالے جانے والی عورتوں اور بچوں کی مردہ اور نیم مردہ لاشوں سے داغدار ہوتی۔ اسی موسم گرما میں میرا پہلا حمل تھا اور جیسے جیسے بچہ میرے پیٹ میں حرکت کرتا میں ماں بننے کے خیال سے بہت جذباتی بھی ہو جاتی لیکن مستقبل کا دھڑکا لگا رہتا۔ مجھے بیروت کی ماؤں، لبنان کے غم زدہ شہروں اور مہاجر کیمپوں کے بارے میں سوچتی جو اس جدوجہد میں شامل ہیں مگر اس کے خلاف خود مہم شروع بھی نہیں کرتیں۔

پھر ایک برس بعد میں نے دیکھا کہ لبنانی اور فلسطینی عورتوں نے اپنے آنسو پونچھ لیے، زخموں پر پٹیاں باندھ لیں اور بندوق اٹھا کر جوابی مجاہدانہ جدوجہد کا آغاز کر کے دنیا کو حیران کر دیا۔ مضمل تابع فرمان قسم کی عرب عورت نے مخصوص بے حسی کا دامن چاک کر دیا۔ اب وہ تابع فرمان مائیں اور بیٹیاں نہیں رہی تھیں ایسی تابع فرمان عورتیں جن کا تقاضا متعدد عرب ممالک میں قانوناً کیا جاتا ہے۔ میں نے عہد کیا کہ میں اپنے لوگوں کے بارے میں کچھ جان پہچان پیدا کروں گی چنانچہ اس تحریک کے سبب ہی میں نے یہ کتاب لکھ ڈالی۔

میں الجزائر میں کام کر رہی تھی وہاں شام گئی (میں شام میں پیدا ہوئی تعلیم پائی اور پروان چڑھی اور ان دنوں وہیں رہتی ہوں) پھر لبنان گئی۔ میں نے ان سب جگہوں پر عورتوں سے انٹرویو کیے۔ شام اور لبنان میں مقیم فلسطینی عورتوں سے بھی ملی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ یہ عورتیں خود اپنی حالت زار لبوں پر لائیں، اپنی اپنے انداز میں سنائیں اور اگر ممکن ہو تو اپنے بہت ہی پوشیدہ رکھے گئے احساسات کا بھی اظہار کریں۔ میں توقع کرتی ہوں کہ اس طرح مجھے جو تجربہ حاصل ہوا۔ اس میں عرب اور یورپی عورتیں بھی حصہ دار بنیں گی اور خود ان جنگ آزما پیشہ ور، سیاستدان، کسان عورتیں اور شہیدوں کی باوفا بیویوں اور ماؤں کی آواز سن سکیں گی۔ ان انٹرویوز میں میں نے بہت

MashalBooks.org

ہی کم دخل دیا۔ میں خود کو ایک ایسا مائکروفون بنایا جس پر میرے مقررین بول سکیں اور پڑھنے والے طبقے، نسل اور ثقافتی تفاوت کے باوجود سن سکیں۔ میں اس سارے عمل میں بڑی پر اعتماد رہی۔ جن عورتوں سے میں نے بات کی انہوں نے اپنے دل کھول کر رکھ دیئے۔ انہوں نے بے پناہ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اپنا حال بیان کیا اور بعض اوقات ایسے راز ہائے سربستہ بھی کہہ ڈالے جن کا ذکر اپنے عزیز ترین رشتہ دار سے بھی نہیں کریں گی۔

انہی خواتین کے اس حال احوال نے میرے اندر اپنی جنس کے لئے بے پناہ محبت اور تعریف بھر دی۔ میں نے عورتوں کو اپنے رویے اور ایمان کے اعتبار سے دلیر سپاہی، نڈر دانش ور، بے لچک ساتھی، محبت کرنے والی مائیں، اچھی دوست اور اکثر بے غرض اور پر خلوص پایا۔ اس صنف نازک کے پردے کے پیچھے میں نے اس جنس کو اعلیٰ اخلاقی اقدار، حوصلے اور روشن خیالی کا حامل پایا۔ مردوں کے ہاتھوں تراشی اس دنیا میں عورتوں کو اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے یہ کرنا ہے کہ ہم عورتیں ایک دوسرے کی حقیقت سے آشنا ہوں ایک دوسرے کو جاننے کے مواقع پیدا کریں۔ اور یہ ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کا عمل یقیناً آفاقی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی عمل کا حصہ ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب ایک معاشرتی مطالعہ یا تجزیہ نہیں ہے۔ اس میں اعداد شمار سے کم ہی کام لیا گیا ہے۔ نہ ہی اس کے ذریعے عرب دنیا میں عورت کے سیاسی، سماجی اور تاریخی مقام کا تجزیہ کیا گیا ہے نہ اس کے ذریعے ان حکومتوں کی خوش کن سرکاری تصویر پیش کی گئی ہے جنہیں یہ دعویٰ ہے کہ وہ عورتوں کی آزادی کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ ایک طرح سے ذاتی سی کتاب ہے ایک کوشش ہے تاریخ کے ایک جلتے ہوئے لمحے میں گرفتار عورتوں کیلئے وہ اپنے تجربات میں دوسروں کو بھی شریک کر سکیں۔

جن عورتوں کے انٹرویوز اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں ان کا تعلق چار مختلف قومی گروپوں سے ہے میں نے مختلف سماجی طبقات کی عورتوں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی ہے تاہم یہ انداز بھی سائنٹیفک نہیں ہے۔

میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ اس کتاب میں عورتوں نے جو جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ میری اپنی آرا کے مرہون منت نہیں ہیں یعنی ان پر میری سوچ کا سایہ نہیں۔ یہ صرف اور صرف ان کے اپنے افکار ہیں۔ لازم نہیں کہ ان میں میری رائے کی آمیزش ہو میں نے اپنے افکار اور حالات زندگی الگ سے بیان کر دیئے ہیں۔

MashalBooks.org

عرب خاتون کا انکار

1968ء کا ذکر ہے یہ روشن صبح تھی، بچے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ایک لہر کی طرح میرے گاؤں سے علاقے کے واحد سیکنڈری سکول کی طرف جا رہے تھے۔ سکول ذرا آگے پولیس سٹیشن کے ساتھ دوسرے گاؤں کے شروع میں ہی واقع تھا۔ تعلیم مخلوط تھی۔ ہم نے اس وقت تک لڑکیوں اور لڑکوں کے الگ الگ سکولوں کے چونچلوں کا سنا تک نہ تھا۔ چند برس بعد جب ہم نے سنا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ سکول بھی ہوتے ہیں تب بھی ہمیں یہ مخلوط سکول ہی اچھا لگا۔

میرا سکول میرے گھر سے تین میل کے فاصلے پر تھا اور مسلسل چھ برس کے خوبصورت عرصہ میں دن میں دو بار یہ فاصلہ میں اپنے قدموں سے ناپا کرتی تھی۔ گرمی ہو یا سردی، ٹھنڈی صبح ہو یا گرم دوپہر ہم پاپیادہ سکول آتے جاتے رہے اور اس احساس ممنونیت کے ساتھ کہ ہمارا سکول اتنا قریب ہے۔ کچھ سکول بہت ہی دور تھے۔ ہم لڑکوں کے ساتھ مل کر علم حاصل کر رہی ہیں۔۔

سکول جاتے ہوئے ابھی پولیس سٹیشن کے پاس ہی پہنچی تھی کہ میں نے اپنے ہم جماعت عزیز کو گاؤں کے درمیان والی پہاڑی سے بڑا خوش خوش اترتے ہوئے دیکھا۔ وہ خون آلود خنجر لہرا رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا ''میں نے اسے قتل کر کے خاندان کا ناموس بچا لیا ہے۔'' وہ دو پولیس والوں کی طرف بڑھا جو تھانے کے باہر کھڑے تھے۔ خنجر ان کے سپرد کیا اور اونچی آواز میں، جو ارد گرد موجود ہر کسی کو سنائی دے سکتی تھی کہا میں نے اپنی بہن کو مار دیا ہے اور خود کو قانون کے سپرد کرنے آیا ہوں تا کہ مجھے انصاف مل سکے۔ پھر تینوں بڑے رسان سے باتیں کرتے تھانے کے اندر چلے گئے۔ وہ منظر میرے ذہن پر نقش ہو گیا، میں سکول چلی گئی۔ اس روز پہلا سبق ایک نوجوان استاد نے دیا جو عیسائی تھا۔ وہ جب کلاس روم میں آیا تو اس کے چہرے پر موت ایسی زردی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ اپنے شاگردوں کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے بالکل سامنے بیٹھی دو بہنوں سحر اور ثمر سے سوال کرنا شروع کر دیئے ''اس نے کسے قتل کیا؟ تمہارا باپ کہاں تھا کیا وہ چیخی چلائی تھی؟۔'' رکتے رکتے لڑکیوں نے بتایا کہ وہ یمن کے ساتھ ایک ہی بستر میں سو رہی تھیں، یمن عزیز کی بہن تھی، جب وہ جاگی اس وقت تک یمن کو مار دیا گیا تھا بستر میں لہو کا ایک تالاب سا تھا۔

MashalBooks.org

یمن سولہ سال کی تھی۔ان دنوں بیروت کے کچھ کھاتے پیتے گھرانوں میں ہمارے گاؤں کی نوکرانیاں کام کرتی تھیں۔گاؤں کے لوگوں نے ایسی لڑکیوں کو افسر کہنا شروع کر دیا تھا کیونکہ فوجی افسروں کی اچھی تنخواہیں ہوا کرتی تھیں۔گاؤں کے کچھ ایسے خوش قسمت کنبے بھی تھے جن کی تین تین چار چار بیٹیاں بیروت میں ''افسر'' تھیں۔ان کے والد سال میں ایک مرتبہ انہیں ملنے اور ان سے پیسے لینے جایا کرتے تھے۔وہ واپسی پر بیروت کی حیران کن زندگی کے بارے میں بڑے فخر سے باتیں کرتے۔شاید پہلی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ باپ بیٹی کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کرتے کیونکہ ہر نومولود لڑکی کا مطلب یہ ہوتا کہ اس سے ہر سال ایک ہزار لبنانی لیرا کی آمدنی ہوگی۔ جب لڑکیاں بالغ ہو جاتیں تو انہیں واپس لایا جاتا اور پھر وہ اپنے اپنے دلہا کا انتظار کرتیں۔

یمن کا باپ مر چکا تھا پس ماندگان میں تین بڑے بھائی اور ماں تھی۔یمن خود سات سال کی تھی۔آمدنی کا ذریعہ کوئی نہیں تھا چنانچہ تینوں بھائی یمن کو بیروت بھیجنے پر راضی ہو گئے تا کہ اس کی کمائی سے وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔یمن جب پندرہ برس کی ہوئی تو اسے واپس گاؤں لایا گیا۔اس وقت تک اس کے بڑے بھائی اے لیول تک پڑھ چکے تھے اور تیسرے بھائی عزیز کا ایک سال باقی تھا۔جب یمن گاؤں آئی' وہ منظر مجھے آج بھی یاد ہے۔اس نے نیلا سکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں گول سا ریڈیو تھا۔بال نیلے ربن میں بندھے تھے اور آنکھیں دھوپ والی نیلی عینک کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔دیہاتی معیار کے مطابق وہ بے انتہا سمارٹ لڑکی تھی۔جو لڑکیاں اسے ملنے گئیں ان کی اکثریت اس کے چست لباس اور شہری لب و لہجہ سے رشک کی حد تک متاثر تھیں۔یہ تھے یمن کے بارے میں لڑکیوں کے تاثرات۔مجھے یہ علم کہ لڑکیوں کی اس کے بارے میں کیا رائے تھی۔ممکن ہے کچھ گھاگ قسم کے لڑکوں نے اسے آسان شکار بھی سمجھا ہو۔

یمن کے آنے کے چند ماہ بعد ہی اندر خانے یہ باتیں شروع ہو گئیں کہ وہ حاملہ ہے۔یمن کی چچی اور ماں اسے کرائے کی ایک موٹر سائیکل پر نواحی قصبہ سلامیہ لے گئیں جہاں کے ڈاکٹر نے تصدیق کر دی کہ یمن حمل سے ہے۔اس کی ماں ڈر گئی کہ اگر وہ اسے واپس لائی تو بیٹے قتل کر دیں گے چنانچہ یمن کو لے کر ایک دوسرے گاؤں کے المختار (گاؤں کا چودھری یا سربراہ) کے پاس لے گئی کہ وہ لڑکی کو بھائیوں سے بچائے۔ہماری عربی روایات کے مطابق اگر کوئی کسی کے گھر میں داخل ہو کر امان مانگتا ہے تو اسے امان دی جاتی ہے۔تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اسی روائت

کے مطابق امان پانے والے الدخیل کے گھر کے اندر تحفظ کے دوران میزبان اپنی جان کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ المختار نے یمن کو اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ کر دیا اور وہ اس کی ہر اعتبار سے حفاظت کر رہا تھا تا آنکہ ایک رات چاندنی میں عزیز دیوار پھلانگ کر اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں یمن دوسری دو لڑکیوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ تیز دھار خنجر سے اس نے یمن کا گلا کاٹ دیا۔ اکثر مجرم تو ایسی واردات کرنے کے بعد کوئی نشان تک چھوڑ کر نہیں جاتے، اس کے برعکس عزیز نے گرم اور معصوم خون میں اپنے ہاتھ ڈبوئے اور پھر اپنی عزت پر لگے داغ دھو ڈالنے کے کامیاب عمل کا سرعام اعلان کرنے کی خاطر فاتحانہ انداز میں باہر آ گیا۔

عزت و ناموس گنوانے والے جب مارے جاتے ہیں تو ان کی لاشوں کے کفن دفن کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان کی لاشوں کے لئے قسم کے احترام سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ان کے فعل پر پردہ ڈالنے کی یاد رگذر کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ المختار کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ گاؤں کے بچوں کو بلاتا اور ان سے کہتا کہ وہ لاش گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع قبرستان میں لے جائیں۔ بچے یمن کی لاش کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔ اس کے حاملہ پیٹ پر پتھر مار رہے تھے اور اس پر تھوکتے جاتے تھے۔ ہم نے سکول سے واپسی پر دیکھا کہ قبرستان میں اس کی ننگی لاش ابھی تک پڑی ہے جیسے کوئی مردہ بھیڑ ہو۔ ہم میں سے کسی نے اس سے ہمدردی کا ذرا سا بھی اظہار کرنے کی جرات نہیں کی۔ البتہ اگلے روز اکثر لڑکیاں سکول نہیں گئیں وہ اس المناک منظر کو دوبارہ نہیں دیکھا چاہتی تھیں۔ دو دن بعد پتہ چلا کہ یمن کی لاش کو یا تو درندے لے گئے ہیں یا کسی نے رحم کھا کر رات کی تاریکی میں اسے دفن کر دیا ہے۔ دفن کرنے والے نے ایسا وقت منتخب کیا جب اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔

عزیز کو صرف چھ ماہ کی قید ہوئی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ وہ جیل سے ایک ہیرو کے سے انداز میں برآمد ہوا اور گاؤں کے معتبر افراد میں شمار ہونے لگا۔ کچھ عرصہ بعد وہ پیسے کمانے خلیج کے ممالک چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے گاؤں میں بیکری کھول لی اور گاؤں والوں کو اپنے ان ہاتھوں کی پکی روٹی کھلانی شروع کر دی جن سے اس نے اپنی بہن کا گلا کاٹا تھا اور جو اسکے خون میں ڈبوئے گئے تھے۔

اس خوفناک واقعہ کے بعد میں نے امتحان (بیکالارٹ) پاس کر لیا اور مجھے یونیورسٹی میں تعلیم جاری رکھنے کے لئے وظیفہ بھی دیا گیا۔ میں اس گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جو دمشق کی یونیورسٹی

میں پڑھنے کے لئے بغیر کسی مرد رشتہ دار کی ہمراہی کے، گاؤں سے چلی تھی۔ میرے جانے کے بارے میں نہ گھر پر اور نہ ہی گاؤں میں کوئی اعتراض اٹھا اسکے برعکس لوگ میری کارکردگی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے ارادے کی بڑے فخر کے ساتھ تعریف کرتے۔

صدر اسد 1970ء میں برسر اقتدار آئے۔ ان کے آنے کے بعد قومی ترقی کے لئے ترقی پسندانہ پالیسیاں شروع کی گئیں اور تعلیم کے شعبہ میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی۔ ہر کہیں سکول تعمیر کئے گئے اور چھوٹے سے چھوٹے اور انتہائی دور افتادہ دیہات میں بھی مفت تعلیم کا انتظام کر دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کے لئے روزگار، اعلیٰ ملازمتوں، اور دیہات سماجی اور سیاسی عہدوں کے حصول کے لئے تعلیم ایک کلید ثابت ہوئی۔ جب میں نے بی اے کیا تو مجھے برطانیہ میں مزید پڑھائی کے لئے وظیفہ دیا گیا۔ میں ان معدودے چند شامی خواتین میں سے تھی جو دنیا کے مختلف حصوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملک سے نکلی تھیں۔

یہ ایک انہونی سی بات تھی۔ ہمیں ساتھیوں دوستوں اور عزیزوں نے بڑا حوصلہ بھی دیا اور امداد بھی۔ یہ 1976 کی بات ہے۔ ایک سال سے بھی کم عرصہ میں میں نے واروک یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور پی ایچ ڈی کرنے کیلئے نام لکھوا دیا۔ واروک میں ہی ایک عراقی سے واقفیت ہوئی جو فزکس میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ ہم دونوں عربوں کی تنظیم میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ بہت اچھی مفاہمت سی ہوگئی جب ہم نے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا تو میں نے ضروری جانا کہ اپنے والد سے مشورہ کر لوں۔ انہوں نے مجھے بیرون ملک سفر پر جانے کی اجازت دی تھی اور شادی کی اجازت دینا ان کی سماجی ذمہ داری تھی۔ تاہم میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں برطانیہ میں شادی کر رہی ہوں کیونکہ یہ اسی قسم کا جرم تصور ہوتا جو یمن سے سرزد ہوا تھا۔ میرے والد کو میری اسی خودسری پر بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے خطوں کے ذریعے اس معاملے پر فیصلہ دینے سے انکار کرتے ہوئے ہم دونوں کو شام بلایا۔ ہم مان گئے۔ اس ملاقات کے بعد 1979ء کی گرمیوں پھر 1980ء اور پھر 1981ء کی گرمیوں تک میرے خاندان اور میرے درمیان خاندان کے حقوق و فرائض اور ذاتی حقوق کے مسئلے پر گرما گرم بحث مباحثہ جاری رہا۔ جس شخص کو میں نے منتخب کیا تھا اس سے ملاقات کے بعد خاندان نے مجھے بہت مجبور کیا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی قومیت بھی مختلف تھی اور دین بھی۔ مگر یہ دو تو ظاہری وجوہ تھیں ان کے در پردہ زیادہ سنگین اور سنجیدہ امور تھے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ میں پہلی عورت تھی جس نے باپ اور بھائیوں کی

MashalBooks.org

اشیر واد سے آزاد ہو کر اپنے خاوند کا انتخاب کیا تھا۔ میرے والد بار بار یہ کہتے کہ گاؤں والے کیا کہیں گے کہ بیٹی اپنے خاوند کو ساتھ لے کر آئی اور اس کے دباؤ میں آ کر بزدل باپ نے بیٹی کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ میرے تمام بڑے بھائیوں نے اپنی اپنی مرضی سے بیاہ رچائے تھے اور ان موقعوں پر باپ کو بھی بلایا تھا مگر یہ بھائی ایسا ہی حق مجھے دینے سے انکاری تھے محض اس لئے کہ وہ مرد تھے اور میں عورت۔ میں نے ان کی خواہش کو مسترد کر دیا۔ ہر چند میرے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں نے میرے حمائت کی مگر تمام مباحث اور پر جوش دلائل دو متضاد اور مختلف نقطہ نظر۔۔۔ مردانہ اور زنانہ۔۔۔ کو قریب نہ لا سکے۔ آخر کار میرے والد نے مجھے الٹی میٹم دے دیا کہ یا تو میں اپنے انتخاب کو ترک کر دوں یا گھر چھوڑ دوں اور کبھی والدین کو منہ نہ دکھاؤں۔ مجھے ایسے فیصلے کرنے سے سخت نفرت ہے مگر مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ حاصل کلام یہ کہ میں نے گھر والوں کو خدا حافظ کہا اور میں اور میرا شوہر حمس چلے گئے جہاں ایک سادہ سول انداز میں ہم نے شادی کر لی۔ یہ 1981 کے شروع موسم گرما کی بات ہے تب سے اب تک میری گھر والوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یمن کے قتل کے دس سال کے اندر اندر فضا ایسی تبدیل ہوئی تھی کہ میرے باپ اور بڑے بھائی من مرضی کی زندگی گذارنے سے روکنے کے لئے مجھ پر جسمانی تشدد کرنے کا سوچ تک نہ سکے۔ وہ مجھ پر زیادہ سے زیادہ اخلاقی اور نفساتی دباؤ ڈال سکتے تھے مگر وہ بھی کارگر نہ ہوا۔ مزید یہ کہ میں نئی نسل کے لئے ایک مثالی راہ نما بن گئی جس کی قربانی کا ثمر نئی نسل کو نصیب ہوا مثلاً میری ایک چھوٹی بہن نے صرف اپنی پسند کے مرد کا نام بتایا اور والد نے اسے دعائیں بھی دیں اور اچھے اچھے تحفے بھی۔

اگر چہ شادی کے مسئلے پر میری اور گھر والوں کی تلخ تر اور فیصلہ کن جنگ ہوئی مگر عورت کی حیثیت سے یقیناً یہ میری واحد جنگ نہیں تھی۔ میں نے جتنی بھی جنگیں لڑیں وہ صرف اور صرف اس لئے لڑنا پڑیں کہ میں عورت تھی۔ بعض اوقات گھر کا اچھا بھلا خوش کن ماحول مردانہ جہنم بھی بن جاتا ہے۔ کبھی یہ احساس مسرت کہ آپ میں لکھنے کی اہلیت آ گئی ہے چھپانا پڑتا ہے کہا سے بھی شرارت نہ سمجھ لیا جائے پھر اس کا دفاع کرنا پڑتا ہے۔ کسی نوجوان عورت کو اس کے پر پیچ مسائل میں سے نکلنے کا مشورہ حاصل کرنے کے لئے کسی مرد سے اس کے دفتر میں ملاقات جنسی دست درازی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حتیٰ کہ جب یہ انکشاف ہو کہ عورتوں کی یونین کو درپردہ مرد چلا رہے ہیں تو پھر مردانہ جہنم کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

MashalBooks.org

ہم نو بہن بھائی تھے، یہ ایک اوسط خاندان شمار ہوتا ہے پانچ لڑکے چار لڑکیاں۔۔۔تین بھائی بڑے تھید و چھوٹے۔ایک بہن بڑی تھی اور دو چھوٹی۔ مجھے ہمیشہ میرے عورت ہونے کا احساس بھی دلایا گیا اور یہ بھی کہ میرے عورت ہونے کی وجہ سے خاندان کے ننگ و ناموس کو ہر وقت خطرہ لاحق ہے۔۔۔تاہم مجھے احساس ہوا کہ میرے والد مجھے بہت چاہتے ہیں۔وہ مجھے ہمیشہ ملکی کے نام سے پکارا کرتے تھے جس کا مطلب ہے ملکہ۔وہ مجھ سے شعر سنانے کی فرمائش کرتے یا یہ کہتے کہ میں ملنے کے لئے آنے والوں کے سامنے ملکہ بن کر دکھاؤں۔انہوں نے پوری کوشش کی کہ ان کی بیٹیوں کی تعلیم بھی بیٹیوں کے برابر ہو۔جب میں بالغ ہوئی تب انہیں میری نقل و حرکت پر شبہ ہونے لگا۔ ہر چند انہوں نے نہ تو دمشق میں اور نہ ہی برطانیہ میں میرے تعلیم حاصل کرنے کی مخالفت کی مگر ہمارے درمیان اس بات پر خاموشی معاہدہ تھا کہ میں لڑکوں سے دوستی نہیں کروں گی۔

برطانیہ کے سفر پر مجھے الوداع کہتے ہوتے انہوں نے میرے کان میں کہا مجھے تم پر اعتماد ہے کہ تم وہاں وہ نہیں کروگی جو انگریز عورتیں کرتی ہیں (یعنی تمہارے بوائے فرینڈز نہیں ہوں گے)۔میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔لیکن اب جب میں اپنے والد کے بارے میں غور کرتی ہوں تو میرے ذہن میں ان کی کس قدر مختلف بلکہ متضاد تصویریں ابھرتی ہیں۔بچپن میں ایک بہت پیار کرنے والے میری تعلیم میں بڑی دلچسپی لینے والے باپ کی تصویر ابھرتی ہے۔پھر وہ ایک جابر آقا کی صورت میں ابھرتے ہیں۔ایک فطری سی بات یعنی میرے بلوغت نے میرے والد کے لئے یہ لازم کر دیا کہ وہ میرے زندگی پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیں۔جب مجھے خلیل سے محبت ہوئی تو میں نے والد کا انتہائی خوفناک روپ دیکھا۔وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرنے والے ہیں مجھ پر یہ بات ان دونوں منکشف ہوئی جب میں لندن میں تھی۔یہ صورت حال ڈراؤنے خوابوں کی سی تھی۔ہم **1979**ء میں والدین سے ملے تھے تب والد نے بڑی سختی سے مجھے شادی سے منع کر دیا تھا۔پھر انہوں نے دھمکی بھرے خطوں کی بارش کر دی۔مجھے یاد ہے میں دو دو دن تک ان کے خط کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔پھر میری دوست جولی آجاتی اور خوشی خوشی خط اٹھا کر دیتی ''آہا خط گھر سے آیا ہے۔'' میں اس کا شکریہ ادا کرتی اور خط لے کر ایک طرف رکھ دیتی مجھے سات سات دن تک اسے کھول کر پڑھنے کی ہمت نہ پڑتی۔کم از کم پورے ایک ہفتے کا عذاب برداشت کر کے صرف ایک خط پڑھنے کا حوصلہ ہوتا۔ان خطوں میں اکثر دھمکیاں ہو

تیں کہ اگر میں نے خلیل سے ترک تعلق نہ کیا اور کہا نہ مانا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ میرے بھائی اور بہن خط لکھتے اور خدا کا واسطہ دیتے کہ میں اس شخص کو چھوڑ دوں کیونکہ میرے باپ نے میری چھوٹی بہن (ناہید) کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں کیونکہ ناہید میرے بہت قریب تھی۔ اس سے کہا جاتا تھا مجھے خلیل کو چھوڑنے پر راضی کریں ورنہ میری جگہ ناہید کو ختم کر دیا جائے گا۔۔۔ ناہید نے میری خاطر جو جو سختی برداشت کی اس کی دلجوئی کے لئے ہی میں نے اپنی بیٹی کا نام ناہید رکھ دیا۔

اور بات یوں بھی نہیں تھی۔ کہ برطانیہ میں میں نے اپنی ثقافتی زنجیروں سے آزادی حاصل کر لی تھی اور خلیل کو بوائے فرینڈ بنا لیا تھا۔ میری جس طور پر پرورش ہوئی تھی اس اعتبار سے میں کسی ایسے مرد کے ساتھ سونے کا تصور تک نہیں کر سکتی تھی جو میرا شوہر نہ ہو میں تو صرف اپنا شوہر منتخب کرنے کا حق چاہتی تھی۔

جب میں چھوٹی تھی اور جب کبھی گھر یا باہر والوں سے کسی بات پر ناراض ہو جاتی تو میں کاغذ پر کچھ لفظ لکھنا شروع کر دیتی تھی۔ جو کچھ میں لکھتی اسے محفوظ جگہ پر چھپا دیا کرتی کہ مجھے ڈھڑکہ رہتا کہ میرے والد اور بھائی اسے پسند نہیں کریں گے۔ ایسی تحریر کے بعد میرا بوجھ ہلکا سا ہو جاتا میں ایک طرح کی راحت محسوس کرتی۔ جب میں ہائی سکول میں پہنچی تو مجھے پتہ چلا کہ میں جو کچھ لکھتی تھی وہ اصل میں شاعری ہوتی تھی۔ اب میں شاعری کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے لگی تھی۔ جب یونیورسٹی پہنچی تو شاعری سے رشتہ اور گہرا ہو گیا۔ ایک تو اسے لئے کہ میں گھر سے دور تھی یعنی زیادہ آزادی بھی تھی اور شاعری لکھتے وقت پکڑے جانے کا خدشہ نہیں تھا دوسرے اس لئے کہا اب مجھے شاعری کا بہتر وقوف حاصل تھا۔ یونیورسٹی میں سال دوم میں میں نے شاعری کے مقابلے میں حصہ لیا اور پہلا انعام حاصل کر لیا۔ جب چھٹیوں میں میں گاؤں گئی تو میرے سکول کی سہیلیاں، دوست اور سکول کے اساتذہ مجھے ملنے آئے اور وہ نظم سننے کی فرمائش کی جس پر مجھے اول انعام ملا تھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی قابل اعتراض فرمائش نہیں تھی۔ میں آدھی نظم سنا چکی تھی کہ میرا ایک بھائی دھڑ سے اندر آیا (ظاہر ہے کہ وہ کمرے کے باہر چھپ کر سن گن لے رہا تھا) میرے ہاتھ سے نظم چھینی اور والد کو آواز دی کہ آئیں دیکھیں ان کی صاحبزادی یونیورسٹی میں کیا کرتی رہی ہے۔ بلاشبہ یہ نظم یہ بھائیوں کے اخلاقی دوغلے پن کے بارے میں تھی کہ بھائی کس طرح بہنوں کے لئے الگ پیمانہ رکھتے ہیں اور اپنے لئے اس سے بالکل مختلف معیار رکھتے

ہیں۔میرے بھائی نے کہا کہ یہ نظم دراصل اس کی ہجو ہے (جزوی طور پر بات صحیح بھی تھی)اس نے مہمانوں کے سامنے مجھے طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا شروع کردیا میرے مہمان مجھے میرے ناراض والد اور مغلوب انعضب بھائی کے رحم وکرم پر چھوڑتے ہوئے ایک ایک کر کہ کھسک گئے۔میرے کاغذ ٹکڑے ٹکڑے کردیئے گئے۔میری قیمتی نظمیں کھڑکی سے باہر پھینک دی گئیں اور مجھے بری طرح مارا گیا مجھے تو یاد نہیں کی جسمانی طور پر مجھے کتنا پیٹا گیا تھا اور مجھے کتنی تکلیف ہو ئی تھی تا ہم مجھے یہ یاد ہے کہ اس سے میری بے حد بے عزتی ہوئی تھی میری چیخیں سن کر میری بھابھی بھاگی بھاگی آئی مجھے بھائی کے بازوؤں سے چھڑایا اور اسے کمرے سے باہر دھکیل دیا ۔پھر اس نے دروازہ بند کیا میری آنکھوں میں دیکھا اور کہا تم ان کی وہشت سے واقف ہو۔تم شاعری کرتی کیوں ہو تم جانتی ہو کہ تم لندن میں نہیں رہتیں تم سعودیہ میں ہو، مجھے دیکھو، میں نے کبھی شاعری نہیں لکھی اور نہ ہی میری بہنوں میں سے کسی نے یہ کام کیا ہے۔

میں نے چلا کر کہا آپ کا مطلب کیا ہے کیا کوئی کوشش کر کے شاعری کرسکتا ہے؟ جو بھائی مجھے نظم لکھنے پر مار رہا تھا کیا وہ ایک بھی نظم لکھ سکتا ہے۔۔۔۔۔میں چپ ہونے کی کوشش کر رہی تھی مگر آنسو بھی میری سوجے ہوئے خشک ہونٹوں پر لرز رہے تھے۔

''چپ چپ'' مجھے خاموش کرنے کے لئے اس نے کہا انہیں ایسی باتوں کا پتہ نہ چلے انہیں چیلنج بھی نہ کرو خود سر نہ بنو۔میرا بھائی کمرے کے باہر کھڑا سب کچھ سن رہا تھا اس نے ٹھڈا مار کر دوازہ کھولا دوسرے لمحے وہ میرے سامنے ایک سیاہ ستون کی طرح کھڑا غصے سے کانپ اٹھا۔تم کبھی یونیورسٹی نہیں جاؤ گی غصے میں پاگل ہو کر وہ غرایا تم سمجھتی ہو کہ تم کوئی خاص چیز ہو۔میں تمہیں دکھاوں گا کہ تم کچھ بھی نہیں ہو؟ف

ہر چند میں یونیورسٹی سطح پر اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہوں شاعری پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی لے لی ہے لیکن میں اب بھی اس واقعہ کے حوالے سے محسوس کرتی ہوں کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس روز میرے اندر کا کوئی ٹکڑا چیر کر الگ کر دیا گیا تھا جو آج تک واپس اپنی جگہ پر بہم نہیں کر سکی۔

ایک سال یوں ہوا کہ میری ایک پوسٹ گریجوایٹ طالبہ کورس درمیان سے چھوڑ کر چلی گئی۔میں پریشان ہوگئی اور چاہا کہ اس کے اس طرح چلے جانے کی وجوہ پوچھوں،اس وجوہ کا علم ہوا تو مجھے صدمہ ہوا۔جب اس کی سہیلیاں چلی گئیں تو اس نے قصہ شروع کیا''میں شادی شدہ

ہوں میرے دو لڑکے بھی ہیں۔ میرا خاوند امیر آدمی ہے خوش خوراک اور آرام طلب ۔۔۔ اس کے خاندان میں عورت کا کام کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ اگر ان کی بہو محض مزید تعلیم حاصل کرنے کی بات کرے تو وہ اس پر بھی خفت محسوس کرتے ہیں۔ میری ساس کا کہنا ہے کہ اگر ہماری بہو مزید پڑھنے کے لئے جائے گی تو ہمسائے یہ خیال کریں گے کہ گھر میں یقیناً گڑبڑ ہے جس کی بنا پر بہو نے یہ غیر معمولی مشغلے شروع کر رکھے ہیں۔ ایک دن میرے سسر نے بھی مجھ سے پوچھا ''تمہیں پڑھنے کی ضرورت کیا ہے؟'' ۔۔۔ ''میرے، سماجی رشتے، یا وقار کے لئے؟ تمہیں کس شے کی کمی ہے؟ یہ سب چیزیں بلکہ ان سے زیادہ تو تمہیں پہلے حاصل ہیں آخر تم طارق محمود کی بیوی ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم اپنی ہم جولیوں اور ساتھیوں کے ساتھ پائی جاؤ یا یونیورسٹی میں ان کے ساتھ چائے پیو یا ایک معمولی لڑکی کی طرح برٹش کونسل میں کتابیں ڈھونڈتی پھرو۔''

اس نے مجھے بتایا ''میں ادب میں کچھ کرنا چاہتی تھی مگر مجھے یہ موقع گنوانے کا بڑا دکھ ہے یونیورسٹی کے زمانے میں بھی میرے دو بیٹے تھے اس کے باوجود میں نے بی اے آنرز کیا اور اپنے شعبہ میں اول رہی۔ لگتا ہے بی اے کرنے تک تو کسی کو اعتراض نہ تھا مگر اس سے آگے یعنی ایم اے یا پی ایچ ڈی کرنے کے خواب دیکھنے کی اجازت نہیں۔''

''تمہارے شوہر کے پاس یونیورسٹی کی ڈگری ہے؟'' میں نے پوچھا

''نہیں نہ ہی وہ اسے اس قابل سمجھتا ہے جسے حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی پڑے، اس نے مجھے الٹی میٹم دیا کہ یا تو میں اس کی گھر اور بچے چھوڑ دوں یا یونیورسٹی چھوڑ دوں۔ اب کوئی بھی راستہ نہیں بچا تھا، میرے دو بچے ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں، میں ان کی قربانی دے کر اپنی خواہش پوری نہیں کر سکتی۔''

''جب اس نے تمہاری راہ میں اتنی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں تو پھر تم اس سے پیار کیسے کرتی ہو'' میں نے حیران ہو کر پوچھا ''تم تو اس کا شکار بنی ہوئی ہو تو پھر تم اس کے پاس رہ کر کیا محسوس کرتی ہو؟''

ہم نے بہت دیر تک باتیں کیں مگر نتیجہ وہی رہا اس نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

کچھ مہینے بعد میں نے سنا کہ وہ تیسرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

برطانیہ اور الجزائر میں سات برس گذارنے کے بعد جب 1984ء میں میں واپس دمشق آئی تو یہ میرے لئے دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ پہلا دھچکا میری ایک پرانی دوست کی وجہ سے لگا جس

سے اتفاقاً میری ملاقات ہوگئی۔ میں حجام کی دوکان میں ''ڈیوائن کامیڈی'' پڑھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جو سلوک دوزخ میں گناہ گاروں کے ساتھ ہوتا ہے اس دنیا میں اس سے بڑا سلوک عورتوں سے ہو رہا ہے اس اثنا میں شیشے میں ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ مجھے اس چہرے کے بارے میں دانتے کے طریق فکر کے مطابق بیشمار باتیں یاد آ گئیں مگر اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ کبھی اس سے بڑی لمبی چوڑی دوستی تھی، اس زمانے کے بے شمار واقعات اور لطائف یاد آتے چلے گئے مگر یہ ساری معلومات اس کا نام یاد کرنے کے لئے رکاوٹ ڈالتی گئیں۔ میری اس سے کئی سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ گذارے شیریں لمحات آج بھی یادوں کا خزانہ تھے۔ جب اس نے اپنا سر اٹھایا اور مجھے اپنے سامنے آئینے پر نگاہیں جمائے دیکھا تو اس نے بھی اپنی آنکھیں جھپکیں، میری طرف غور سے دیکھا، کرسی سے چھلانگ لگا کر اٹھی اور اپنا سر میرے سینے میں چھپا لیا۔ ہم دونوں گلے ملیں۔ ایک دوسرے کو چوما اور پھر اپنی زندگی کے مشترکہ طور گذارے چھ سال کے بعد کے زمانے کے واقعات سے ایک دوسرے کو باخبر کیا۔ ابھی دس منٹ نہیں گذرے ہوں گے کہ اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اور رندھی ہوئی آواز میں کہا'' مجھے ابھی بال بنوانے ہیں پھر گھر پہنچ کر خاوند کے آنے سے پہلے پہلے کھانا تیار کرنا ہے۔

'' آج میری خاطر خاوند کو خود کھانا پکانے دو'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا کہ اس کا ردعمل کیا ہے۔

''مذاق کر رہی ہو'' اس نے کہا بڑے خاندانوں میں ایسا کبھی نہیں ہوتا اور میرے خاوند کا بھی تعلق ایسے ہی خاندان سے ہے۔''

''مجھے خبر ہے وہ نجوئی خاندان میں سے نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا (یہ نام میرے ذہن میں اتنی آسانی سے آ گیا کہ خود مجھے تعجب ہوا کہ اس کی وجہ کیا ہے)

''یقیناً ایسی بات نہیں ہے'' اس نے جواباً کہا ''مجھ پر جو گذری ہے سنو گی تو یقین نہیں کرو گی، میں وہ نہیں ہوں جو کبھی ہوا کرتی تھی۔''

کچھ دن بعد میں اس سے ملنے اس کے دفتر گئی۔ دفتر میں وہ ذہین، متحرک اور مستعد انجنیئر لگتی تھی۔ وہ بڑی سمارٹ تھی اور اپنے پیشے پر پوری طرح حاوی۔ لگتا تھا وہ با اعتماد بھی ہے خوش بھی اور مطمئن بھی۔ وہ جس خوش اسلوبی اور گرم جوشی سے اپنا کام کر رہی تھی لگتا تھا کوئی اتھلیٹ ہے جو مقابلے میں اترنے والی ہے میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو اس سے بھی بہتر نکلی جتنا کہ میں سمجھتی

تھی، مجھے یہاں آ کر اس سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی ہے۔

جب میں نے اجازت چاہی تو اس نے اصرار کیا کہ کھانا اس کے ساتھ کھاؤں اور اس کے شوہر سے بھی مل لوں۔ دریں اثنا میں اپنی دوست کو انجنیئرنگ کمپنی کی پراعتماد چیر دومن کی صورت میں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔

جیسے ہی ہم اس کی کار میں بیٹھ کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے اس کے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ وہ ایک دم بڑی فکر مند نظر آئی۔ راستے میں اس نے سلاد کے لئے ٹماٹر خریدنے کی کوشش کی مگر جب اچھے ٹماٹر نہیں ملے تو وہ اور بھی پریشان نظر آئی۔

''میرے میاں کو لنچ میں سلاد بڑا اچھا لگتا ہے اور حال یہ ہے کہ ٹماٹر ہی نہیں خرید پا رہی۔''

''چلو آج وہ اپنے من پسند سلاد کے بغیر ہی لنچ کر لیں گے۔'' میں نے کہا مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ تو اسی بارے میں زیادہ متفکر ہے۔ جیسے ہی ہم اس کے فلیٹ میں پہنچے اس نے ایپرن پہنا، میز لگائی۔ گزشتہ شام کے پکائے سالن وغیرہ گرم کئے اور پھر ادھر ادھر چکر کاٹنے لگی جیسے کوئی شے بھول گئی ہو۔ باہر ڈیوڑھی کی گھنٹی بجی وہ دوڑ کر آئینے کے سامنے آئی خود کو دیکھا بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر دروازے کی طرف بھاگی۔

''ہیلو ڈارلنگ'' اس نے اونچی آواز میں خاوند کو خوش آمدید کہا اور میں نے سنا۔ اس کے جواب میں اس کے خاوند مختصراً ہیلو کہا میں نے یہ بھی بمشکل سن لیا۔

''لنچ تیار ہے'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا جس کا یقینی جواب صرف سر کی جنبش ہوگی۔ وہ لباس تبدیل کرنے بیڈروم میں گیا، پھر وہاں سے ہاتھ دھوئے اس عرصہ میں اس کی بیوی نے پھر میز کا جائزہ لیا۔

ایک دوسرے سے تعارف اور ابتدائی کلمات مروت کے تبادلے کے بعد ہم نے لنچ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ میری دوست بڑے غور سے اپنے خاوند کے منہ اور آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اسے کھانا کیسا لگا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ داد نہیں چاہتی تھی صرف یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کے خاوند کو یہ کھانا گوارا ہے؟ چنانچہ اس معمولی سی بات پر اپنے قیمتی الفاظ ضائع کئے بغیر وہ صرف سر کی جنبش سے کھانے کی منظوری دے سکتا تھا۔ کھانے کی بعد اس نے اپنا سر دفتر سے ساتھ لائے اخبار کے پیچھے چھپا لیا جبکہ خاتون برتن دھونے اور صفائی کرنے کے بعد چائے بنانے لگی۔ ہم نے اکٹھے چائے پی اس دوران اس نے خاوند سے بڑی

مشکل سے چند الفاظ اگلوائے اور وہ بھی اس کے دفتر کے بارے میں۔ پھر وہ سہ پہر کو دوبارہ کام شروع کرنے سے پہلے معذرت کر کے آرام کرنے چلا گیا۔ بعد میں مجھے اسی دوست نے بتایا کہ وہ بھی انجنیئر ہے جو اس کی نہیں کسی دوسری فرم میں کام کرتا ہے اور کمپنی میں ترقی پانے کے لئے بھی کوشاں ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ بیوی اسے بہت چاہتی ہے۔ اس لئے وہ اسے کامیاب انجنیئر بنانے کی خاطر کوشش کرتی ہے۔ مگر وہ گھر میں اس قدر بے حیثیت کیوں بنی ہوئی تھی؟

''اس لئے کہ وہ زود رنج ہے، مزاج میں سختی ہے، میں نسبتاً پرسکون مزاج کی ہوں چنانچہ کوشش کرتی ہوں کہ اس کے اعصاب پریشان نہ ہوں'' اس نے یہ بات کر کے مجھے اپنی ایک ہمسائی کی یاد دلا دی جو ہر سہ پہر چار بجے اپنے بچوں کو لے کر سیڑھیاں اترتی اور کہیں بھی چلی جاتی تا کہ اس کا شوہر اچھی طرح قیلولہ کر لے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی ''سہ پہر اور پھر شام کو تازہ دم ہونا میرے شوہر کی ضرورت ہے۔''

شادی شدہ عورتوں کا یہ حال دیکھ کر مجھے پرکشش دوست بیوہ ام یاسین کی بات پر تعجب نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے گاؤں میں رہتی تھی میری ماں کی بڑی عزیز سہیلی۔ بیس برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی اس کے بعد اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ شوہر کی وفات کے وقت اس کا ایک بڑا لڑکا دو سال کا تھا۔ ایک مرتبہ میری ماں نے اسے کہا کہ کیا وہ دوسری شادی کرنا چاہتی ہے؟ یہ سن کر اس کے چہرے کے تاثرات جس طور ناگوار صورت میں ابھرے مجھے اب بھی یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا ''نہیں نہیں نہیں، کبھی نہیں؟ آخر کس لئے؟ ایک مرد کے لئے؟ میرے پاس میرا بیٹا ہے، میں اس کی بہترین تعلیم و تربیت کروں گی''۔۔۔ وہ ان پڑھ عورت تھی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا نہ اس کی کوئی جائداد تھی۔ دیہاڑی پر کام کیا کرتی تھی اور جو کماتی تھی اس سے ماں بیٹا اچھی بھلی گذر اوقات کرتے تھے۔ میرے گاؤں میں صرف وہی ایک بیوہ نہیں تھی جس نے دوسری شادی سے انکار کیا تھا، اور بھی ایسی بیوائیں تھیں جنہوں نے دوسری شادی سے انکار کیا، بچے یا بچوں کے ساتھ محنت مزدوری اور عزت پائی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں کتنی ہی بیوائیں ہیں مگر رنڈوا کوئی بھی نہیں۔ جب میں نے اپنے والد سے اس کی وجہ پوچھی تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ عورت کے مقابلے میں مرد خطرناک اور مشقت طلب کام کرتے ہیں۔ جنگیں لڑتے ہیں، کنوئیں کھودتے ہیں، پتھر توڑتے ہیں، کاریں چلاتے ہیں، ان کی زندگی میں خطرے بھی زیادہ ہوتے ہیں اور موت بھی۔ والد کا یہ نظریہ بھی اس وقت ادھڑنے لگا جب

ہماری گاؤں میں دو عورتیں زچگی کے دوران مر گئیں اور دو کا کینسر سے انتقال ہو گیا۔اس کے خاوندوں نے دوبارہ شادی کے لئے سوگ کے روایتی چالیس دن بھی پورے نہیں ہونے دیئے۔گاؤں میں ہر کسی کو اسی بنا پر ان مردوں سے ہمدردی تھی کہ نہ وہ بچوں کیلئے کھانا پکا سکتے تھے نہ صفائی ستھرائی اور کپڑے برتن دھونے کا کام کر سکتے تھے۔

اگر گاؤں میں بیواؤں کے ساتھ اس قسم کی ہمدردی کوئی نہیں جتاتا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان بیواؤں کو ایسی ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہمیشہ اس طرح لگتا تھا کہ وہ خوش اور مضبوط فرد ہیں جنہیں اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی پر مکمل قابو ہے۔ مجھے ہمیشہ ایسی عورتوں کی صحت اچھی لگتی بہ نسبت دوسری عورتوں کے جن کے مقابلے میں یہ بیوہ عورتیں زیادہ خوش باش، پراعتماد اور مطمئن ہوتی تھیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ گاؤں کی کئی شادی شدہ عورتوں کی مسکراہٹ خاوندوں کی موجودگی میں آدھی رہ جاتی ہے انہیں خوف سا لاحق ہوتا جس سے ان کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔اور عورت ایک کمزور ڈولتی لرزتی مخلوق بن کر رہ جاتی ہے۔

خواتین کے بارے میں میرے تجزیے میں لفظ خوف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اپنے ذاتی تجربے اور دوسروں کا قریب سے مشاہدہ کرنے کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ عورت کے کردار کو مسخ کرنے میں خوف کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ میں اکثر خوف کی حالت میں رہی ہوں ماسوائے نظم لکھنے اور خاوند کے انتخاب کے معاملے کے۔ مجھے تو اس خیال سے بھی خوف آتا تھا کہ میں حاملہ ہو گئی ہوں مگر بچہ نہیں بچی پیدا ہو گی۔ میں اکثر اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں کہ عورت کی حیثیت سے ہماری زندگی خوف شبہ اور تفکر کے سائے میں کیوں کٹتی ہیں؟ شاید مردوں کو ہمارے اندر کوئی ایسی مضبوط شے لگتی ہے جسے دبانے کے چکر میں ان پر جنون طاری ہو جاتا ہے اس طرح وہ ہمیں تابعدار ملازمائیں بنا لیتے ہیں یا جنسی شکار۔ یہ بات یقینی ہے کہ عورت کی جنسی حیثیت سے خائف ہو کر انہوں نے عورتوں کے بھی ختنے شروع کر دیئے۔عورت کی اصل طاقت سے ڈر کر ہی مرد عورت صنف نازک کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ تجویز یہ عصمت دری، جنسی درازدستی اور مار پیٹ کے بعض معاملات کی توجیہہ بھی کرتا ہے۔

تاہم جب سترہ برس کی عمر میں اپنے صوبے کے گورنر سے ملنے گئی تو ان دونوں مجھے ایسے معاملات کی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ میری زندگی میں کسی بڑے آدمی سے ملاقات کا پہلا موقع تھا۔ پھر مجھ پر یہ خوفناک حقیقت منکشف ہوئی کہ بڑا آدمی جس کے ہاتھ میں باہر کھڑے پریشان

حال لوگوں کا مقدر سنوارنے کا اختیار بھی ہے صرف میرے جوان گوشت میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کے پاس میری الوالعزم روح کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔

1971ء میں میں نے بیکالارٹ (ہمارے میٹرک کے برابر) کا امتحان اچھے گریڈ میں پاس کر لیا تھا۔ میں اپنے صوبے حمس میں اول آئی اور مجموعی طور پر پورے شام میں چوتھے نمبر پر۔ تاہم نتائج کے اعلان کے فوراً بعد مجھ پر سوگ کی کیفیت طاری ہوگئی کیونکہ مجھے یونیورسٹی میں جا کر پڑھنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ میرے والد کا ہاتھ تنگ تھا اور ان کے لئے مشکل تھا کہ مجھے دمشق بھیج دیں۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں دو سال کا ٹیچنگ کورس کر لوں اس طرح میں پرائمری سکول میں ملازمت کی اہل ہو جاؤں گی مگر مجھ پر تو انگریزی آداب پڑھنے بلکہ پوسٹ گریجوایٹ سطح تک پڑھنے کا جنون طاری تھا۔ اس لئے میں نے اس کے سوا اور کچھ بھی پڑھنے یا کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھ پر دباؤ ڈالا گیا کہ ٹیچنگ کورس کر کے ملازمت کر لوں تا کہ چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں باپ کا ہاتھ بٹا سکوں۔ لڑکیوں کے اچھے ہونے کی نشانی یہی ہوتی ہے۔ مگر میں ایسی اچھی لڑکی نہیں تھی جس کی توقع ہر کسی کو ہوتی ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ حمس کے گورنر اور بعث پارٹی (شام میں برسر اقتدار جماعت) پارٹی کے سیکٹری نے ہمارے گاؤں کا بھی دورہ کیا۔ ہمارے گاؤں نے ان کے اعزاز میں ایک ڈرامے سمیت تفریحی پروگرام تیار کیا۔ میں نے اس ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ہمارا شو بڑا کامیاب ہوا میں نے خواتین کی یونین کی طرف سے ایک تقریر بھی کی جس میں علاقے کی عورتوں کے مسائل بھی پیش کئے۔ سرکاری پروگرام کے اختتام پر میں گورنر سے بھی ملی میں وومینز یونین کے وفد میں شامل تھی اس ملاقات میں ہم نے اسے بتایا کہ عورتوں کی حالت بڑی خراب ہے۔ مطالبہ کیا کہ یہاں نرسری اور کنڈر گارٹن قسم کے تعلیمی ادارے کھول دیئے جائیں۔ ملاقات کے آخر میں گورنر نے کہا کہ اگر کسی خاتون کا کوئی ذاتی مسئلہ ایسا ہو جس کے بارے میں وہ بات کرنا چاہے تو بات کرے۔ میں نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا اور بتایا کہ میں یونیورسٹی میں پڑھنا چاہتی ہوں مگر یہ یہ رکاوٹیں حائل ہیں۔

اس کا رویہ بڑا ہمدردانہ تھا اور اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس مقصد کے لئے وظیفہ (گرانٹ) بھی دے سکتا ہے اس نے مجھے ایک ہفتے کے اندر اپنے دفتر میں ملاقات کا وقت بھی دے دیا۔

گورنر کے لاؤنج میں یوں لگتا تھا کہ سارا شہر آ گیا ہے۔ میں اور میرے والد اسی لاؤنج میں

بیٹھے تھے کہ دربان نے مجھے آواز دی۔ وہ ایک بہت بڑے چوبی دروازے کے پاس کھڑا تھا جس کے ذریعے اس نے مجھے اندر بھیجا۔ اس توقع پر کہ انہیں بھی میرے ساتھ جانے دیا جائے گا میرے والد میرے ساتھ آگے بڑھے لیکن چپراسی نے یہ کہہ کر روک لیا ''ملاقات تو صرف اس چھوٹی لڑکی کی ہے، گورنر نے آپ کا نام نہیں لیا۔'' میں نے دیکھا میرے والد بہت پریشان تھے اور لگتا تھا کہ وہ سوچ رہے ہوں کہ مجھے اکیلے اندر نہ جانے دیں اس خدشے کے پیش نظر میں نے ان سے آنکھیں چرائیں اور تیزی سے بڑے دروازے سے ہو کر اندر چلی گئی۔

ابھی میں سوچ رہی تھی کہ میرے والد نے ایسا غیر مہذب رویہ کیوں اختیار کیا کہ گورنر نے مسکراتے ہوئے مجھے اشارے سے ٹیبل کے اس طرف اپنے پاس کھڑے ہونے کے لئے بلایا، میں شرما گئی بہرطور پر شرماتے ہوئے اس کے مقابل کھڑی ہوئی اور کوشش کی کہ اس وقت جو خفت اور دباؤ طاری ہے اسے کم کر سکوں۔ کوئی لفظ بولے بغیر گورنر نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھایا، میرا دیاں ہاتھ مضبوطی سے پکڑا، دبایا اور مجھے نیم دائرے کی شکل میں اپنی طرف کھینچ لیا جب میں اس کے قریب پہنچ گئی تو اس نے بازو میری کمر میں دیا اور اپنا سر میرے پیٹ کے سامنے رگڑا۔ میں نے مزاحمت کی کوشش کی پیچھے ہونا چاہا مگر اس نے ایک نہیں چلنے دی۔

''عقل سے کام لو لڑکی'' اس نے منمناتے ہوئے کہا ''مجھے تم بہت ہی اچھی لگتی ہو، تم جو چاہتی ہو وہ مل جائے گا، بس میرے ساتھ دو گھڑی کھل جاؤ۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہئے'' میں نے کانپتی آواز میں کہا ''میں بس باہر جانا چاہتی ہوں۔''

''ایک منٹ کے اندر باہر چلی جاؤ گی، مگر یہ بتاؤ دوبارہ کب ملو گی، کل میرے ساتھ لنچ کرنے آؤ گی؟'' اس نے کہا۔

''نہیں نہیں میں نہیں آسکتی یہ بتا دیں میری گرانٹ کا کیا بنا؟''

''اس کے بارے میں پریشان نہ ہو، تمہیں ایک وظیفہ دلوا دوں گا..... اب جب آؤ تو والد کو ساتھ نہ لانا تاکہ ہم دونوں..... صرف ہم دونوں۔ باہر سیر تفریح کے لئے جا سکیں اندازہ کرو ہم دونوں کا یوں جانا کتنا بھلا لگے گا۔''

میں شدید بے عزتی اور بے کسی محسوس کر رہی تھی پھر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ہاتھ ملایا تاکہ ملاقات کی سرکاری فضا قائم رہے اور باہر آ گئی۔ یقیناً اس وقت میرے چہرے پر موت کی سی زردی ہوگی کیونکہ میرے والد نے مجھے دیکھتے ہی چیخ کر کہا ''تم پر کیا مصیبت ٹوٹی ہے، تمہیں

کیا ہوا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں''، میں نے نحیف آواز میں جواب دیا۔''انہوں نے کہا ہے کہ وظیفہ نہیں مل سکتا۔''، جہنم میں جائے وظیفہ'' وہ گرجے، ان کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ میرے لئے کتنے دکھی تھے۔چلو تمہاری وومینز یونین کی طرف چلتے ہیں، مجھے یقین ہے وہ تمہاری مدد کریں گے۔ وومینز یونین کی سربراہ بڑی نرم خو اور وضع دار تھیں میرا خیال تھا کہ وہ بڑی پر جوش ہوں گی مگر ایسا نہیں تھا جب میں نے اصرار کیا کہ مجھے وظیفے کے بارے میں واضح جواب دیں تو کہنے لگیں کہ پہلے مجھے ان کے بھائی کے پاس جانا پڑے گا جو ایسے امور پر وومینز یونین کو مشورہ دیتے ہیں۔انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کے لئے کہا اور میں نے بصد تشکر یہ پیش قبول کر لی۔

ان کے بھائی کے دفتر کے بڑے ٹھاٹھ باٹ تھے۔صنوبر کے بنے ایک بڑے ڈیسک کے پیچھے وہ موٹا آدمی بے حس و حرکت جما ہوا تھا۔اس کی حرکت آواز اور اطوار میں ایسا دبدبہ تھا کہ اس نے بہن کو (جو سرکاری طور پر اس کی افسر تھی) بھی ثانوی حیثیت دی۔ بڑی سرد مہری کے ساتھ سلا مدعا کے بعد اس نے ہمیں عورتوں کے حقوق و فرائض پر لیکچر دینا شروع کیا اور اہم نکتہ یہ نکالا کہ عرب عورتیں مغربی عورتوں کی طرف منہ کر کے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہنے لگا کہ تمہارے لئے بہتر یہ ہے کہ ٹیچنگ کورس کر لو فوراً ملازمت مل جائے گی اور تم اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم اور پرداخت کر سکوں گی۔''، میں نے اسے اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کی مگر جلدی ہی یہ بھی سوچ لیا کہ بات نہیں بنے گی۔ چنانچہ اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر چلی آئی۔تمام مردوں سے مایوس .....یہ مرد جن کے لئے ہم عورتیں یا تو گوشت کا ڈھیر ہیں جسے وہ استعمال کرنا چاہتے ہیں یا مائیں ہیں جنہیں اپنی زندگی کی آرزوئیں اور تمنائیں اپنے باپوں بھائیوں یا بیٹیوں کے لئے قربان کرنی چاہئیں۔ مجھے پریشانی اس بات پر ہوئی کہ خواتین کی تنظیموں کو بھی اصلاً مرد ہی چلا رہے ہیں۔

اس واقعہ کے پندرہ برس بعد بھی عرب عورتوں کو یہی صورت حال درپیش ہے کہ وہاں عورتوں کی کوئی خالص تنظیم نہیں ہے اس وقت خواتین کی جو یونین تنظیمیں اور ایسوسی ایشنز وغیرہ ہیں ان پر مردانہ غلبے والی نوکر شاہی حکومت یا سیاسی جماعتوں کا مکمل کنٹرول ہے۔سرکاری وومنیز یونین خواہ بائیں بازو ہی کی کیوں نہ ہوں اپنی سیاسی پارٹی کے لئے زنانہ کارکن حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔وہ چاہتی ہیں کہ عورتیں ان کی پارٹی کی پالیسی کا پروپیگنڈا

کریں اور عورتوں کے مسائل پر کام کرنے کی بجائے ان کی نظریاتی پوزیشن کا دفاع کریں۔ چنانچہ عرب عورتوں پر اب بھی یہ جبر ہے کہ وہ دوسروں کے ذریعے اپنی جنگ لڑیں یعنی بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کی مکمل طور پر مردانہ سنٹرل کمیٹیوں کی سرپرستی میں اپنی جنگ لڑیں، کسی حکومت میں ایک خاتون وزیر کی موجودگی دراصل کابینہ کے حسن وآرائش کے برابر ہے وہ حکومت کے بڑے ترقی پسند نہ سیکولر پروگراموں کی نمائندہ کم ہی ثابت ہوتی ہے۔

مگر سب سے زیادہ مایوس کن اور پریشان کرنے والا معاملہ یہ ہے کہ مختصر سی تعداد کی خاتون سیاستدان جسے وزارت یا پارلیمانی عہدہ حاصل ہوجاتا ہے وہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ عورتوں کے مسائل کو نظر انداز کرنے میں وہ بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ جیسے ہی وہ حلف اٹھاتی ہیں لگتا ہے اسی سانچے میں ڈھل گئی ہیں جن میں مرد ڈھلے ہوتے ہیں وہ انہیں کی زبان میں بات کرتی ہیں اور انہیں کا نقطہ نظر پیش کرتی ہیں۔ انہیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے عورتوں کے معاملات اٹھائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ وزیر اور پارلیمنٹ کی ممبر نہیں صرف اور صرف عورتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاستدان عورتیں اور وہ عورتیں جو اپنے باپ یا خاوندوں کے ذریعے سیاست میں حصہ لیتی ہیں ہمیشہ عورتوں کے روائتی کردار پر زیادہ زور دیتی ہیں۔ پیشہ ور عورتوں پر ان کو ترجیح دیتی ہیں اور بہانہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری خاندانی زندگی یا ہمارا قومی ورثہ محفوظ رہنا چاہئے۔ اپنے آپ کو اعتدال پسند اور سمجھ دار سیاستدان منوانے کے لئے عورتوں کے مسائل کو سراسر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ ضرورت ایسی مضبوط اور جارح قسم کی خاتون سیاستدانوں کی ہے جو خاتون سیاستدان کے موجودہ تصور کو تہہ وبالا کر ڈالیں۔

1975ء میں دمشق یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی ادب سے گریجوایشن کرنے کے بعد مجھے فوراً اسی شعبہ میں ریسرچ اسسٹنٹ مقرر کر دیا گیا۔ اب مجھے سٹوڈنٹس کیمپس کو بھی چھوڑنا تھا اور فلیٹ لینے کے لئے طویل اور تکلیف دہ مشقت کرنا تھی۔ یوں تو دمشق میں ہر کسی کو مکان حاصل کرنے میں سخت مشکل پیش آتی ہے مگر ایک اکیلی کنواری لڑکی کیلئے تو رہنے کی جگہ حاصل کرنا مشکل ترین بات ہے۔ اسے ایسے گھر کی تلاش ہوتی ہے جس میں مرد کوئی نہ ہو، ہمسائے بڑے معزز اور عزت دار ہوں اور جس خاندان کے ساتھ رہے ان کا بھی نیک نام ہونا ضروری ہے۔ میں مکان کی تلاش میں مایوس ہو چکی تھی کہ کسی نے بتایا کہ اس کی بہن کی ایک دوست ہے جس کا خاوند یہاں نہیں رہتا غالباً وہ ایک خاتون کرایہ دار رکھنے پر راضی ہوجائے۔ میں نے فوراً

ٹیکسی لی اور جہاں پر یہ خاتون پڑھاتی تھیں اس سکول میں جا پہنچی۔

فروری کی روشن مگر کہرے والی صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے دیکھا سارے اساتذہ خمس اور فول کی دو پلیٹوں کے گرد ایک دائرے میں بیٹھے ہیں۔ انہیں سلام کرنے کے بعد میں نے سب کے چہروں پر نظر ڈالی غادہ کو پہچاننے کی کوشش ناکام رہی۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے یہاں اچانک آنے کی وجہ فوراً بیان کر دینی چاہئے چنانچہ میں نے پوچھ لیا کہ غادہ کون ہیں؟ کھاتے کی پلیٹوں کے پاس سے بہت ہی سیاہ، خوبصورت لمبے اور گھنے بالوں والا سر اوپر اٹھا۔ دو سیاہ سنجیدہ آنکھیں، لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ، حیرانی سے مجھ پر ٹک گئیں ان میں کچھ کچھ خوف بھی تھا۔ ''آپ کو مجھ سے کیا کام ہے'' اس نے پریشان سا ہو کر پوچھا اور پھر کہا ''میں غادہ ہوں۔''

مجھے آپ سے بات کرنا ہے اگر آپ.....'' میں نے کہنا شروع کیا مگر میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے اس کا چہرہ مدمک اٹھا جیسے اسے یک لخت معلوم ہو گیا ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں اور اس نے مجھے ٹوک دیا..... ''دراصل مجھے فوراً اپنی کلاس میں جانا ہے، کیا آپ سہ پہر چار بجے میرے فلیٹ پر آسکتی ہیں؟''

پھر اس کے فلیٹ پر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنے کے بعد جب ہم چھوٹے پیالوں سے کافی سرک رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ ہم اجنبیوں کے درمیان حائل تمام رکاوٹیں ہٹ گئی ہیں اور اب ہم دو پرانی سہیلیوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔

''شروع سے بات بتاتی ہوں''۔ اس نے بڑے دوستانہ انداز اور ذہین قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میرے پاس کرائے پر دینے کے لئے کوئی کمرہ نہیں۔ صرف ایک بیڈروم ہے۔'' میں جہاں بیٹھی تھی وہاں سے یہ بیڈروم دیکھ سکتی تھی اس کا دروازہ کھلا تھا۔ ''میں اس بیڈروم میں اپنی بچیوں کے ساتھ سوتی ہوں۔ اگر آپ ہمیں پسند کرتی ہیں ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں تو بسم اللہ۔ اچھے دوستوں کے لئے تو ہمیشہ جگہ ہوتی ہے۔ صوفہ جس پر ہم یہاں کھلی جگہ پر بیٹھے ہیں اندر بستر کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے میں اس پر سو جایا کروں گی اور تم میری بچیوں کے ساتھ بیڈروم پر سو جانا۔ میرا خاوند باہر ہے میں بہت تنہائی محسوس کرتی ہوں خصوصاً شام کو تنہائی کا بہت احساس ہوتا ہے ایسے میں مجھے تمہارا ساتھ بڑا اچھا لگے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں زیادہ آرام دہ جگہ فراہم نہیں کر سکتی مگر سچی میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں اور چاہوں گی کہ تم ہمارے

ساتھ یہیں رہ پڑو، میں تم سے کوئی پیسہ دھیلا یا کچھ اور نہیں چاہتی۔ بس آ جاؤ اور یہاں رہ پڑو''

اس نے فوری طور پر مجھ پر اتنا اعتماد کیا جس کا کوئی جواز نہیں بجز اس کے کہ اس نے مجھے وجدانی طور پر پسند کیا۔ میں اس رویے کے باعث مخمصے میں پھنس کر پریشان ہوگئی۔ میں نے سوچا یہ عورت وجدان کے کہنے پر چلتی ہے جو بہت خوبصوت بات ہے مگر کبھی کبھی ایسے لوگ بڑے خطرناک بھی ہو جاتے ہیں پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ صرف عورتیں ہی وجدان پر یقین رکھتی ہیں مرد تو اسے واہیات بات سمجھتے ہیں۔

''تمہارے شوہر کب واپس آئیں گے'' میں نے پوچھا

''خدا جانتا ہے'' اور اس کے ساتھ ہی ایک گہری دبی دبی آہ اس کے منہ سے نکلی..... ''یہ بڑی لمبی داستان ہے جب تم یہاں رہنے کا فیصلہ کر لو گی تو میں تمہیں یہ قصہ قسطوں میں سناؤں گی۔''

یہ سننے کے بعد بھی میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ میں اس گھر میں گھر کی طرح محسوس کر رہی تھی اور اگر میں نے اس پیاری سی خاتون سے کنارہ کر لیا تو یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔

''تو گویا میں اپنے سامان لا سکتی ہوں'' میں نے اچانک سوال کر دیا ''میرے پاس صرف کپڑے اور کتابیں ہیں۔''

''بالکل'' اس نے خوش ہو کر جواب دیا، یہ فلیٹ کی چابی ہے، آؤ اور آج رات چاہو تو مجھے لوٹ لو'' اس نے اس طرح جملہ پورا کیا جیسے اسے یقین ہو کہ اسے اسی مفہوم میں سمجھ لیا جائیگا۔''

''میں آج رات ہی آؤں گی مگر تمہیں لوٹنے کے لئے میں تمہارے ساتھ رہنے کے لئے آ رہی ہوں'' میں نے کہا

''بڑی اچھی بات ہے'' اس نے یہ کہہ کر بڑی گرم جوشی سے گلے سے لگا لیا۔

غادہ کے ساتھ میری شامیں میری زندگی کی انتہائی پر لطف شامیں تھیں۔ مجھے ایک سہیلی ایک بہن کے ساتھ انتہائی محبت اور گہری شناسائی کے رشتے کا بھی تجربہ ہوا۔ بلکہ یوں کہ غادہ دراصل سہیلی اور بہن سے بھی بڑھ کر تھی۔ ایک شام وہ مجھے خاوند کا قصہ سنانے لگی، غادہ کو اس سے بڑی محبت تھی وہ شاعر تھا ڈرامہ نگار تھا اور بڑا اچھا ادیب اس کے باوجود وہ شوہر بھی غیر دنیا دار تھا اور غیر ذمہ دار باپ بھی۔

''میری عمر سولہ سال تھی جب میں اس پراسرار، نوجوان، دبلے پتلے جنسی کشش والے

بڑے خوبصورت مصری سے ملی تھی وہ ہمارے سکول میں ڈرامہ پیش کر رہا تھا جس میں مجھے ایک اہم رول دیا گیا تھا۔ میں اس کی محبت میں فنا ہوگئی اور ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میرا خاندان کرد ہے اور کرد میرا بیاہ کسی غیر کرد سے کرنے کی بجائے مجھے زندہ گاڑ دینا پسند کریں گے۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ بھاگ کر بیروت آ گئی (ان دنوں بیروت عربوں کا فری زون تھا) جہاں ہم نے شادی کر لی۔ ہم اردن اور عراق میں ملازمت تلاش کرنے گئے۔ کچھ دن وہاں رہے (ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہے) اور واپس شام آ گئے۔ اب میرے گھر والے میری تلاش میں تھے تاکہ مجھے قتل کر کے وہ اپنی خاندانی عزت بحال کر سکیں جو میں گنوا چکی تھی۔ میں نے اپنا نام بدل لیا۔ کپڑوں کا انداز بدلا، ٹیچر زٹریننگ کورس کیا اور یہاں دمشق میں اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے آ گئی۔ میرا خاندان شاذ ہی دمشق کا چکر لگاتا ہے۔ جب شادی ہوگئی تو مجھے پتہ چلا کہ میرے خاوند کی کوئی ایسی تعلیمی اہلیت نہیں جس پر ملازمت مل سکے۔ وہ کسی پیشہ ور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے میرے گاؤں میں نہیں آیا تھا بلکہ محض ایک لاابالی نوجوان کے طور پر ادھر آ نکلا تھا۔ یہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے سپورٹ کرنے کے لئے کام کرنے کو بھی تیار ہوں تاہم اسے بھی کوئی کوالیفیکشن حاصل کر لینی چاہئے۔ مگر اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ دوپہر تک سویا رہتا پھر آدھی رات دوستوں کے پاس شطرنج کھیلتا اور شراب پیتا۔ نہ اس کے پاس روز گار تھا نہ پیسہ جو کچھ میں ایک مہینے میں کماتی وہ ایک ہفتے میں اڑا دیتا اور پھر مہینے کے باقی دن مجھے ڈرا دھمکا کر مزید پیسے حاصل کرنے پر لگا رہتا۔ جب وہ بے قابو ہو جاتا تو مجھے مارتا۔۔۔ مگر چند گھنٹے بعد ہی مجھے ایک نظم لکھ کر دیتا جس میں جو کچھ ہوا اس کی معافی مانگی گئی ہوتی۔ جب ہماری زندگی اجیرن ہوگئی تو اس نے کہا کہ وہ لندن جا کر بی بی سی میں کام کرے گا اور جیسے وہ سیٹ ہو جائے گا مجھے بھی بلا لے گا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس نے ٹکٹ حاصل کر لیا وہ جب گیا میری بڑی بیٹی میرے پیٹ میں تھی پانچ ماہ کی۔

''اس بات کو چار سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصے میں وہ صرف دس دن کے لئے یہاں آیا۔ اس دوران پھر میرا حمل ٹھہر گیا۔ دوسری بچی صفا اسی زمانے کی ہے جواب ایک سال کی ہے۔''

غادہ دل ہلا دینے والی کہانیاں سناتی رہی کہ کس طرح اس نے بیٹیوں کو جنم دیا تھا کوئی اس کا سنگی ساتھی نہ تھا، صرف ایک ہمسائی تھی جس نے بچی کا نال اپنی قینچی سے کاٹا تھا۔ وہ اس ڈر سے

ہسپتال نہیں گئی تھی کہ کہیں اس کا بھائی اسے ڈھونڈ نکالے وہ اب بھی اسے قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ اس کی ماں بخوشی اس کے پاس آجاتی مگر وہ بھی یا اسی خوف کے باعث نہیں آئی۔

''بچی کی پیدائش کے تین گھنٹے بعد'' اس نے پھر کہا ''میں فاقے سے تھی، چنانچہ مجھے اٹھنا پڑا، لہو میں تر بتر اور میں نے کھانے کے لئے کچھ پکایا۔ ان دونوں میرے خاوند نے بہت سے گریٹنگ کارڈ اور محبت نامے لکھے مگر پیسہ ایک بھی نہیں بھیجا۔ اس نے تو اپنی چھوٹی بیٹی تک نہیں دیکھی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ بہت ہی ذہین اور حساس آدمی ہے۔ ساتھ ہو تو جذبوں کو زندہ بھی کر دیتا ہے مگر اس میں ذمہ داری کا احساس کوئی نہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کو وہ بھی حل نہیں کر سکا مگر کتنے مرد ہیں جو مسئلے سے پوری طرح نبرد آزما ہوئے ہوں۔ میرے دوستوں، ہمسائیوں حتیٰ کہ میری بڑی بیٹی راشا تک کو اس سال کا علم نہیں۔ میں ہمیشہ اس سے یہی کہتی ہوں کہ تمہارا باپ بہت بڑا آدمی ہے وہ تمہاری خاطر یہاں سے دور رہتا ہے اور وہ تمہیں تحفے پیسے اور پیار بھیجتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود میں اب بھی اس سے پیار کرتی ہوں، مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ لیکن شاید میں نے انتخاب غلط کیا تھا۔''

''میرا واحد دکھ اور پچھتاوا یہ ہے'' غادہ نے کئی بار مجھ سے کہا ''کہ میں اپنی بوڑھی ماں سے نہیں مل سکی میں اس کا بہت احترام کرتی ہوں، پرستش کرتی ہوں۔ مجھے اس سے ملنے کی اجازت نہیں میرے بھائی نے اسے دراصل نظر بند کر رکھا ہے اور اگر میرے بھائی کو پتہ چل جائے کہ میں کہاں ہوں تو وہ وہیں آ کے قتل کر دے گا۔ میری ماں خفیہ طور پر مجھے اپنے بالوں کی لٹ یا اپنے کسی کپڑے کا ٹکڑا اور پیار بھیجتی رہتی ہے۔ یہ بال یہ کپڑے کا ٹکڑا میں اپنی برا (انگیا) میں رکھتی ہوں تاکہ ہر دھڑکن کے ساتھ انہیں محسوس کر سکوں۔ اسے میرے حالات کا کوئی علم نہیں۔ میں اسے ہمیشہ یہی بتاتی ہوں کہ میں بہت خوش ہوں اور میرا خاوند، دنیا میں اس جیسا کوئی نہیں!''

غادہ کے گھر آنے کے کچھ عرصہ بعد مجھے مترجم کی حیثیت سے جز وقتی کام مل گیا۔ تعجب کی بات ہے کہ یہاں میرا ایک ساتھی غادہ کے گاؤں کے رہنے والا نکلا میں اس سے غادہ کے خاندان والوں کی خبریں معلوم کرتی رہتی اور اس طور غادہ کی اندھیری شاموں کو کچھ ان خبروں سے منور کرتی رہتی۔

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ جب اس کا بھائی اپنے کام پر گیا ہو تو وہ کیوں اپنی ماں

سے نہیں مل آتی ؟

''میری ہمت نہیں پڑتی ،نہیں ہرگز نہیں اس نے جواب دیا''فرض کرو وہ کسی کام کے سبب وہاں آ جائے تو وہ مجھے دیکھتے ہی قتل کر دے گا۔مگر میرے دل میں ایک بات آئی ہے تم اپنے ساتھی کے ساتھ خود کیوں نہیں چلی جاتیں اور میری طرف سے میری ماں سے مل آتیں۔''میں نے ایسا کرنے کی حامی بھر لی۔

میں اور میرا ساتھی وادیوں اور گندم اور جو کے سنہری کھیتوں میں سے ہوتے روشن دن میں گاؤں کے نیچے میں دو کمروں والی معمولی سی عمارت کے سامنے رکے جس کا نہ صحن تھا نہ باورچی خانہ اور نہ غسل خانہ''یہاں غادہ کی ماں رہتی ہے میرے ساتھی نے بتایا، میں تمہیں یہاں چھوڑ جاتا ہوں اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر تمہیں دمشق لئے چلوں گا۔یہ لفظ''لئے چلوں گا''مجھے عجیب سے لگے گویا میں کوئی چھوٹی سی بچی تھی جسے گم جانے کا ڈر ہو اور وہ بے تابی سے والدین کے آ کر لے جانے کا انتظار کر رہی ہو۔

''میں کیا کروں؟''میں نے ایسے انداز میں سوال کیا کہ میری آواز میں خوف اور فکر دونوں موجود تھے۔

''واپس دروازے پر دستک دو اندر جاؤ۔اور جو بات کہنا چاہتی ہو کہہ دو''میرے ساتھی نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا سامنے ایک دبلی پتلی بوڑھی ، پریشان سی خاتون چھڑی کے سہارے کانپتی کانپتی کھڑی تھی اس نے بڑے جارحانہ انداز میں مجھے دیکھا اور پھر اکھڑی ہوئی آواز میں پوچھا''تم کون ہو؟ مجھ سے کیا کام ہے؟''

اس کی پریشانی اور خوف مجھے خوفزدہ کر گئے اور میں نے منمناتے ہوئے انداز میں کہا ''میں غادہ کی دوست ہوں، آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے، آپ کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس کرتی ہے۔اس نے مجھے کہا تھا آپ سے مل آؤں میں انہی آنکھوں میں آپ کا وجود بھر کر لے جاؤں اس کی طرف سے آپ کی آنکھوں اور ہاتھوں کو بوسہ دوں اور آپ کے وجود کی خوشبو اس کے لئے اپنے ساتھ لے جاؤں''

توبہ میرے اللہ''اس نے ایک لاچار انداز اور شکست خوردہ آواز میں کہا اور میری تیز اور متلاشی نگاہوں سے بچنے کے لئے مجھ سے منہ پھیر لیا۔''جاؤ، مہربانی کرو جاؤ''اس نے فریاد کی

اور پھر بڑی مشکل سے اپنی چھڑی کی مدد سے گرتے گرتے بچی۔ اگر اس کا بھائی تمہیں یہاں دیکھ لے تو وہ تمہیں بھی قتل کر دے گا، وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے، اس لئے رحم کرو اور جاؤ۔ پھر اس نے آنسو بھری اداس آنکھیں میری طرف کیں اور پوچھا ''وہ کیسی ہے؟ خاوند اچھے سلوک والا ہے؟ وہ خوش ہے؟ کیا وہ اب بھی اتنی ہی خوبصورت ہے؟ اب بھی اس کے بال سیاہ ہیں جنہیں دھوئے اور سنوارے مدتیں گذر گئی ہیں؟ اب جاؤ..... تم یقیناً پاگل ہو جو یہاں چلی آئی ہو۔ تمہاری زندگی اس نے خطرے میں کیوں ڈال دی؟

پھر میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور ناراض لہجے میں کہا ''سنو' غادہ اب بھی ایسی ہی خوبصورت ہے جیسی کبھی تھی۔ اس کے دو شاندار بیٹیاں ہیں، وہ ٹھیک ٹھاک زندگی بسر کر رہی ہے۔ اسے تم سے محبت ہے وہ تمہاری پرستش کرتی ہے وہ تم سے ملنے کی خواہش مند ہے ایک بار پھر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ تم گاؤں چھوڑ کے دمشق میں اس کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں۔ گھبراؤ نہیں، میں اس کا انتظام بھی کر دوں گی''۔

''جاؤ بھائی جاؤ، مہربانی کرو جاؤ'' وہ مستقل بے چین آواز میں کہتی رہی ''غادہ سے کہنا میں اس سے پیار کرتی ہوں، میں اس سے ملنے کو بھی ترس گئی مگر اس لمحے میرے لئے یہی بڑی بات ہے کہ وہ خوش ہے میں یہاں قید میں ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ غادہ یہاں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی۔ نہ ہم عزت والے لوگ ہیں۔ وہاں ادھر ہمارا خوبصورت گھر ہے اس نے گاؤں کا مرکزی علاقے کی طرف اشارہ کیا۔'' مگر یہ قید خانہ میرے بیٹے نے میرے رہنے کے لئے منتخب کیا ہے تن تنہا جیسے درندہ قید میں ہو۔ غادہ کا بھائی ظالم اور خونخوار ہے۔ اسے کہنا اس کے شر سے دور رہے۔ وہ ہر صبح قسم اٹھاتا ہے کہ اسے قتل کر کے اس کے خون سے بے عزتی کے داغ دھوئے گا۔ اب مجھ سے ملنے کبھی نہ آنا اور نہ ہی غادہ کو کبھی ادھر آنے کا سوچنا چاہئے، یہ پاگل پن ہے۔ بوڑھی ہوں عمر گزار چکی ہوں اور اب مجھے یہ پرواہ نہیں ہے کہ مجھ پر کیا گذرے گی، لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنی زندگی بھرپور طریقے سے گذارے، مولا! کاش میں اس سے مل سکتی چلو اب جاؤ، اب یہاں سے ہلو''

جب میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی میں نے دیکھا آنسوؤں کا سیلاب اس کی گالوں پر رواں تھا۔ ہماری آنکھیں شاید پہلی بار دوچار ہوئیں، اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر غیر معمولی زور کے ساتھ مجھے دروازے سے باہر کی طرف دھکیل دیا۔ یہاں مت کھڑی ہو

مت دیکھو میرے دروازے کی طرف ''گاؤں کی طرف بھاگ جاؤ، جیسے بھی ہو چلی جاؤ، اس سے پہلے کہ وہ گھر آ جائے یہاں سے غائب ہو جاؤ اگر اسے پتہ چل گیا کہ تم کون ہو تو فوراً گولی مارے دے گا؟

''اوہ میرے مولا'' میں نے دروازے سے باہر دھکیلے جانے پر سوچا ''یہ ماں بیٹیاں کس عذاب سے گذر رہی ہیں۔ لیکن کس لئے؟ بیٹی نے اپنی پسند کے مرد سے شادی کرنے کا جرم کیا مگر ماں نے کیا کیا ہے؟ کیا بیٹیوں کی لغزشیں ماؤں کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں؟

اس کی ماں کیسی لگتی تھی، اس نے کیا پہن رکھا تھا، اس نے کیا کچھ کہا تھا، اس کی خوشبو کیسی تھی؟ یہ وہ دلچسپ موضوعات تھے جن سے ہفتوں غادہ کی اداسی اور ذہنی اذیت کم ہوتی رہی۔

''کبھی میری جیسی غلطی نہ کرنا'' وہ کبھی کبھی پھوٹ پڑتی، شامی سے شادی کرو کم از کم ایسا ٹھوس وسیلہ جس پر مالی اعتبار سے تکیہ بھی کیا جا سکے۔ میں نے اپنے خاوند کے لئے جتنی قربانیاں دی ہیں، دنیا کا کوئی مرد ان کا مستحق نہیں۔ مجھے پتہ ہے میری ماں مر جائیگی اس خوفناک تنہائی میں، میں اس کے جیتے جاگتے پیارے نین نقش پر موت کے ٹھنڈے سائے بھی نہیں دیکھ سکوں گی۔ مگر کس لئے؟ ایک ایسے خاوند کے لئے جس سے میں نے محبت کی اور اب بھی پیار کرتی ہوں مگر وہ میرے بارے میں میری زندگی کے بارے میں پرواہ ہی نہیں کرتا، نہ اسے اس کی پرواہ ہے کہ اس کی بچیاں کیا سوچتی ہیں۔ ہم پھر بھی ایسی خود غرض خود پسند اور جذبات سے عاری کیوں نہیں بن جاتیں اور پر آسائش زندگی گذارتیں؟ مگر شاید ہم اس صورت میں بھی خوش نہیں رہ سکیں گے؟''

پھر وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر خوب روئے گی اور اپنے آنسوؤں میں تر بتر سو جائے گی۔

ناہید جواد، ایک خاتون ڈاکٹر مجھے بلا رہی تھی یقیناً پہلی بار نہیں، بے معنی بیزار کن شور میں صرف یہی دو لفظ تھے جو میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ مجھے ایک مجہول سا احساس تھا کہ میں ہر درجہ تھکی ہوئی ہوں اور گیلی گیلی بھی۔ میں نے نامانوس سے تکیئے پر پڑے بوجھل سر کو حرکت دی اور یہ جاننے کے لئے آنکھیں کھولیں کہ میں کہاں ہوں۔ ناہید جواد، ڈاکٹر نے اس بار زیادہ بلند اور مسلسل آواز میں مجھے پکارا شاید میرے جواب نہ دینے کے باعث وہ پریشان ہو گئی تھی۔ نیم بے ہوشی میں مجھے یاد آیا کہ جواد میرے خاوند کا خاندانی نام تھا۔ میں آنکھیں نہ کھول سکی، ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی اور انتہائی کمزور نا قابل سماعت سرگوشی میں کہا آئی آئی۔''

MashalBooks.org

تم کیسی شاندار بیٹی کی ماں بنی ہو، خاتون ڈاکٹر نے بڑے خوش کن انداز میں کہا بیٹی؟ بیٹی ہوئی ہے میں نے کہا جو بے حد متجسس تھی اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے۔

خاتون ڈاکٹر میرے سر پر جھکی ہوئی تھی اس نے میری طرف چھوٹی سی خوبصورت بچی کا رخ کر دیا، چھوٹا سا خوبصورت چہرہ نمایاں کالی بھنویں کالی پلکیں، کالے بال، چھوٹا سا منہ اور چھوٹی سی ناک، ہائے اللہ میری بیٹی کتنی خوبصورت ہے میں نے سوچا اور میں خوشی سے مغلوب ہو کر بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔

جب میں گھر پلٹی تو لوگ مجھے بخیریت واپس آنے پر مبارکباد دینے کی بجائے یہ کہہ رہے تھے کہ امید ہے کہ آئندہ لڑکا پیدا ہوگا۔ فوراً ہی عجیب خیال ظاہر کئے جانے لگے کہ میری بیٹی کا منہ کچھ کچھ مردانہ ہے اس لئے آئندہ لڑکا پیدا ہوگا۔ میری بیٹی کو دیکھنے یا اس میں کچھ دلچسپی کا اظہار کئے بغیر خواتین مجھے مشورے دے رہی تھیں کہ مہینے کے کون سے دن مجھے اپنے خاوند کے ساتھ سونا چاہئے تاکہ اگلی بار لڑکا ہی پیدا ہو۔ جب اگلی بار آئی تو میرے ہاں ایک اور خوبصورت بچی پیدا ہوئی۔ اب جو دوسری لڑکی پیدا ہوئی تو دباؤ اور بھی بڑھ گیا۔ زچہ وارڈ میں مجھے نرسیں بھی رحم بھرے انداز سے دیکھ رہی تھیں، مجھ سے آنکھیں چرا رہی تھیں اور ان میں سے کوئی بھی باہر جا کر میرے خاوند کو لڑکی کی آمد کی خبر دینے کو تیار نہیں تھی۔ ہسپتال میں ان بدقسمت ماؤں کے واقعات عام سنائے جاتے جن کی تین یا چار بیٹیاں ہوئیں اور وہ لڑکے کے لئے ترس رہی ہوتیں۔ میرے خاوند کے ایک دوست کے ہاں لڑکا ہوا اور یہ تیسرا لڑکا تھا جب نرسوں نے اسے خوشی خوشی یہ خبر سنائی تو وہ پریشان ہو گیا نرسوں نے سوچا اس کے دماغ میں کوئی کسر ہے۔

میرے ہمسائیوں نے دوسری بچی پیدا کرنے پر مجھ غریب سے بڑی ہمدردی جتائی۔ میرے فلیٹ میں ایک اکٹھ ہوا جس میں سب سے زیادہ منہ پھٹ اور متعصف شخص نے جس کے ہاں حال ہی میں لڑکی پیدا ہوئی تھی لڑکی کی پیدائش پر اپنی نفرت نہیں چھپائی۔ اس نے مجھے سے کہا ''اگر تم نے لڑکا پیدا نہ کیا تو پھر خاندان بنانے والا کھڑاگ بے سود ہے۔ لڑکیاں تو صرف پریشانی اور دلدل لے کر آتی ہیں۔ لڑکے جیسی تو کوئی شے ہی نہیں۔ لڑکے کو اعتماد ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچ کر بھی بحفاظت واپس آ سکتا ہے''

مجھے آپ سے ذرہ برابر اتفاق نہیں ہے، میں نے کہا متعصف مردانہ معاشرے میں عورتوں کے لئے لازماً بڑا کڑا وقت ہوتا ہے جہاں تک میرا تعلق ہے میرا تو خاندان ہے اور مجھے جو کچھ

حاصل ہے میں اس پر بڑی خوش ہوں۔''

جب ہم لوگ کافی پی رہے تھے تو ہمسائی کی خبر آئی، وہ ہسپتال میں تھی اور اسی صبح اس کے ہاں بیک وقت تین بیٹے ہوئے (اس کے دو بیٹے پہلے بھی ہیں) ہمارے متعصب دوست نے میرے شوہر سے کہا کہ ہمارے لئے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔نام تو ابو (پانچ بیٹیوں کے باپ) نے دکھایا ہے، سچی ہم تو اچھے نہیں رہے''

ہائے اللہ میں ایک دم اس پر چیخ پڑی ''جب لڑکی پیدا ہوتو یہ عورت کے کھاتے میں اور جب لڑکا پیدا ہوتو یہ مرد کے کھاتے میں؟ تم کیسی جنس ہو!''

میری بڑی بیٹی اب پانچویں سال میں ہے بڑی سمجھدار، حساس اور محبت کرنے والی ہے۔وہ اپنے دادا دادی کے بارے میں پوچھتی رہتی ہے۔اگر چہ اس نے انہیں دیکھا نہیں مگر ان کی کمی کو شدت سے محسوس کرتی ہے۔عید کے موقع پر وہ اکثر اپنی ہم جولیوں سے سنتی ہے کہ کس طرح انہوں نے عید اپنے دادا دادی اور نانا نانی کے ساتھ گذاری اور انہوں نے کون کون سے تحفے دیئے وہ گھر آ کر سوال کرتی ہے کہ میں اپنے والدین کے گھر کیوں نہیں جاتی، میں ان سے پیار نہیں کرتی؟ میں بھی تو اسے کہتی رہتی ہوں کہ سب بچوں کو اپنے والدین سے محبت کرنی چاہئے تو پھر میں کیوں اپنے اوالدین سے محبت نہیں کرتی؟ یا میں اتنی بے خبر ہوں کہ جانتی بھی نہی کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟ کیا میں ان کے پاس گئی ہوں؟ یہ اور اسی طرح کے سوال وہ کرتی رہتی ہے۔اس کی بدقسمتی کہ اس کی دادی انتقال کر چکی ہے۔اور دادا عراق میں رہتے ہیں جو ہمیں کبھی خط تک نہیں لکھتے۔نتیجہ یہ ہے کہ اس نے نہ دادا دادی دیکھے نہ نانا نانی، بیٹی کے انداز بتاتے ہیں کہ وہ اس ضمن میں احساس محرومی کا شکار ہے۔ایسے ملک میں جہاں خاندانی رشتے بڑے گٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور جہاں دادیاں نانیاں اور دادے نانے چھوٹے بچوں کی پرداخت میں بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں ایسے ملک میں ان رشتوں سے محرومی پر وہ ایسے محسوس کرتی ہے جیسے اس کے ساتھ دانستہ غلط سلوک کیا جا رہا ہے۔

میرے والدین نے میرے ساتھ جو کچھ کیا اس کے باوجود میں انہیں ملنے کی خواہش مند ہوں میں نے ان سے ملنے کی بارہا کوشش بھی کی۔مگر میرے والد نے نہ صرف خود ملنے سے انکار کر دیا بلکہ ماں کو بھی مجھ سے ملنے سے روک رکھا ہے حلانکہ میں نے سنا ہے کہ وہ مجھے ملنے یہاں آنے کے لئے تڑپتی ہیں۔ہم میں صلح کرانے والوں سے میرے والد نے صرف ایک بات

MashalBooks.org

کہی، میں نے شادی میں اپنی مرضی کی اور انہوں نے اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں ان کے لئے مرچکی ہوں اور یہ اب وہ یہ بھی جاننا نہیں چاہتے کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔ میرے بڑے بھائی یونیورسٹی گریجوایٹ ہیں لیکن والدین سے علیحدگی کے بعد وہ بھی کبھی ملنے نہیں آئے۔ جہاں تک دوسرے عزیزوں اور جاننے والوں کا تعلق ہے تو ان کا خیال ہے کہ میرے والدین نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی میں بہت ہی بری ثابت ہوئی میں نے ان کی مہربانیوں کا یہ صلہ دیا کہ اٹھائیس برس کی عمر میں ان کو چھوڑ دیا اور اپنی مرضی سے شادی کرلی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے کسی قسم کی پشیمانی نہیں اگر مجھے ایک اور زندگی بھی مل جائے تو میں پھر بھی وہی کچھ کروں گی جو کر چکی ہوں مگر میں منافق مردوں سے ناراض ہوں، تقریباً سارے ہی مرد منافق ہوتے ہیں۔ جو یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ عورتیں سکولوں یونیورسٹیوں میں جانے لگی ہیں، کام کرنے لگ پڑی ہیں اور اس طرح مکمل طور پر آزاد ہوگئی ہیں زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں۔ ان منافقین کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں نے تھوڑی بہت ترقی کی ہے اس کے لئے وہ مردوں کی مشکور وممنون ہوں اور اس کے ساتھ ہی ان کی کوشش ہے کہ بس یہی کافی ہے عورتیں اس سے آگے کی نہ سوچیں۔ لیکن اصل جنگ تو اب شروع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ضمن میں میں نے جو مشاہدہ کیا ہے اس سے یہ کھلا کہ اگرچہ عورتیں کام کرنے لگی ہیں سیاستدان بن گئی ہیں، کئی شعبوں میں ممتاز حیثیت حاصل کرگئی ہیں لیکن آج بھی گھروں میں ان کو کمزور جنس سمجھا جاتا ہے اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ملازمہ کی ملازمہ ہی رہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو عورت کسی شعبہ میں جتنا نمایاں ہوتی جاتی ہے اس پر گھر کے اندر یہ احساس دلانے کے لئے دباؤ بڑھتا جاتا ہے کہ عورت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کمزور اطاعت گذار اور زنانہ شے ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ایسی عورتیں جن کے خیالات بڑھے اعلیٰ اور تجربہ پر مایہ ہے اپنے ہی خوف کی زنجیروں میں بندھی رہتی کہ اگر انہوں نے ورثے میں پائی روایات کے مطابق عمل نہ کیا تو پرمسرت خاندانی زندگی کا موقع گنوادیں گی۔

MashalBooks.org

شام۔۔۔سب حقوق حاصل مگر گھر میں کچھ نہیں

شام ان دنوں مشرق وسطیٰ کے بڑے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔پہلی جنگ عظیم کے بعد لبنان کی طرح شام کو بھی فرانس کی تحویل میں دے دیا گیا تھا (جبکہ فلسطین اوراردن برطانوی تحویل میں دیئے گئے تھے یا 1945ء تک شام آزاد نہیں ہوا۔ 1958ء اور 1961 کے دوران یہ مصر کے ساتھ متحدہ عرب جمہوریہ کا حصہ تھا۔اس کے بعد یہاں تقریباً مستقلاً بعث سوشلسٹ پارٹی حکومت کررہی ہے جس نے اس عرصہ میں سماجی اصلاح کا جامع پروگرام متعارف کرایا ہے۔معیشت مخلوط ہے مگر کواپریٹو بھی ہیں جن کی ایک مرکزیت ہے اور سرکاری شعبہ بھی ہے، بچوں اور بچیوں کے لئے تعلیم کا بھی قومی پروگرام ہے۔جنس، رنگ یا مذہب کے امتیاز کے بغیر تمام شہریوں کو حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔الجزائر کی طرح یہاں کارکنوں، خواتین اور طلبا کی تنظیموں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ قومی سیاسی زندگی میں اہم کردار ادا کریں۔

بعث حکمرانوں کی سماجی پالیسیوں کے سبب بلاشبہ شامی خواتین کو غیر فائدہ پہنچا ہے۔مگر مندرجہ ذیل انٹرویو سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ سرکاری پالیسیوں کے مقابلے میں سماجی تبدیلیاں بہت سست رفتاری سے آتی ہیں۔شام کی خواتین کے بارے میں مذہبی خاندانی قانون موجود ہے جس کے سبب خواتین کی روزمرہ کی زندگی باپ یا خاوند کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔

حقوق کی مکمل ضمانت..... مگر بیرون خانہ

جب ہمارا طیارہ اگست کی رات ایک بجے دمشق کی چمکتی دمکتی فضاؤں میں داخل ہوا تو مجھے نرم اور خشک ہوا کا احساس ہونے لگا جو ان دنوں چاند راتوں کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔

گرمیوں میں یہاں بڑی دھوپ اور ناقابل برداشت گرمی ہوتی ہے مگر اگست میں راتیں ٹھنڈی، خوشگوار اور شاعرانہ سی ہو جاتی ہیں۔میں نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا جہاز کا سایہ

نموطہ میں دور دور تک پھیلے پھلدار درختوں پر پڑ رہا تھا۔ حمس کے قریب میرے چھوٹے سے گاؤں میں بھی اگست کے مہینے میں راتوں کو بڑے میلے ٹھیلے اور پارٹیاں ہوتی ہیں۔ اگست کے آتے ہی راتوں کو سونا چھوٹ جاتا ہے اس کی جگہ گھومنا پھرنا ملنا ملانا اور خوش وقتی شروع ہو جاتی ہے۔ اتنا میلہ کیوں ہوتا ہے، وجہ بتانی مشکل ہے غالباً یہ بہترین موسم ہوتا ہے جب فطرت پر شباب آیا ہوتا ہے۔ میرے گاؤں کے ساتھ رومن نہر بہتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں دو دو تین کی ٹولیوں میں گئی رات تک نہر کے کنارے کنارے سیر کرتے۔ سکول گاؤں اور رواں معاشوں کے بارے میں باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے ہیں کبھی کبھی نہر کے شفاف پانی میں سلاد وغیرہ صاف کرتے بھی نظر آتے ہیں۔

شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان گاؤں میں میٹھا میٹھا شور شروع ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ بلند ہوتا جاتا ہے پھر باتوں، گانوں اور رقص کی دھنیں صاف سنائی دینے لگتی ہیں۔ اس سمے ہر کوئی گھر سے گاؤں سے باہر جاتا ہے چھوٹے بچوں کی مائیں اور بوڑھے بوڑھیاں بھی کرسیاں نکال کر گھر سے باہر بیٹھ جاتی ہیں اور گپ شپ کرتی ہیں۔

میں بھی اپنی پسند کے لوگوں کے بارے میں باتیں سننے کے بعد دوستوں کی طرف بھاگتی جو بعض اوقات قریبی پہاڑیوں اور گھاٹی میں چلے جاتے۔ گاؤں پر بڑا سکون اور چپ چپائی فضا طاری رہتی جو کبھی کبھی اسی ریڈیو سے ٹوٹتی تھی۔ کوئی ٹریفک نہیں تھی سوائے ایک منی بس کے جو اردگرد کے دیہات کے لوگوں کو صبح چھ بجے شہر لے کر جاتی اور سہ پہر چار بجے مسافروں کو واپس لے کر آتی ان مسافروں کا گھروں میں بے تابی سے انتظار ہو رہا ہوتا۔

مگر اب یہ زمانہ اور تناظر صرف میرے اور میرے ہم عمر افراد کے ذہنوں میں آباد رہ گئے ہیں۔ رومن نہر خشک ہو گئی ہے اور اگست کی چاند راتیں گلیوں میں بجلی کی روشنی کے سامنے ماند پڑ گئی ہیں۔ خبر نہیں اب نوجوان لوگ راتوں کو گاؤں سے باہر جاتے اور گپ شپ کرتے ہیں کہ نہیں؟

ابلا اور میں گذشتہ دس برسوں کی باتیں اور حکایتیں کرتے رہے اور پھر ہم نے انٹرویو شروع کیا جو یوں ہے'' ..... میں 1928ء میں پیدا ہوئی، ہم آٹھ بچے تھے میں سب سے بڑی تھی والد خاصے روشن خیال تھے۔ ان دنوں یہ رواج تھا کہ لڑکیوں خصوصاً سب سے بڑی لڑکی کو گھر کے کام کاج پر لگایا جاتا اور بالآخر انہیں بارہ اور چودہ سال کی عمر کے درمیان کسی وقت بیاہ دیا

جاتا۔ میرے والد کے مالی حالات زیادہ اچھے نہیں تھے پھر ان دنوں والد کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ بچوں کے روشن مستقبل کیلئے بھی تگ ودو کرے اور ان کیلئے زریاز مین چھوڑ جائے۔ ہمارے والد نے ان باتوں کی بجائے ہمیں تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا اور پھر ہمیں والد نے سب بھائی بہنوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ میں سکول میں اچھی تھی سبھی مضامین خصوصاً تاریخ کا مضمون میرا پسندیدہ تھا۔ والد کی طرف سے غیر معمولی حوصلہ افزائی اور مدد کے سبب میں بھی بڑی محنت کرتی اور اس طرح میں نے اس وقت کی رائج تعلیم حاصل کی۔ پرائمری سکول سے میں سیکنڈری سکول میں پہنچی اس وقت پورے دمشق بلکہ غالباً پورے شام میں لڑکیوں کا یہی واحد سکول تھا۔ 1947ء میں میں نے کامیابی کے ساتھ تعلیم کا یہ مرحلہ مکمل کر لیا جس کے بعد دمشق یونیورسٹی میں تاریخ میں داخلہ لیا۔

''میں اس زمانے کی چند ایک مراعات یافتہ لڑکیوں میں سے تھی جنہیں یہ مواقع حاصل ہوئے اور جنہیں تعلیم حاصل کرنے میں خاندانی رکاوٹوں نہ سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ ان دنوں تعلیم کو بھی عموماً مردانہ شعبہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں اکثر لڑکیوں کو گھروں کی تنہائی میں خاوندوں کے انتظار میں دن گذارنے پڑتے تھے۔ وہ منتظر رہتی تھیں اپنے دروازوں پر اپنے ہونے والے جیون ساتھیوں کی دستکوں کی۔ کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں چند سال تک محض اس لئے تعلیم حاصل کرتیں کہ ان پر جاہل ہونے کا لیبل نہ لگے اور جو تعلیم جاری رکھتیں وہ جب گھر سے باہر نکلتیں تو اسلامی نقاب چہرے پر ڈال لیتیں۔ ایسی لڑکیاں میری دوست بھی تھیں اور یونیورسٹی میں ساتھی بھی وہ پردہ نہیں کرتی تھیں صرف سماجی دباؤ کے باعث نقاب اوڑھتی تھیں۔ چنانچہ جب وہ یونیورسٹی میں ہوتیں خطرناک علاقہ سے باہر ہوتیں تو برقع یا نقاب اتار دیتیں۔

''یونیورسٹی میں مرد ساتھیوں کا رویہ ملا جلا ہوتا، عموماً ہمیں خاموشی سے قبول کر لیا جاتا پھر جلد ہی افلاطونی قسم کے تعلقات قائم ہوتے اس کے باوجود ان کے ذہن میں ایک سوال گردش کرتا رہتا کہ مرد تو روٹی کماتے ہیں مگر یہ خواتین یہاں کیا بھاڑ جھونک رہی ہیں۔ کم گوئی مناسب لباس ارمہذب رویہ رکھنا ہماری ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ معاشرہ میں مردانہ بالادستی سے بھی تھوڑا تھوڑا ٹکرانا پڑتا۔ اور اصل بات تو یہ کہ ہمیں ہر لمحہ اپنی ذہنی برتری ثابت کرنا پڑتی ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی سے باہر اپنی ہمت اور طاقت سے ثابت کر چکی تھیں کہ اگر ہم مردوں سے آگے نہیں تو ان سے پیچھے بھی نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک

مرتبہ اپنے دوستوں کی طرف سے شک شبہ اور ہدایت کے برعکس میں نے اپنے ایک مرد ساتھی کے مقابلے میں ایک پبلک لیکچر دینے کا چیلنج قبول کرلیا اور پھر میں اس امتحان میں اس سے بازی لے گئی۔ بہت سی عورتیں تو یقیناً اس قسم کا چیلنج قبول کرنے کی جرات ہی نہیں کرتیں۔ لیکن میں نے اس وقت بھی مردانہ برتری کے گمان کو توڑ کر رکھ دیا تھا جب یونیورسٹی سے گریجوایشن کی تھی اور اول آئی تھی۔

''یونیورسٹی سے فراغت کے بعد میں نے ملازمت کی تلاش شروع کی، اور یہاں پھر مجھے کسی رکاوٹ کے بغیر راہ مل گئی گریجوایشن کے فوراً بعد مجھے پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ استاد کی حیثیت سے گھر سے باہر جانے اور کام کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ یہ بات تقریباً تسلیم کی جاچکی تھی کہ خواتین کے لیے درس و تدریس کا پیشہ بہت اچھا ہے بلکہ یہ شعبہ بنا ہی ان کیلئے ہے آج بھی درس و تدریس کو روائتی طور پر خواتین کا ہی میدان مانا جاتا ہے۔

مگر پانچویں دہائی کی سماجی پابندیوں کی وجہ سے عورت کی حیثیت سے میری ترقی رکتی گئی۔ عورت کی حیثیت سے پہلی ضرب تو یہ لگی کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرون ملک جانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ مجھے مصر میں پی ایچ ڈی کرنے کیلئے وظیفہ بھی دیا گیا تھا میں لڑکا ہوتی تو میرے والد اجازت دینے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہ کرتے مگر مجھے اجازت نہیں ملی مجھے نہ صرف اس کا افسوس ہے بلکہ اس بات سے نفرت بھی کہ مجھے محض ایک عورت ہونے کی بنا پر اعلیٰ تعلیم سے روکا گیا۔ میرے والد مجھ پر اعتبار کرتے تھے مگر دوسرے مردوں اور میرے یونیورسٹی کے اساتذہ سے صلاح مشورہ کے بعد اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اکیلے دوسرے ملک نہیں جانا چاہیے وہاں لازماً طرح طرح کے سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں آزاد مضبوط اور کامیاب عورت ہوں۔ مجھے مصر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ دوسرا دھچکا اس کے فوراً بعد لگا۔ مجھے ایک بہتر ملازمت کا موقع ملا مجھے میرے پیشے اور علم کے مطابق قدیم تاریخ سے متعلق عجائب گھر میں ایک عہدے کی پیش کش ہوئی، نہ صرف اس کام میں میری تربیت ہوئی تھی بلکہ مجھے یہ کام پسند بھی تھا لیکن یہاں پھر میرے والد نے کہا کہ میں یہ پیش کش رد کردوں کیونکہ ہوسکتا ہے اس طرح لوگ میرے اور میرے خاندان کے بارے میں باتوں کے طومار باندھنا شروع کردیں۔ میں اب سوچتی ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نے یہ عہدہ قبول کرلیا ہوتا تو آج بالکل ہی الگ مقام پر ہوتی اور میں اپنی زندگی میں کوئی ایسا قابل فخر کام کرجاتی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے

کہ ''کارے کردم'' یہاں دکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ یہ دونوں مواقع اس لئے مجھ سے چھینے گئے کہ میں عورت تھی۔

میرے خاندان نے ہمیشہ مجھے یہ تاثر دیا کہ مجھے جذباتی تعلقات رکھنے کی اجازت ہے مگر میں نے اس کی اس وجہ سے کوشش نہیں کہ کہ مجھے اندازہ ہی نہیں کہ میں کتنی دور تک جاسکتی تھی۔ میرے مرد ساتھی مجھے اپنی بہن سمجھتے تھے۔ مجموعی طور پر ہم عورتیں ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ پختہ خیال اور معقول تعین۔ وہ ہمارے لئے صرف لڑکے تھے ۔ ناپختہ لڑکے .....چنانچہ ہم میں سے کسی نے بھی اپنے ساتھیوں سے شادی کرنے کا نہیں سوچا۔ میری شادی نہیں ہوئی جب کبھی کوئی رشتہ آیا میرے والد مجھ سے پوچھتے ''تمہارا کیا خیال ہے؟'' ..... میرا جواب ہوتا ''میرا کیا خیال ہوسکتا ہے میں تو اس شخص کو جانتی ہی نہیں۔''

یہ سچ ہے کہ میں فیصلہ کرنے سے پہلے اس شخص کو ایک دو بار دیکھ سکتی تھی مگر یہ تو کافی نہیں تھا۔ دو پی ایچ ڈی ڈاکٹروں نے مجھ سے شادی کرنا چاہی مگر دونوں انتہائی ناپختہ تھے۔ میں دونوں میں سے کسی کو بھی پسند نہ کرسکی۔ مجھے ایک ایسے مرد کی شدید ضرورت تھی جس کی میں عزت بھی کرسکوں اور پسند بھی۔ مجھے آج بھی ایسے مرد کی تلاش ہے۔ کام کے دوران یا سماجی تقریبات میں جن مردوں سے میرا سابقہ پڑا وہ بہت ہی ہلکے بلکہ بے وقوف تھے۔ اگر میں نے کسی سے محبت کی ہوتی تو پھر میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اس سے شادی کرلیتی اور کوئی مسئلہ بھی پیدا نہ ہوتا مگر میں نے کسی سے محبت ہی نہیں کی۔ ہمارے خاندان میں جیون ساتھی چننے کی پوری آزادی ہے مگر مجھے یہ آزادی بھی غلط قسم کی آزادی نظر آتی ہے۔ ہمیں اپنے والدین کی طرف سے کچھ نہ کچھ تو اشارے ملنے چاہئیں مگر میرے والد نے کبھی اس قسم کا کام نہیں کیا اور میں اس حساب سے اتنی پختہ کار نہیں تھی کہ صحیح فیصلہ کرسکتی۔ دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ میرے خاندان کے حالات میرے لئے مددگار نہیں تھے۔ میں ..... بھائی بہنوں سے بڑی تھی جب ہمارے والد کا انتقال ہوا وہ سب سکول میں پڑھتے تھے اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ اب وہ میری ہی ذمہ داری ہیں۔ میں کیسے اپنے بہن بھائیوں کو بے یارومددگار چھوڑ سکتی تھی اور پھر ایسا کوئی بھی نہیں ملا جس کے خاطر میں یہ قربانی کرگذرتی۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں شادی بھی نہیں کرپاؤں گی اور ایک دن آئے گا جب میں صرف ایک عمر رسیدہ تن تنہا عورت بن کر رہ جاؤں گی۔ لیکن مجھے اس پر بھی کوئی

پچھتاوا نہیں ہے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی جو بڑی دیر سے اس کے چہرے پر بہہ جانے کیلئے بے تاب تھے۔ مجھے ایک طرح تو یہ بات اچھی لگی کہ اس نے میرے سامنے بھڑاس نکال لی اور دوسری طرف مجھے افسوس ہوا کہ اس نے دوسروں کی خاطر اتنے دکھ اُٹھائے ہیں۔

میں اپنے خیالات میں گم تھی کہ مجھے اچانک احساس ہوا کہ ابلا نے رونا بند کر دیا ہے اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں کہ میں آنکھیں اٹھاؤں اور اس کو دیکھوں اور جب میں نے ایسا کیا تو اس نے پوچھا کہ میں کیا سوچ رہی تھی۔'' کچھ خاص نہیں'' میں نے جواب دیا'' شاید دوسری عورتوں کے مختلف مسائل کے بارے میں ۔مگر کیا آپ یہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہیں'' میں نے جلدی سے سوال کیا'' آپ کا ان عرب عورتوں کے مسائل کے بارے میں کیا خیال ہے جو کہتی ہیں کہ اگر ہمیں اپنے طور پر زندگی گذارنے کی آزادی دی جاتی ہے تو پھر ہم اپنے خاوندوں یا خاندان کے ساتھ رہنا قبول نہیں کریں گے۔

ابلا بڑی نرمی سے مسکرائی اور کہا'' میں اس کا بھی قصہ سناتی ہوں میں نے پیسہ بچایا تھا ایک تعمیراتی سوسائٹی میں فلیٹ خریدنے کیلئے جو آخر کار مجھے مل گیا میں نے اپنے چچا سے کہا میں چاہتی ہوں آپ میرا فلیٹ جا کر دیکھیں۔اُنہوں نے ہکا بکا ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا کہ میں فلیٹ کس کیلئے خریدنا چاہتی ہوں؟ میرا جواب تھا اپنے لئے ،آپ کا خیال ہے کہ میں اپنے شادی شدہ بھائیوں یا بہنوں میں سے کسی کے پاس رہوں گی..... میرے چچا نے ایک بار پھر عجیب نظروں سے مجھے دیکھا'' کیا یہ ممکن ہے؟ کیا تم اکیلے رہنے کا سوچ بھی سکتی ہو؟'' بالکل میں اکیلی رہ سکتی ہوں؟ ..... میں جواب دیا۔

ہمارا معاشرہ عورتوں کو اپنے طور پر اکیلا رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ضرورت چند دلیر اور مضبوط عورتوں کی ہے جو اس پابندی یا خیال کو چیلنج کر کے ہمیشہ کیلئے توڑ دیں ۔یہیں لوگوں کو احساس دلانا ہے کہ اگر عورتیں بھی اپنا گھر اسی طور پر آزادانہ چلا سکتی ہیں جس طرح مرد چلاتے ہیں تو پھر وہ کیوں اکیلی نہیں رہ سکتیں۔ میں تمہیں ایک اور قصہ سنانا چاہتی ہوں۔ والد کی وفات کے کئی سال بعد میں بیروت جانا چاہتی تھی۔اس زمانے میں عورت کے اس طور آزادانہ سفر کرنے کیلئے اجازت درکار ہوتی تھی۔ میں نے ویزا کیلئے درخواست دی۔ متعلقہ اہل کار نے پوچھا والدین یا سرپرستوں کا اجازت نامہ کہاں ہے؟ میں نے کہا وہ ہیں ہی نہیں۔ میرے والد کا انتقال

ہو چکا ہے باقی میرے سارے بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ میرا صرف ایک چھوٹا بھائی ہے جو مجھ سے اجازت لئے بغیر گھر سے بھی نہیں نکلتا۔ تم چاہتے ہو کہ میں اس سفر کیلئے اس بھائی سے اجازت مانگوں؟

وہ تھوڑا سا جھجکا پھر کہنے لگا ''مگر قانون تو یہی ہے''

''کیسا قانون'' میں زور سے چیخی ''جب میں خود اپنے خاندان کی سربراہ ہوں تو میں اپنے لئے کہاں سے سربراہ ایجاد کروں؟ آخر کار مجھے ویزا تو مل گیا مگر بڑی مشکل کے ساتھ۔ عورت کی حیثیت سے ہمیں اس قسم کے ہتک آمیز اور بیکار قوانین کے خلاف لڑنا ہوگا۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کو خاوندوں کی رضامندی کے بغیر سفر نہ کرنے دیا جائے۔ میری شروع سے رائے ہے کہ عورت جہاں اور جب چاہے آزادانہ طور پر سفر کرنے میں آزاد ہونی چاہئے۔ اور اب عورتیں آزادانہ سفر کر سکتی ہیں۔ اگر چہ یہ قانون اب بھی موجود ہے مگر اس کا ذکر کرنے کی ہمت کسی کو نہیں پڑتی نہ کسی عورت سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آیا اس کے پاس اجازت نامہ ہے۔ دراصل گذشتہ دو دہائیوں سے معاملات اس حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔

''آپ نے پانچویں دہائی سے لیکر اب تک عورتوں کے مسائل کو دیکھا اور برتا ہے یہ بتائیں کہ شام میں اس عرصہ میں آنے والی تبدیلیوں سے عورت کی حیثیت پر کیا فرق پڑا ہے؟''

''حقیقت تو یہ کہ شام میں خاص طور پر گذشتہ دو دہائیوں میں عورتوں کے معاملہ میں اتنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ کہ یقین ہی نہیں آتا۔ یونیورسٹی میں داخلوں کی مثال ہی لے لو اب لڑکیوں کو مکمل آزادی ہے کہ جس شعبے میں اور جتنی تعداد میں چاہیں داخلہ لے لیں۔ یونیورسٹیاں میں طلبا اور طالبات کی تعداد نصف نصف ہو چکی ہے۔ اور تو اور ان پڑھ مذہبی قسم کے مرد بھی اپنی بچیوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات ادا کرنے کیلئے دن رات محنت کرتے ہیں۔ پرائمری اور سیکنڈری سکولوں میں زیادہ تر استاد عورتیں ہیں۔ پرائمری سکول میں تو اب مرد استاد ا کا دکا ہی رہ گئے ہیں۔ توقع ہے کہ تھوڑے عرصہ میں پرائمری کی ساری ساری تعلیم عورتوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ حکومت کی موجودہ تعلیمی پالیسی یہ ہے کہ تمام سکولوں میں مخلوط تعلیم کر دی جائے۔ پرائمری کی سطح تک یہ تو یہ مقصد حاصل کیا جا چکا ہے۔ ثانوی تعلیم کی سطح پر بھی آپ لڑکوں کے سکولوں میں بھی عورتوں کو پڑھاتے ہوئے دیکھیں گی۔ شام میں مجموعی طور پر کل کارکن آبادی میں سے پچاس فی صد عورتیں ہیں۔ شہر کے مرکز میں ڈھائی بجے کے قریب کھڑے ہو کر دیکھو اس وقت ملازم پیشہ لوگ دفتروں

سے فارغ ہوتے ہیں تم دیکھو گی کہ ان میں زیادہ تر عورتیں ہیں جن میں سے اچھی بھلی تعداد پچاس فی صد ہے جبکہ فارمیسی کے شعبہ میں ان کی شرح ستر فی صد ہے۔ جہاں تک دوسرے شعبوں کا تعلق ہے کارخانوں میں بھی زیادہ تر زنانہ کارکن ہیں۔اس کی ایک وجہ ہے کہ مردوں کی بڑی تعداد فوج میں ہے اس لئے ان کی جگہ ملک کو خاتون کارکنوں کی ضرورت ہے۔تاہم ایک اور بنیادی وجہ یہ بھی کہ عورتوں نے بہتر حالات زندگی اور اپنی آزادی کیلئے جدوجہد شروع کر رکھی ہے عورتیں معاشی طور پر آزاد ہونا چاہتی ہیں وہ اپنی گذر اوقات کے لیے خاوند باپ یا بھائیوں پر تکیہ نہیں کرنا چاہتیں۔جس استانی کے چار بچے ہیں وہ کام کر کے تھک ٹوٹ جاتی ہے مگر وہ اپنا معیار زندگی بہتر بنانا چاہتی ہے۔اگر اس کیلئے اسے اپنی صحت اور آرام کی بھی قربانی دینا پڑے تو وہ یہ قربانی دے کر وہ کچھ بننا چاہتی ہے جس کی حق دار وہ خود اس کی اپنی نظر میں بھی ہو۔

''اب جبکہ شام کی عورت نے تعلیم میں پہل کر لی ہے ملازمت بھی مل گئی ہے تو آپ کے خیال میں وہ اپنے آپ کو شامی مرد کے برابر سمجھنے لگی ہے؟''

معاشی طور پر آزاد عورت اپنی نجی زندگی میں مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ ہاں پہلے کے مقابلے میں بہتر حیثیت میں ضرور ہے۔اب وہ اپنا خیال بھی رکھ سکتی ہے اپنے بچوں کیلئے چیزیں خرید سکتی ہے اور اس کا اپنے آپ پر اعتماد بڑھ گیا ہے مگر بعض مرد اب بھی عورتوں کی تنخواہوں پر قبضہ کر کے انہیں کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سارا دن گھر سے باہر کام کرتی ہے تھکی تھکائی واپس لوٹتی ہے تو اسے گھر کا بھی سارا کام کرنا پڑتا ہے۔اسے کھانا پکانا پڑتا ہے، برتن دھونے، گھر کی صفائی اور بچوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اس طرح اسے دوہرا کام کرنا پڑتا ہے۔مزید ستم یہ ہے کہ اسے پہلے کے مقابلے میں ہر کام زیادہ بہتر معیار کا کرنا پڑتا ہے مثلاً استری کرنا، صفائی کرنا اور کھانا بہتر پکانا ..... بہتر اس لے کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو تعلیم اور ملازمت کے باعث عورت نے مرد کے ساتھ اخلاقی برابری تو حاصل کر لی ہے مگر حقیقی مساوات ابھی حاصل نہیں ہوئی۔اب تک تعلیم اور ملازمت کے باعث جو کچھ حاصل ہوا وہ ہے روائتی گھریلو کام کے مقابلے میں زیادہ کام کرنا جس کا حاصل بے آرامی اور تھکن ہے ملازمت کے ساتھ ساتھ گھر چلانا، بچے پالنا اور گھر بنائے رکھنا یہ عام عورت کا نہیں مہان عورت (سپر ویمن) کا کام ہے۔چھوٹے بچوں اور لڑکیوں لڑکوں کے لئے نرسریاں اور کنڈر گارٹن ہیں مگر ضرورت کے مطابق نہیں۔حکومت ان تمام اداروں میں نرسریاں کھولنا چاہتی ہے جہاں پانچ یا

پانچ سے زائد عورتیں کام کرتی ہیں۔ یونین بھی اپنی نرسریاں چلاتی ہے مگر ملازمت کرنے والی عورتوں کی تعداد کم پڑنے لگتی ہے۔ وزارت تعلیم نے سکولوں میں نرسریاں کھولنی شروع کر دی ہیں۔ بجلی کی وزارت ریسرچ سنٹروں اور خاصے کارخانوں میں بھی نرسریاں کھولی گئی ہیں۔ عورتیں وہاں کے حالات کار سے بڑی خوش ہیں۔ مائیں کام پر آتے وقت بچوں کو ساتھ لانے سے بڑی مطمئن ہوتی ہیں کہ آدھی چھٹی میں وہ آ کر بچوں کو بھی دیکھ جاتی ہیں اور کام ختم کرنے کے بعد انہیں اپنے ساتھ گھر لے جاتی ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ باقی تمام وزارتیں اور سنٹر بھی جلدی ہی ایسی نرسریاں کھولیں گے۔ عورتیں جب کام کو جائیں تو بے یقینی اور پریشانی کے عالم میں معلق ہونے کی بجائے یہ یقین ہو جائے کہ ان کے بچے محفوظ ہاتھوں میں ہیں اور ان کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح ہو رہی ہے پر یہ آسان کام نہیں ہے۔

مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک اور حکومت کو سستی اور اچھی نرسریاں قائم کرنے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہے اور وہ تمام اداروں کی طرف سے نرسریوں کے قیام کے معاملہ کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر عورتوں کو بھی مردوں کے برابر موقع ملتے اور برابری بھی ہوتی تو مختلف شعبوں میں عورتوں کی کارکردگی مردوں سے بہتر ہوتی؟''

''یقیناً وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ جدت طراز اور بخیل ہوں گی مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ صابر و شاکر اور زیادہ آرزومند ہوتی ہیں ان کے خواب اور تخیل بھی مردوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ مردوں کے پاس ایک ہی خاص شئے ہے اور وہ جسمانی طاقت ہے لیکن اگر عورت کو برابر مواقع دیئے جائیں تو اس کی کارکردگی یقیناً بہتر ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ قرآن میں عورتوں کے لیے جائیداد میں سے ایک حصہ اور مرد کے لیے دہ حصے آئے ہیں مگر یہ اس لیے کہ اس وقت صرف مرد ہی سارے خاندان کا کفیل ہوتا تھا۔ اب جبکہ عورت کی آمدنی بھی مرد کے برابر ہوگئی تو پھر ان حالات میں مجھے اس قانون کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔''

''آپ کے خیال میں عورتوں کی آزادی کیلئے ان اسلامی قوانین میں ترمیم و اضافہ کرنا ممکن ہے؟''

اگر عورت کی مرد کے ساتھ برابری کے نقطہ نظر سے اسلامی قوانین کو دیکھا اور سمجھا جائے اور ان کی تعبیر بھی اسی طور کی جائے تو یہ ممکن ہے۔ مگر مرد ایسا نہیں کرنا چاہتے اس کے برعکس وہ ان

MashalBooks.org

تبدیلیوں کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ ایک یہ بات بھی ہے کہ عورتیں بھی ایسی تبدیلیاں لانے کیلئے زیادہ پر جوش انداز میں سرگرم نہیں۔ عورتوں کو یہ لڑائی لڑنی ہے اور اس میں عزم اور ارادے سے کام لے کر مسلسل جدوجہد کرنی ہے۔ اس وقت تک جو برابری اُنہوں نے حاصل کی ہے وہ ان کے لیے بھی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ کیونکہ اس طرح ان پر پرانی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ کئی نئی ذمہ داریاں بھی آن پڑی ہیں۔ ہمارے مرد خودغرض ہیں وہ ہماری زندگیوں پر اپنا کنٹرول قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی بیویوں کو چاہتے بھی ہوں گے مگر انہیں اپنے آپ سے زیادہ محبت ہے اپنی تفریح اور آرام کا انہیں زیادہ خیال ہے۔ دوسرے چند مرد گھر میں عورتوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں مگر اکثریت عورتوں کی کوئی مدد نہیں کرتی۔ عورتیں ہمیشہ کے لیے یہ صورت حال برداشت نہیں کر سکتیں۔ وہ بڑی جلدی ایسے مقام پر پہنچنے والی ہیں جہاں وہ یہ سب کچھ بروقت نہیں کر سکیں گی اور تب وہ بڑی تبدیلی کے لیے جدوجہد کریں گی۔''

''آپ کے خیال میں عورتوں کا اپنے اپنے طور پر جنگ کرنا بہتر طریقہ ہے یا اپنی تنظیموں کے ذریعے لڑائی کرنا زیادہ سودمند ہے؟''

''میرا ایمان ہے کہ ذاتی اور انفرادی جنگ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی تنظیموں کے ذریعے۔ عورتوں کو اپنے حقوق کیلئے انفرادی طور پر بھی لڑنا چاہیے اور زنانہ تنظیموں کو عورتوں کے حقوق اور آزادی کی جنگ کو زیادہ سنجیدگی سے دیکھتی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے وہ اقلیت میں ہیں۔ وویمنز یونین کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ ایسی نوجوان ذہین اور پرجوش خواتین کو تنظیم میں لائیں جو عورتوں کے حقوق کیلئے لڑنے پر آمادہ ہوں۔ میں یونین کی رکن ہوا کرتی تھی مگر اب میں نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ اب میں کوئی قابل ذکر کام کر ہی نہیں سکتی۔ اب صرف ذاتی جدوجہد ہی کافی نہیں اس لئے ہماری ضرورت یہ ہے کہ نظریاتی طور پر زیادہ باشعور کام کرنے کی اُمنگ رکھنے والی نوجوان فیمینسٹ عورتیں ان تنظیموں پر دھاوا بول دیں۔''

''آپ شامی عورت کا یورپی عورت سے کس طور تقابل کریں گی؟''

میرا ایمان ہے کہ یورپی عورت بھی خوش نہیں ہے۔ وہ بھی اسی طور سے تھک تھکا گئی ہے جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے مگر ہمارے مقابلے میں اس عورت کو زیادہ سماجی حقوق حاصل ہیں۔ ذاتی طور پر میں چاہوں گی کہ شامی عورت یورپی عورت کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے اپنے راستے خود تراشے۔ میں چاہوں گی کہ ہمارے خاندانی تعلقات کے مثبت رشتے برقرار رہیں۔ ایک جڑا جڑا

یا خاندان اچھی بات ہے۔ یورپی عورت اس تحفظ سے محروم ہو چکی ہے ہم اگر اس تحفظ کو چھوڑ دیں گے تو یہ افسوس ناک اور تکلیف دہ ثابت ہوگی۔ خاندان کی مدد اور سرپرستی کے بغیر فرداً فرداً زندہ رہنا بڑا مشکل کام ہے۔ ہر معاملہ میں یورپی عورت کی نقالی کرنے کی بجائے ہم اس قابل ہیں کہ اپنی رہ متعین کر سکیں اور میرے خیال میں ہم بڑی کامیابی سے اس راہ پر چل بھی پڑے ہیں۔''

''عورتوں کو مکمل آزادی حاصل کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔ انہیں جنس کے امتیاز کی بنا پر پیچھے دھکیلے جانے کی بجائے اپنا مقام و مرتبہ حاصل کرنا چاہیے۔''

مقبولہ شالاق

1941ء میں مقبولہ شالاق نے یونیورسٹی میں داخلہ لے کر شام میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا۔ 1945ء میں شام نے فرانس سے آزادی حاصل کی اور اسی سال مقبولہ نے قانون کی ڈگری لی۔ اس نے عربی کے ادبی رسائل میں بہت مضامین اور نظمیں لکھیں اس کی مختصر کہانیوں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں پرندے کی شادی۔ مرغی کے کارنامے۔ اور میرے ملک کی کہانیاں شامل ہیں۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی وہ ایک ناول لکھ رہی تھی یہ ناول 1930ء سے لیکر آج تک شامی عورت کی سماجی تاریخ پر مبنی ہے۔

چونسٹھ برس کی عمر میں وہ اب بھی ان مسائل کے بارے میں بڑے جذباتی انداز میں باتیں کرتی ہے جو اس کی ساری زندگی اور کام میں مرکزی مقام رکھتے ہیں۔ یہ مسائل عورتوں اور ان کی آزادی سے متعلق ہیں۔ اگرچہ وہ تعلیم و تربیت کے اعتبار سے قانون دان ہے مگر وہ اپنے ملک کے ادب اور ادبی تاریخ میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا۔

''جب میں 1921ء میں پیدا ہوئی اس وقت اہل شام ایک اور ذلت آمیز غیر ملکی قبضے کا تلخ ذائقہ چکھ رہے تھے۔ ہماری نوخیز اور ناتجربہ کار فوج پہلی جنگ عظیم کی ایک فاتح فوج فرانس کے ہاتھوں شکست کھا چکی تھی اور ہمارے بعض وزیروں کو حملہ آور فوجیں قتل کر چکی تھیں۔ جدید زمانے میں ہماری پہلی آزاد ریاست سامراجی فرانس کے مظالم کے نیچے دب گئی۔ آزادی پسند شامیوں نے صدیوں تک جو خوبصورت خواب دیکھا تھا وہ انہی کے ہاتھوں چکنا چور ہو گیا جنہیں شامی آزادی کا برج تصور کرتے تھے۔ میں ان دنوں جو نئی کتاب لکھ رہی ہوں اس میں اس زمانے کی عورتوں کے سماجی حالات بیان کروں گی۔ ہماری قومی آزادی کی پہلی تحریک تین سال

(1925-28ء) تک چلی جس کو جدید ترین اسلحہ منظم فرانسیسی فوج اور وحشی پولیس فورس کی بے مثال ظالمانہ کاروائی سے ختم کر دیا گیا جیسا ظلم اس زمانے میں توڑا گیا ویسا ظلم تو رجعت پسند عثمانیوں کے عہدے میں بھی نہیں توڑا گیا تھا۔

عام لوگوں کو ڈرانے کیلئے فرانسیسی ظالم قیدیوں کو سرعام زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ان دنوں خاتون مجاہدوں کا تصور بالکل ہی عجیب سا تھا مگر ان دنوں شامی عورتیں شہید بھی ہوئیں جو آج بھی ہماری قومی ہیرو ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب معاشرے میں عورت کی روائتی حیثیت کی اونچی دیوار میں شگاف پڑ گیا تھا۔ مجھے ان دنوں لوگوں کے شعور کے بارے میں زیادہ تفصیلات یاد نہیں مگر ان لوگوں کے بارے میں مجھے خاصی باتیں یاد ہیں کیونکہ جس گھر میں میری پرورش ہوئی اسے بھی غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف مزاحمتی جدوجہد میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں بھی فرانسیسی قبضہ کے خلاف ایک طرح سے خاموش مزاحمتی تحریک میں شامل ہوگئی۔ چنانچہ ہمارے گلی کوچوں کے مقدر میں غیر معمولی مناظر دیکھنا لکھا تھا۔عورتوں کے اور مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں کا احتجاجی مارچ۔

میرے والد بہت پڑھے لکھے تھے۔ جج تھے۔ اُنہوں نے ہم سب بچوں کو تعلیم دلوائی۔ سکول میں فرانسیسی مشنری استاد تھے فرانسیسی استانیاں خاص طور پر ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔انہوں نے ہمیں اپنے سے کم تر ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کی مگر جیسے جیسے وہ ہماری قومی تفاخر اور وقار کو مجروح کرتیں۔فرداً فرداً تذلیل کرتیں ہم یہ ثابت کرنے کیلئے تعلیم حاصل کرنے پر کمربستہ رہتے کہ ہم بھی اتنے ہی اچھے ہیں جتنے وہ خود کو سمجھتے ہیں۔ایک بار میں نے فرانسیسی میں ایک نظم لکھی اور اپنی فرانسیسی کی ٹیچر کی رائے معلوم کرنے کیلئے اسے دے دی۔اس نے نظم واپس کرتے ہوئے بڑے مفکرانہ انداز میں کہا ''شاعری پر ہاتھ صاف کرنے سے پہلے جاؤ اور ڈکٹیشن سیکھو۔''

تعصب میں مزید اضافہ یوں بھی ہوا کہ فرانسیسی فوجی ہمیں سڑکوں پر تنگ کیا کرتے تھے اور عورتوں کے ساتھ ان کا رویہ اتنا تذلیل آمیز تھا کہ ہم گھر سے باہر جانے میں بھی جھجکتے تھے۔ ایک مرتبہ میری ایک سہیلی باہر نکلی تو ایک فرانسیسی پولیس والے نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ فرانسیسی پولیس والے سڑک پر نظر آنے والی ہر شامی عورت کو فاطمہ کے عربی نام سے پکارا کرتے تھے۔ میری اس سہیلی نے نقاب پہن رکھا تھا۔فرانسیسی پولیس والا اسے فاطمہ فاطمہ کہتا اس کا

تعاقب کرتا رہا۔ ایک گلی سے دوسری اور پھر تیسری۔ حتیٰ کہ وہ تھک گیا اسی عرصہ میں میری سہیلی کا گھر بھی آ گیا اس نے دہلیز پر قدم رکھے اور مڑ کر اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔ غالباً اس نے لڑکی کا چہرہ دیکھا جو اس کے فرانسیسی ذوق کے مطابق نہیں تھا چنانچہ اس نے کہا ''فاطمہ تم پر لعنت ہو۔'' اور یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔

1925ء کے انقلاب میں دمشق کی عورتوں نے لڑنے والے مجاہدوں تک اسلحہ پہنچا کر ایک زبردست کردار ادا کیا تھا۔ دمشق میں بڑی مجاہدانہ کاروائی الغوطہ میں ہوا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میری ایک دوست کو بتایا گا کہ اس کے بھائی اور اس کے بیٹے کو الغوطہ میں اسلحے کی ضرورت ہے۔ یہ دونوں ماموں بھائی فرانسیسی فوجیوں کے ہاتھوں مارے گئے) انہیں اسلحہ پہچانے کیلئے اس خاتون کو ایک پل سے گذرنا پڑتا تھا جس پر ایک چیک پوسٹ بھی تھی جہاں مردوں کے علاوہ عورتوں کی تلاشی لی جاتی تھی۔ ایک فرانسیسی پولیس وال امردوں اور ایک فرانسیسی عورت عورتوں کی تلاشی لے رہی تھی۔ اس نے ہتھیار اپنے نومولود بچے کے جسم کے ساتھ باندھ دیا اور پھر ایک معصوم مگر پریشان حال ماں کا روپ دھار کا چیک پوسٹ گذرنے میں کامیاب ہوگئی۔ چنانچہ ہماری عورتیں ایسے ہی حیلوں بہانوں سے چیک پوسٹ سے گذر جاتیں اور اسلحہ اور گولہ بارود شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں پہنچاتی رہیں۔ جب انقلاب کو 1928ء میں انتہائی وحشیانہ طور پر دبا دیا گیا تو پھر خاموش احتجاجی تحریک شروع ہوئی جس میں شامی عورتیں اور بھی سرگرم ہوئیں اور احتجاجی مظاہروں میں بڑی تعداد میں شریک ہوتی رہیں۔

ان دنوں ویمنز سوسائٹیاں بنائی گئیں جن کی ارکان نے بڑے دھیمے انداز میں سامراجی حکومت کے حق میں تقریریں شروع کیں۔ ایک بار اچانک ثوریہ حافظ نام کی ہماری رکن کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔ ''میرے مرحوم والدرات میرے خواب میں آئے اُنہوں نے کہا بیٹی جن لوگوں نے مجھے ہلاک کیا ہے وہ پھر میرے ملک کا ایک ٹکڑا چرانے آ گئے ہیں۔

انہیں یہ دھرتی نہ چرانے دینا۔ دُشمن کا مقابلہ کرو اور ہمارے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی ناپاک کوشش کو ناکام بنادو، معزز خواتین آؤ ہم بھی کچھ کریں آؤ اپنی آواز بلند کریں، آؤ ہم بھی احتجاج کریں۔'' وہ دوازے کی طرف گئی عورتوں سے کہا چلو احتجاج کرتے ہوئے وزیراعظم کوس کے دفتر میں احتجاجی مراسلہ دیتے ہیں ثوریہ کی جرات مندانہ دعوت پر ہیرے جواہر اور حریر پہننے والی جدید سمارٹ لباس میں ملبوس یہ معزز بورژوا خواتین بھی دو دو کی ٹکڑیوں میں باہر نکلیں اور پر

امن مظاہرہ کرتی ہوئی وزیراعظم کے دفتر تک چلی گئیں۔گلیاں اچانک مردوں سے بھر گئیں ظاہر ہے کہ مرد یہ نادر قسم کا مظاہرہ دیکھنا چاہتے تھے وہ ہماری طرف اشارہ کرتے اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہتے ''وہ فلاں کی بیوی ہے اور یہ فلاں کی بیٹی ہے۔جب ہم اپنی منزل پر پہنچے تو ہم نے احتجاجی خط وزیراعظم کو دیا اور اسی مضمون کا ایک تار لیگ آف نیشنز کو بھیجا جس کی جانشین اقوام متحدہ ہے۔سبھی عورتوں کے چہروں پر نقاب تھے مگر بعض چہروں پر نقاب بہت باریک تھے جو رنگ میں ان کے کپڑوں سے میچ کرتے تھے اس قسم کے لباس میں وہ زیبائشی سامان زیادہ نظر آئیں جن سے احتجاجی مارچ کا مقصد بھی فوت ہو جاتا دراصل نقاب پھر بتدریج باریک سے باریک تر ہوتا گیا حتیٰ کہ پھر کچھ عورتوں نے اس مکمل طور پر ترک کر دیا مگر یہ تبدیلی بھی 1940ء سے پہلے نہیں آئی۔

فرانسیسی قبضہ کے زمانے میں شام میں کوئی یونیورسٹی نہیں تھی صرف ایک میڈیکل اور ایک لاکالج تھا دونوں میں کوئی طالبہ نہیں تھی 1939ء میں پہلی بار ایک شامی عورت نے لاکالج میں داخلہ لیا مگر چار دن کلاس میں آئی اور پھر پڑھائی چھوڑ گئی۔اس کے دو سال بعد میں نے لاکالج میں داخلہ لیا اور حقیقتاً پہلی شامی خاتون میں تھی جس نے دمشق یونیورسٹی سے گریجوایشن کی۔یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ میں نے کالج میں بڑا مشکل وقت گذارا مگر میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ میں شکست نہیں مانوں گی۔طالب علم اور استاد سب مرد تھے، مجھے ہراساں کرتے اور ہر وقت اس اُمید پر تنگ کرتے کہ میں کالج چھوڑ جاؤں گی۔وہ مجھ سے اس لئے بھی نفرت کرتے کہ میں نے یونیورسٹی میں جانے سے پہلے ہی نقاب اُٹھا دیا تھا۔ایک لیکچرار نے تو مجھے یہاں تک کہا کہ میں ان کے لیکچر کے دوران چہرے پر نقاب ڈالوں اور پیریڈ ختم ہونے کے بعد چاہوں تو یہ نقاب اتار دوں یا اوڑھے رکھوں مگر میں نے کہا کہ میں اتنی منافق نہیں ہو سکتی۔میں نے نقاب اس لئے اتارا تھا کہ میں اس قسم کے پردے پر یقین ہی نہیں رکھتی تھی اور میں اپنے اس یقین کے برعکس دوبارہ نقاب نہیں اوڑھ سکتی تھی۔ان دنوں دمشق شہر میں دیکھی جانے والی بے پردہ بیٹیاں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں۔تمام استاد میری بے پردگی پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے منہ زبانی امتحان میں فیل کر دیتے مگر میں ہر بار تحریری پرچوں میں کامیاب ہو جاتی۔میرے ساتھی طالب علم بھی میری پریشانی کا سامان پیدا کرتے رہتے مگر مجھے اپنے خاندان کی پوری حمایت حاصل تھی۔

MashalBooks.org

چار سال بعد 1945ء میں میں نے قانون میں گرایجوایشن کر لی۔ میں گرایجوایٹ تو تھی مگر میرے لئے کسی شعبہ میں کوئی ملازمت نہیں تھی جہاں کہیں بھی گئی مجھے بتایا کہ لاگریجوایٹ کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں استاد بھی نہ بن سکی کیونکہ نصاب میں قانون کی تعلیم شامل ہی نہیں تھی۔ آخر کار میں شام کے مسٹر شکری القوا تلی سے ملی جنہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تعلیم وتدریس کا شعبہ عورتوں کیلئے معزز شعبہ ہے اس لئے اس میں چلی جاؤں۔ اُنہوں نے وزارت تعلیم میں ٹیلیفون کیا اور اُنہوں نے مجھے ایک خاص سکول میں مقرر کر دیا جب میں نے اپنی پہلی تنخواہ وصول کی تو مجھ پر کھلا کہ مجھے کسی ڈگری کی بنا پر نہیں بلکہ ثانوی تعلیم کے سرٹیفکیٹ کی بنا پر نوکری دی گئی ہے۔

''حیرت ہے کہ میرے حساب میں آج بھی ہمارے مرد تقریباً اسی طور سوچتے ہیں'' مقبولہ شالاق نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''مرد عورتوں کی آزادی کے بارے میں لیکچروں اور جلسوں کے دوران جو کچھ کہتے ہیں ان میں سے اکثر اپنے گھروں میں اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اس کے برعکس سلوک کرتے ہیں۔ ایک شامی ادیب نے جس کی تحریروں کی میں بہت مداح تھی، مجھ سے کہا کہ وہ کسی تعلیم یافتہ خاتون سے شادی نہیں کرے گا وہ کوئی چودہ سالہ لڑکی بیاہے گا جو اس کیلئے کھانا پکا سکے اس کی دیکھ بھال کر سکے اور اس سے کسی بات پر تکرار یا بحث کی جرات نہ کر سکے۔ اور اس نے بالکل اسی طرح کیا۔ میں نے ایک بار اس سے پوچھا کہ وہ اس لڑکی سے کس طور بات کرتا ہے یا کس انداز میں افہام وتفہیم ہوتی ہے تو جواب تھا ''میں دن میں دس گھنٹے لکھتا پڑھتا ہوں اور پھر ایک دو گھنٹہ اس کی احمقانہ قسم کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔''

''بہر طور اس زمانے کے مقابلے میں آج عورت کے حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اب عورتیں سکولوں یونیورسٹیوں میں جاتی ہیں اور اپنی تعلیمی اہلیت کے مطابق ملازمتیں حاصل کرتی ہیں۔ گذشتہ چالیس برس کے دوران شام کی عورتوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ وہ ناقابل یقین ہے ہم نے 1945ء میں آزادی حاصل کی 1946ء میں یونیورسٹی نے اپنے کالجوں کے دروازے عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے کھول دیئے۔ عورتوں نے اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھایا اور تمام کالجوں میں داخلہ لیا۔ تب سے اب تک عورتوں نے بارہا یہ ثابت کیا ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ہیں۔ دریں اثنا عورتوں کے بارے میں مردوں کے روائتی رویے میں بھی بڑی تبدیلی آئی اب شامی عورتیں صرف ڈاکٹر انجینئر اور پارلیمان کی رکن ہی

نہیں۔ پیرا شوٹسٹ اور فوجی افسر بھی ہیں۔ تاہم میرے نزدیک تساہل کی گنجائش نہیں ہمیں معاشرے میں مزید بہتر مقام بنانے کے لیے ابھی اور لڑنا ہے۔ بہرطور اب خواتین سے شکایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب میں مڑ کر دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ میرے بچپن کے زمانے سے اب تک ہم نے بڑا لمبا سفر کیا ہے اور ابھی یہ سفر جاری ہے۔''

''کیا آپ کے نزدیک عورتوں کی معاشی خودمختاری کے سبب انہیں معاشرتی آزادی حاصل ہوئی جس کے نتیجے میں اب کیا وہ خوش ہیں؟''

نہیں میرا نہیں خیال کہ وہ زیادہ خوش ہیں وہ تو تھک گئی ہیں۔ انہیں دن میں دوگنا کام کرنا پڑتا ہے وہ باہر کام کرنے جاتی ہیں تاکہ خاندان کے بجٹ میں حصہ ڈالیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انہیں کھانا پکانا پڑتا ہے صفائی کرنا ہوتی ہے۔ دھلائی بھی اور خاوند اور بچوں کی دیکھ بھال بھی۔ میرے خیال میں اب انہیں تقسیم محنت کا مسئلہ بھی درپیش ہے وہ کام اس لئے کرتی ہیں کہ وہ کچھ بن سکیں مگر روائتی شعبوں میں ان کے لیے کوئی خاصا الاؤنس یا رعایت نہیں دی گئی۔ صرف ایک مثال پیش کرتی ہوں۔ جس ماحول میں میری دادی رہا کرتی تھیں اور جس ماحول میں میں رہتی ہوں ان میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر میں آج بھی اسی قسم کے کھانے پکاتی ہوں جیسے وہ پکایا کرتی تھیں۔ اگرچہ ہماری زندگی میں ڈرامائی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ مگر ہماری خوراک میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ ہم نے اپنے دسترخوانوں کو تبدیل نہیں کیا۔ دمشق میں جس قسم کے کھانے کھائے جاتے ہیں دراصل وہ سب کے سب گھریلو بیبیاں پکایا کرتی تھیں جو خاندان کے سربراہ کو خوش کرنے کیلئے گھنٹوں صرف کرکے پر پیچ قسم کے کھانے تیار کیا کرتی تھیں۔ ہمارے تمام کھانے اس قدر رلے ملے ہیں اور ان کی تیاری پر اتنا وقت صرف ہوتا ہے کہ یہ ایک کارکن ماں پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ کارکن خواتین کو سب سے پہلے کھانے پکانے کی یہ پرانی ریت توڑ کر سادہ اور آسان کھانے بنانے کی طرح ڈالنی چاہیے۔ ہمیں اچھے سستے ریستورانوں کی ضرورت بھی ہے جہاں کارکن خاتون اپنے بچوں اور خاوند کو لے جا کر کھانا بھی کھا سکے اور کچھ وقت تفریح میں بھی گذار لے نہ کہ بھاگم بھاگ گھر پہنچے اور اسے آلو گوشت پکانے کی فکر سر پر سوار ہو۔ میں خصوصاً مردوں کو اپنے گھروں میں زیب و آرائش اور فرنیچر وغیرہ کے سلسلے میں بھی پسند بدلنی چاہیے۔ ہمیں ایسا آرام دہ فرنیچر رکھنا چاہیے جس کی جھاڑ پونچھ پر گھنٹوں صرف نہ ہوں۔ ان کا اتنا قیمتی وقت صرف جھاڑ پونچھ اور فرش کی صفائی پر ضائع کر دینا مجھے سخت ناپسند ہے۔ اس سال گرمیوں

میں میرے بہت سے رشتہ دار میرے پاس ٹھہرنے کے لئے آئے۔ ایسے موقع پر آدمی بہترین سے بہترین کھانا پکاتا ہے چنانچہ پورے دو ماہ میں کوئی لکھائی پڑھائی نہیں کرسکی اور ناپسند ہونے کے باوجود مجھے یہ وقت کھانا پکانے پر صرف کرنا پڑا۔ تخلیق کار عورتوں کو جو ایک اور مصیبت درپیش ہے وہ یہ کہ لوگ انہیں سنجیدہ انداز میں لیتے ہی نہیں۔ اگر آپ شالسٹائی بھی ہوں اور اپنا شاہکار تحریر کررہے ہوں تب بھی اپنے مہمانوں کے لئے کباب اور زولا بنانے کی سماجی ذمہ داری سے بہلوتی نہیں کرسکتیں جبکہ دوسری طرف اگر ایک مرد کو ایک خط بھی لکھنا ہو تو اسے فوری طور سماجی فریضے سے بھی مستثنیٰ کردیا جائے گا۔

میری تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ہاں اب بھی عورتوں کو اولین حیثیت خانساماں اور خاک روبوں کی ہے جبکہ تخلیق کاری ان کا ثانوی وصف ہے۔ چنانچہ ہمیں مردوں کو ایک طرح سے دوبارہ تعلیم دینا ہے کہ وہ گھریلو کاموں میں بیوی کا ہاتھ بٹائیں حصہ دار بنیں، انہیں ان کے حقوق اور کردار سے آگاہ کریں تاکہ وہ ہمیں برابری کا درجہ دیں اس ضمن میں کچھ الزام ہم پر بھی آتا ہے۔ عورت کی حیثیت میں ہم ایک دوسرے کی حمایت نہیں کرتیں۔ ہم صرف اور صرف اسمبلی کی خاتون اُمیدوار کو ووٹ نہیں دیتیں بلکہ ہم خاتون ڈاکٹر پر بھی پورا اعتبار نہیں کرتیں۔ اب بھی ایک مرد ڈاکٹر پر اعتماد کریں گی اپنی زندگی کا بہترین وقت باروچی خانے میں گذارتی ہیں مگر جب کسی بڑی دعوت کا اہتمام کرتی ہیں تو خاتون خانسامہ کی بجائے مرد خانسامے کو بلاتی ہیں۔ دوسروں سے یہ توقع وابستہ کرنے سے پہلے کہ وہ ہماری عزت کریں ہمیں پہلے خود اپنی جنس یا ذات کی عزت کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ مقصد حاصل ہوجائے تو عورتوں کا اپنے کام میں بھی آج کے مقابلے میں زیادہ دل لگے گا اور گھر میں بھی زیادہ لطف رہے گا۔ اور یقیناً اس طرح عورت زیادہ خلاق ہوجائے گی۔ حکومت اگر ریستورانوں، نرسویوں اور دوسری سہولتوں پر روپیہ صرف کرے گی تو کارکن خواتین کی پیداوار میں ڈرامائی اضافہ کے سبب پر خرچہ پورا ہوجائے گا۔ یہ بات بھی مدنظر رہے کہ ملک میں کل کارکنوں میں نصف کے قریب عورتیں ہیں۔ اصل والی بات یہ ہے کہ مرد عورت کی ذہانت اور قابلیت سے خائف ہے جس کا وہ متحمل نہیں ہوسکتا اس لئے کوشش یہ کرتا ہے کہ عورت اس کی ذات کے تابع ہوجائیہ بات نہ ہو تو پھر کیسے سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک ذہین خلاق آدمی اپنے معیار کا جیون ساتھی چننے کی بجائے شادی کیلئے ایک ایسی عورت کا انتخاب کرتا ہے جو عملاً اس کی ملازمہ ہو یا بچے جننے والی شئے اور بس۔

MashalBooks.org

میں نے اپنے ہاں دیکھا ہے کہ جب آدمی یہ سمجھ جاتا ہے کہ اس کی بیوی واقعی اس کی ساتھی ہے تو اسے یہ خوف لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ خاتون جلد ہی ذہانت میں اس سے بلند ہو جائے گی۔ میری متعدد خاتون دوستوں نے جن میں شادی شدہ اور کنواری دونوں شامل ہیں شکائت کی ہے کہ ان کو اپنے مرد ساتھیوں سے ذہانت و دانش میں کم ہی کچھ حاصل ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تمام عورتیں تمام مردوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ کہنا میں یہ چاہتی ہوں کہ عورتوں میں مردوں کے ساتھ مقابلے میں تخلیقی رویے میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم ضرورت یہ ہے کہ یہ عورتیں ایک دوسرے کی زیادہ معاونت کریں۔

''میرے خیال میں تمہیں ثوریہ حافظ سے ضرور ملنا چاہیے'' مقبولہ شالاق نے تان یہاں پر توڑی ''میرے لئے تو وہ ہیروئن ہے۔ خواتین کے حقوق کی وہ بڑی مجاہدہ ہے اس نے عورتوں کی آزادی اور دوسرے حقوق کے حصول کی تمام تلخ اور شیریں جنگوں میں حصہ لیا ہے۔''

ہم ٹیکسی میں سوار ثوریہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے راستے میں مقبولہ نے مجھے اپنی تازہ نظم سنائی جس میں جنوبی لبنان میں عورتوں کے حیران کن کارناموں کا ذکر تھا۔ میں بڑے دھیان سے نظم سن رہی تھی اور داد بھی دے رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ مقبولہ کا چہرہ بدلا وہ بڑی سنجیدہ ہوگئی اس نے اچانک سامنے شیشے میں ڈرائیور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے کہا ''تم ذرا ریڈیو مدھم کرلو اس نے مدھم تو کیا مگر بہت تھوڑا جس سے مقبولہ مطمئن نہیں ہوئی، مقبولا نے پھر کہا ''ہم ایک دوسرے سے باتیں کرنا اور سننا چاہتی ہیں اس لئے ریڈیو اور مدھم کرلو۔ بلکہ مہربانی کر کے اسے کچھ دیر کیلئے بند کر دو'' جیسے ہی وہ ٹیکسی سے اتری اس نے منہ میری طرف پھیر کر کہا ''میں اس سے سخت الفاظ میں بات کرنا چاہتی تھی مگر تمہاری موجودگی میں اس سے تلخ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ جیسے ہی میں نے تمہیں اپنی نظم سنانا شروع کی اس نے ریڈیو کی آواز اونچی کر دی تا کہ ہماری باتیں نہ سن سکے۔ غالباً اسے یہ بات بالکل بے تکی نظر آئی کہ اس کی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی دو عورتیں کھانے پکانے اور صفائی ستھرائی کی بجائے شعر و ادب پر باتیں شروع کر دیں۔ ان مردوں پر مجھے بہت غصہ آتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک عورت کی صلاحیت ان سے زیادہ ہے تو فوراً خفیف اور پریشان ہو جاتے ہیں بلکہ خود کو خطرے میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تم نے تو شیشے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھا میں نے دیکھا تھا اسے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ اس وقت وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ ہم چلی جائیں کسی طرح ابھی غائب ہو جائیں''

دروازہ کھلا تو ایک بزرگ خاتون نظر آئی جو ابھی شب خوابی کے لباس میں تھی۔ثوریا حافظ بڑی پریشان لگتی تھی اور مقبولہ سے کہنے لگی ''ڈیئر میں تو اس ملاقات کو بھول بیٹھی تھی مجھے ٹیلی فون کر کے یاد کروا دیتیں، تم جانتی ہو میں ان دنوں بہت کچھ بھول جاتی ہوں۔''

مقبولہ نے مذاق کرتے ہوئے کہا ''بشینہ تو میری بیٹیوں جیسی ہے، تم جاؤ تیار ہو جاؤ تکلف والی کوئی بات نہیں۔'' میں نے بھی ثوریہ سے کہا کہ ہاں آپ جائیں تیار ہوں پھر مقبولہ مجھے ایک چھوٹے کمرے میں لے گئیں جس میں پرانی طرز کا فرنیچر رکھا تھا پردے کڑھائی والے تھے اور چوبی کرسیوں میں نقش و نگار کھدے تھے۔جو کمرے زیادہ استعمال میں نہ ہوں وہاں خنکی ہوتی ہے جو اس کمرے میں تھی مگر فوراً ہی پیش کی گئی عرب کافی ٹیلی فون کی گھنٹی کے بجنے اور باہر کاروں کے گذرنے کی سائیں سائیں ایسی آواز سے زندگی اس کمرے میں سانس لینے لگی۔

پھر جیسے ہی ثوریہ بڑی بے تکلفی سے کمرے میں آئیں اور آتے ہی مقبولہ سے یوں بات کی جیسے ابھی باتیں کرتی کرتی اُٹھ کر گئی تھیں تو کمرے کی فضا اور بھی خوشگوار ہو گئی۔مقبولہ تم جانتی ہو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک بار پھر زندہ باد اور مردہ باد کے زمانے میں آ گئے ہیں فلاں فلاں زندہ باد فلاں فلاں مردہ باد'' ثوریہ نے مجھے مزیدار کافی کا ایک اور پیالہ دیتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''اس زندہ باد مردہ باد کے بارے میں ایک قصہ ہے جو میں تمہیں ابھی ابھی سنانے لگی ہوں۔''

''انقلاب کے دنوں میں میرا ایک مرد دوست میرے پاس آیا اور کہنے لگا .....''

فرانسیسی ظالموں نے ہمارے جن ساتھیوں کو جزیرہ ارورڈ میں جلاوطن کر رکھا ہے تم ان کی حمایت میں ہونے والے مظاہرے میں شرکت کرو۔ان دنوں قانون یہ تھا کہ کہیں کسی پبلک مقام پر متین سے زائد مرد اکٹھے ہوتے تو گرفتار کر لئے جاتے تھے چنانچہ مرد لوگ ان دنوں احتجاجی مظاہرے نہیں کر سکتے تھے میں نے کہا کہ مظاہرے کا کوئی جواز تو ہونا چاہیے ..... کہنے لگا مجھے بھی علم نہیں تمہیں خود کوئی وجہ ڈھونڈنی ہوگی۔تقریباً چار دن بعد فرانسیسی حکومت نے روٹی کی قیمت میں فی کلو کے حساب سے ایک کریش کا اضافہ کر دیا۔میں نے سوچا کہ حکومت کے خلاف مظاہرے کے لئے یہ بہت بڑی وجہ ہو سکتی ہے میں نے اپنی بھابی اس کی دو بہنوں اور اردنی ہمسائیوں کو بلا کر کہا ''ہم ایک مظاہرہ کرنے والے ہیں۔''

اُنہوں پوچھا وہ کیا ہوتا ہے؟ اور ہمیں اس میں کیا کرنا ہے۔میں نے کہا کہ جب میں کہوں

فلاں فلاں یائش (زندہ باد) تمہیں بھی جواب میں زندہ باد کہنا ہے اور جب میں کہوں فلاں فلاں یاسکوت (مردہ باد)

اس رروز ہم صرف سات عورتیں تھیں جنہیں میں المرجہ (دمشق میں ایک مرکزی علاقہ) کے قریب ایک مارکیٹ میں لے گئی ہم زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ مارکیٹ میں ایک جگہ لکڑی کا خالی ڈبہ پڑا تھا میں اس پر کھڑی ہوگئی اور گذرنے والوں کو زور زور سے کہنے لگی ''فرانسیسی فوج ہر روز ہمیں پامال کرتی ہے روٹی کی قیمت بڑھا دیتی ہے تاکہ ہم بھوکے مرجائیں عرب کس طور بچوں کا پیٹ بھریں گے؟ فرانسیسی فوج نے ہمارے بہترین شہری گرفتار کرلئے ان پر جیلوں میں تشدد کیا جارہا ہے مگر تم (شامی) ابھی تک سوئے ہوئے ہو جاگتے کیوں نہیں؟ جاگو جاگو اپنی عزت کیلئے اپنے حقوق کیلئے اپنے وقار اور مستقبل کیلئے لڑو مردہ باد فرانسیسی فوج، زندہ باد مجاہدین پس دیوار زنداں میں بیس منٹ سے بھی زیادہ عرصہ تقریر کرتی رہی دریں اثنا ہمارے ساتھ کوئی سو عورتیں اکٹھی ہوگئیں چنانچہ میں نے اب مکمل مظاہرے کیلئے سرکاری عمارتوں کی طرف چلنا شروع کردیا۔ شہر کے وسط میں میں نے شامی ہائی کمشنر کی کار دیکھی اور فوراً مظاہرین کو حکم دیا کہ وہ کار روک لیں۔ وہ کار سے باہر آیا پوچھا کیا مسئلہ ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے اپنے آپ پر شرم آنی چاہیے وہ اپنے ہی ملک اور ہم وطنوں کے خلاف دُشمن فرانس کی نوکری کررہا ہے۔ اس نے روٹی کی قیمت میں اضافہ کی بھی منظوری دے دی تاکہ اس ملک کے غریب اور ضرورت مند بھوک سے مرجائیں۔ اس نے مظاہرین سے کہا کہ وہ گھر واپس جائیں روٹی کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ وہ گھر چلا گیا مگر ہم نے مظاہرہ جاری رکھا۔

سرکاری عمارت کے قریب ایک پولیس والا میرے قریب آیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اونچا کیا (میں نے سفید دستانے پہنے ہوئے تھے) اور اونچی آواز میں کہنے لگا۔ ''اس کنجری کو دیکھو، آپ سوچ سکتے ہیں، کہ یہ بھوک سے مرجائے گی؟ امیر کتیا؟ میری بھابی بھاگی بھاگی آئی اور اس نے پولیس والے کو مارنا شروع کردیا جبکہ ..... مظاہرہ کرنے والی عورتیں مجھے ایک قریبی عمارت میں لے گئیں۔ یہ جگہ ہم نے پہلے ہی نظر میں رکھی تھے چھپنے چھپانے کے لیے۔ پولیس نے مجھے پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اگلے روز حکومت نے روٹی کی قیمت میں اضافہ سے متعلق فیصلہ واپس لے لیا اور چند دنوں بعد وہ قیدی بھی رہا کردیئے جن کی رہائی کے لیے ہم نے مظاہرہ کیا تھا دیکھا تم نے کبھی کبھی زندہ باد مردہ باد کہنا بھی بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔

MashalBooks.org

اگر تم زیادہ دلچسپ اور بھرپور قصہ، سننا چاہتی ہو تو میں تمہاری خاطر وہ بھی بیان کروں گی یہ دوسری بات ہے کہ زیادہ بندھی بندھائی کہانیاں مجھے اچھی نہیں لگتیں نہ میں ایسی کہانی بنا سکتی ہوں۔ میں یہ بات فخریہ کہتی ہوں کہ میں امین لطفی الحافظ کی بیٹی ہوں جو شام کی ترکی سے علیحدگی اور خودمختاری سے متعلق سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر 1916ء میں بیروت میں ترکی کے ہائی کمشنر کے ہاتھوں پھانسی چڑھ گئے تھے۔ اس صدی کے پہلے نصف میں وہ شہیدوں کے سب سے پہلے گروپ میں تھے۔ میرے والد کی وفات کے دو سال بعد میری والدہ نے مصطفیٰ الشہابی سے شادی کر لی، مصطفیٰ کے بھائی کو میرے باپ کے ساتھ ہی پھانسی ہوئی تھی میں نے اس ماحول میں پرورش پائی، اہل عرب کے لیے محبت میرے دل میں تھی اور شام کی آزادی کی آرزو میرے خون میں سرائت کر چکی تھی۔

1928ء کے پہلے مظاہرے کے بعد میں اپنے سکول میں بھی سرگرم ہوگئی۔ میں لکھ کر فرانسیسی ڈائریکٹروں اور ان کی پالیسیوں کو چیلنج کیا کرتی تھی۔ فرانسیسیوں نے ہمارے سکول کے پروگراموں میں سے یوم شہدا کا پروگرام ختم کرنے کی کوشش کی کیوں کہ اس دن شہدا کے حوالے سے کانفرنسیں ہوتیں مظاہرے کئے جاتے اور ایسے مواقع پر قومی مسائل بھی زیر بحث کرتے ثوریہ حافظ نے عورتوں کی ایک ادبی تنظیم قائم کر رکھی تھی، یہ تنظیم بھی اسی طور یوم شہدا منایا کرتی تھی۔

''میری زندگی کا ایک مقصد تھا۔ میں اسی سے وابستہ رہی اور یقین کرو یہ مقصد میں نے حاصل کر لیا میرا مقصد یہ تھا کہ میرے ملک میں عورتیں آزاد ہوں اور دوسرے شہریوں کے برابر۔ اب وہ آزاد بھی ہیں آج ہر فیکٹری، ہر سکول، ہر مرکز میں چھوٹے بچوں کے لئے نرسریاں ہیں۔ ہم عورتوں کا روزگار مردوں کے برابر تنخواہ اور مراعات اور برابر کے مواقع کا مطالبہ کرتی تھیں اب عورتوں کو یہ سب کچھ حاصل ہے۔ سچ ہے کہ حاصل حصول بتدریج ہوتا ہے مگر شکر ہے کہ یہ کچھ حاصل تو ہوا۔ عورتوں کو پہلے ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا مگر وہ الیکشن نہیں لڑ سکتی تھیں اور ووٹر بھی وہ ہو سکتی تھی جس نے پرائمری سکول پاس کیا جبکہ مردوں پر یہ شرط لاگو نہیں ہوتی تھی۔ پھر ہم نے الیکشن میں کھڑے ہونے والوں کو بتایا کہ وہ کن شرائط پر ہمارے ووٹ لے سکتے ہیں ہم نے اعلان کیا کہ ہم ایسے امیدواروں کو ووٹ نہیں دیں گے جو غیر ملکی غاصبوں کی کٹھ پتلیاں بنے ہوئے ہیں اور ہم ان کو بھی ووٹ نہیں دیں گے جو عورتوں کے حقوق کی حمایت نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم نے

جن امیدواروں کی حمائت کی اور جن میں قدامت پسند بھی شامل تھے، انہوں نے سرعام اعلان کیا کہ وہ عورتوں کی آزادی کے خلاف نہیں ہیں۔ محض زبانی اعلان کو کافی نہیں سمجھا اس لئے ہم نے ان سے ان کے بیانات پر دستخط بھی حاصل کئے تا کہ جب وہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہو جائیں تو پھر عورتوں کے خلاف کسی بھی مسودہ قانون کی حمایت نہ کر سکیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جب بھی حکومت ہمارے ملک اور عوام کے خلاف کوئی بھی غلیظ کاروائی کرنا چاہتی تو پہلے مذہبی لوگوں کو عورتوں کے خلاف بھڑکاتی پھر ایشوخ (امام اور فاضل مذہبی راہنما) عورتوں کے خلاف مظاہرے کرتے اور گذرنے والی عورتوں پر انڈے، ٹماٹر اور بعض اوقات تیزاب تک پھینک دیتے۔ ان مذموم کارروائیوں کے لئے وہ جو جواز تراشتے وہ انتہائی مضحکہ خیز ہوتے بعض اوقات وہ عورتوں پر اس وجہ سے حملے کرتے کہ کسی عورت نے بال کٹا لئے ہیں، یا اس نے کالی یا نیلی ساکس کی بجائے ہلکے رنگ کی ساکس پہن رکھی ہیں یا یہ کہ وہ سینما دیکھنے گئی تھی۔

1943ء میں ایشوخ اور نقاب پہننے والی منافقت سے سخت بیزار ہوگئی چنانچہ میں نے کوئی ایک سو خواتین کے ساتھ المرجہ میں مظاہرہ کیا جس میں ہم نے سرعام اپنے نقاب اتار دیئے۔ میں نے وہاں تقریر کی اور کہا کہ جس قسم کا نقاب ہم اوڑھتی ہیں اس کا ذکر نہ قرآن حکیم میں ہے نہ ہی پیغمبر محمدؐ نے ایسا کوئی حکم دیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری تاریخ معروف خواتین بھی ہمیشہ سے موجود ہیں، ناولسٹ شاعرہ، قومی ہیروئن اور مجاہدہ..... میں نے خولہ بنت ازوار اور غزالی الحروریہ کی مثالوں سے اپنی تقریر میں وزن ڈالا اور کہا کہ چونکہ ہمارا مذہب اس قسم کے پردے کی اجازت نہیں دیتا اور چاہتا ہے کہ ہم مردوں کے شانہ بشانہ مصروف عمل ہوں اس کے لئے موجودہ حالات میں بے نقاب ہونا لازم ہے اس لئے ہم اب نقاب ہمیشہ کے لئے اتارتی ہیں۔ چنانچہ ایک لمحے میں سو کے قریب عورتوں نے اپنے نقاب اتار دیئے۔ یونیورسٹی کے طلبا اور دوسرے نوجوانوں نے تالیاں بجائیں اور ہماری مکمل حمایت کی جبکہ مذہبی لوگوں نے ہمیں فوری سزائیں دینے کا مطالبہ کر دیا۔ انہوں نے میرا گھر جلانے کی کوشش کی مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن بے شمار نوجوانوں نے بطور رضا کاری بڑی دیر تک میرے گھر پر پہرہ دیا۔ اس کے باوجود یہ لوگ اپنی بائیسکلوں یا کاروں پر گذرتے ہوئے مجھے پر انڈے ٹماٹر حتیٰ کہ پتھر تک پھینکا کرتے تھے لیکن ہم نے اس مظاہرے میں جو طرح ڈال دی تھی اس الٹایا نہیں جا سکتا تھا اور

روز بروز عورتیں پردہ ترک کرتی جاتی تھیں۔''

''کیا 1945ء میں فرانس آزاد ہونے کے بعد شام میں عورتوں کی حالت زار میں ڈرامائی تبدیلی آئی تھی؟''

''نہیں، آزادی کے فوراً بعد معاملات جوں کے توں رہے اور پھر ان میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنے لگی مثلاً 1958ء میں ہمارا اتحاد مصر سے ہوا اس سے پہلے ہماری پارلیمان میں کوئی خاتون رکن نہیں تھی۔ اور پھر یہ بات بھی تھی کہ ان عورتوں کو نامزد کیا جاتا تھا جو ان عورتوں میں سے نہیں تھیں جو اکثریتی ووٹ حاصل کر کے پارلیمنٹ میں آتی ہیں۔ میں نے دو بار اتنے ووٹ حاصل کئے جتنے دوسری جیتنے والے امیدواروں نے مگر مجھے پھر بھی ممبر پارلیمان نامزد نہیں کیا گیا۔ اس وقت کے وزیر اعظم نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ میری آواز بہت بلند تھی۔ کس قدر صحیح بات کی تھی اس نے! میری آواز ہمیشہ ہی بلند رہی ہے خصوصاً بری باتوں کی مذمت کے وقت یہ آواز اور اونچی ہو جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اپنا مافی الضمیر بلند آواز میں بیان کرتی ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت میری اس آواز کو دبا نہیں سکتی۔

''مجھے اپنے صدر حافظ اسد سے انس ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم عورتیں خوش قسمت ہیں جنہیں ایسا صدر ملا ہے۔ حافظ اسد نے شام کی تاریخ میں پہلی بار عورتوں کو مردوں کی برابری دلانے کے لئے زبردست موقع فراہم کیا۔ اب ایک خاتون وزیر ہے۔ پارلیمان میں تیرہ خاتون ارکان ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں اور پولی ٹیکنیک اداروں میں عورتیں بھری پڑی ہیں۔ پہلے ہماری صرف ایک یونیورسٹی تھی اب پانچ ہیں۔ پہلے دمشق میں ایک یونیورسٹی کے سبب ملک کے باقی علاقے رشک بلکہ حسد کرتے تھے مگر اب سارے ملک کو طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ ان دنوں میرا باہر آنا جانا زیادہ نہیں لیکن جن لوگوں سے مجھے واسطہ پڑتا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں کے برابر گئی ہیں اور جن مردوں کو میں جانتی ہوں وہ بھی برابری کی سطح پر چل رہے ہیں۔ تاہم اب بھی کچھ مرد ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عورت مرد کے مقابلے میں کمزور درجے کی مخلوق ہے مگر یقیناً ایسے مرد اب اقلیت میں رہ گئے ہیں۔ میرے خیال میں اب شام میں عورتوں کے خلاف کوئی امتیاز کوئی تعصب نہیں رہا۔ ہر شعبہ میں ہماری تنخواہیں برابر ہیں، ہمیں برابر مواقع ملتے ہیں۔ اور ہمارے حقوق برابر ہیں۔ ان پیراشوٹسٹ، فوجی افسر، وکیل، ڈاکٹر اور انجینئر خواتین پر نگاہ ڈالیں، جہاں جہاں عورتیں جانا پسند کرتی ہیں وہاں وہاں عورتیں موجود ہیں۔

میں نے کبھی خواب میں نہیں سوچا تھا کہ میں یہ خوشگوار صورت اپنی زندگی میں دیکھ سکوں گی۔''

''آپ کا خیال ہے کہ اب شام کی عورتوں کو مزید کوئی جنگ لڑنے کی ضرورت نہیں؟''

جس طرح حکومت نے مذہبی فرقہ پرستی اور تنگ نظر علاقائیت پسندی کا مقابلہ موثر طریقہ سے کیا اسی طرح عورتوں کو اپنی کارکردگی کے ذریعے مردوں کی رجعت پسندانہ اور بیمار حیثیت کے خلاف لڑنا ہے۔ وویمنز یونین نے ایسی پالیسیاں اختیار کیں اور ان پر عمل کیا جنھوں نے عورتوں کو قومی سطح پر اپنی اہمیت اور حیثیت کا سکہ ثبت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس ضمن میں ذاتی پیش قدمی کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے لسانی طریق کار اور سوچ پر مکمل اعتماد کرنا ہوگا۔ مگر جیسے ہی ہم اپنے آپ پر اعتماد کرنا شروع کریں لوگ ہم پر اعتماد کرنا شروع کر دیتے ہیں (ایک مرتبہ میں نے توہمات کے بارے میں لیکچر دیا) اور اس میں قرآن کی آیات اور پیغمبر اسلام محمدؐ کی احادیث بھی پیش کیں تو ایک روشن خیال شیخ نے ٹیلی فون پر اس شاندار لیکچر پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اس نوعیت کے اور لیکچر بھی دوں۔ میں نے کہا کہ شکریہ ادا کرنے کی بجائے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو بھی مساجد میں ایسے ہی لیکچر دینے چاہئیں۔ وہ دن بعد اس نے مجھے فون کیا کہ میں ریڈیو پر اگلے جمعہ کا خطبہ ضرور سنوں۔ میں نے کبھی ایسے خطبے نہیں سنے مگر اس جمعے کو میں نے توہمات اور کالے جادو کے خلاف زبردست خطبہ سنا۔ خطبہ میں جو کچھ کہا گیا اس سے ہمارے دل پسیج گئے اور میری اور میری شوہر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سو دیکھا تم نے اگر ہم میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی جرات ہے تو مرد ہم سے سیکھ سکتے ہیں اور ہماری پیروی بھی کر سکتے ہیں۔''

میں نے اس خیال سے کہ پھر گرما گرم بحث نہ چھڑ جائے بڑی نرمی اور سکون سے کہا'' مجھے لگتا ہے کہ آپ شامی عورت کے حالات سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ انہیں جیسا آپ اپنی خیالی دنیا میں سمجھتی ہیں وہ اتنی خوش اور مطمئن نہیں ہیں۔ مجھے بعض عورتوں کے ہولناک تجربات کے قصے سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان میں سے اچھی خاصی تعداد ایسی عورتوں کی ہے کہ اگر انہیں طلاق دے دی جائے اور بچے بھی ان کے پاس رہنے دیئے جائیں تو وہ زندگی بھر اپنے خاوندوں کی شکل بھی نہیں دیکھیں گی۔ یہ عورتیں محض اس لئے اپنے خاوندوں کے پاس رہ رہی ہیں کہ اگر وہ طلاق لے لیں تو وہ خاوندوں سے کسی قسم کا خرچہ لینے کی مجاز نہیں ہوتیں۔ اکثر عورتیں محض اپنے بچوں کی خاطر جہنم ایسی زندگی گذار رہی ہیں۔

ثوریہ یہ باتیں سن کر مبہوت رہ گئیں اور کہنے لگیں ''وہ طلاق کیوں نہیں لے لیتیں۔ ہمارا قانون عورت کو طلاق دینے کا حق تو دیتا ہے مگر ایک بار جب اس کا نکاح ہو رہا ہوتا ہے اس وقت نکاح نامہ میں طلاق کا حق شامل ہوسکتا ہے۔''

''مگر ہمارے ملک میں 99 فی صد عورتیں اس حق کے بارے میں جانتی ہی نہیں۔ جب 1981ء میں میری شادی ہوئی تو میں بھی اس حق سے بے خبر تھی۔''

''خیر یہ باتیں انہیں سکولوں میں یونیورسٹیوں میں بتائی جائیں، تمام لیکچروں میں بھی ان کا ذکر کرنا چاہئے۔'' کہنے لگیں ''میرا خیال ہے کہ ہمارا قانون عورتوں کے بارے میں منصفانہ ہے۔ یہ عورتوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ لڑکی کو نو سال اور لڑکے کو سات سال کی عمر تک اپنے پاس رکھ سکے۔ عمر کے اس حصے میں بچوں کو قابو کرنا مشکل ہوتا ہے شاید اس مرحلہ پر مرد ہی یہ کام کرسکتا ہے۔''

گفتگو درمیان میں تھی کہ اسی عرصے میں ثوریہ کی ایک وکیل دوست آ گئی اور اس نے خاموشی سے ہماری باتیں سننا شروع کر دیں، میں نے کوشش کی کہ وہ بھی بات چیت میں حصہ لے مگر وہ خاموش سنتی رہی اب جب ہم اسی کے شعبے سے متعلق باتیں کر رہے تھے تو اس نے دو ایک واضح باتیں کرنے کا فیصلہ کر لیا انتہائی نرم اور مہذب آواز میں کہنے لگی۔ ''عورتوں کے لئے ایک اور بڑی مشکل ہے مردوں کو اپنے بیوی بچوں کے لئے معقول وسائل فراہم کرنے کے بعد ملک سے باہر جانے کی اجازت دی جانی چاہیے آج کل انہیں یہ شرط پوری کئے بغیر جانے اور غیر معینہ مدت تک باہر رہنے کی اجازت ہے ان میں سے کچھ یورپ چلے جاتے ہیں یورپی عورتوں سے شادیاں کر لیتے اور کبھی نہیں لوٹتے۔ لبنان میں بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ خاوند کا پاسپورٹ اس وقت تک اس کے قبضے میں رہتا ہے جب تک وہ اپنی غیر حاضری کی مدت کے دوران بیوی بچوں کے نان نفقے کا معقول بندوبست نہیں کرتا۔ ضرورت یہ ہے کہ شام میں بھی ایک ایسا ہی قانون بنایا اور اس پر عمل کیا جائے۔ قانونی شعبہ میں اور کمی بھی ہے اور یہ تعزیری سلسلہ کی کڑی ہے۔ حرام کاری کی صورت میں عورت کو سزا دی جاتی ہے بعض اوقات اسے موت تک کی سزا دے دی جاتی ہے مگر مرد صاف بچ جاتا ہے، قرآن کہتا ہے کہ جس عورت اور مرد نے حرام کاری کی ان دونوں کو سرعام ستر ستر کوڑے مارے جائیں۔ لیکن سارے ہی عرب ممالک میں یہ ہوتا ہے یہ جانے بغیر کہ اس حرام کاری میں عورت کا کون مرد شریک کار تھا، عورت کو مار دیا جاتا ہے۔ شام

میں یہ واحد تعزیری قانون ہے جو عورتوں کے خلاف ہے اور اب ویمنز یونین اسے تبدیل کرانے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ اگر ایشوخ قرآن کو صحیح طور سے سمجھیں اور اس کے احکامات کے اسی طور نفاذ کریں تو پھر شام میں کوئی ایسا مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔''

''آپ صحیح کہتی ہیں''، میں نے کہا۔ اگرچہ قرآن میں بعض ایسی آیات ہیں جن کے مطابق بعض معاملات میں عورتوں کو مردوں کے برابر نہیں سمجھا گیا مگر قرآن اور اسلامی فقہ میں عورت کے لئے جو مقام تجویز کیا گیا ہے وہ اکثر عرب ممالک میں خواتین سے متعلق رائج قوانین اور اصول و رواج کے معاملے میں بہت ہی بہتر ہے۔ تمام عرب ممالک میں ظاہراً شریعت رائج ہے مگر خواتین کے بارے میں جتنے قوانین ہیں ان عورتوں کے خلاف مردانہ تعصب کی تفسیر اور تعبیر زیادہ ہے۔ بہر طور اگلا سوال میں نے ثوریہ حافظ سے پوچھا کہ عورتوں کے حوالے سے اخوان المسلمین کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟''

''اخوان المسلمین مذہبی جماعت نہیں رجعت پسند سیاسی جماعت ہے۔ درحقیقت یہ خود اسلام کے خلاف ہے۔ اس نے وہ کچھ کرنے کی کوشش کی جو فرانسیسی سامراج نہیں کر سکا تھا۔ فرانسیسی قبضہ کے دنوں میں رجعت پسند ان عورتوں کے خلاف تھے جنہوں نے بال ترشوائے، چہرے پر باریک نقاب ڈالا اور پیلی ساکس پہنیں، وہ چاہتے تھے کہ عورتیں الازار پہنیں (سخت پردہ کریں) اب بھی بہت سی عرب عورتیں الازار پہنتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ اخوان المسلمین والے چاہتے تھے کہ عورتوں کو ان تمام صفات سے محروم کر دیا جائے جس کی بنا پر وہ انسان کہلاتی ہیں اور انہیں ماؤف دل و دماغ والی گڑیا یا خادمائیں بنا دیا جائے۔

اخوان المسلمین یا دنیا کی کوئی طاقت عورت کو کسی ایسی چیز سے محروم نہیں کر سکتی جس سے عورتیں خود ہی محروم نہ ہونا چاہیں۔ مجھے صرف دو ہم خیال عورتیں دے دیں پل جھپکنے میں وہ دو سے چار ہو جائیں گی اور چار سے آٹھ اور پھر سو.....

MashalBooks.org

لبنان: برسرِ پیکار عورتیں

لبنان نے گذشتہ دس برس میں اسرائیلی جارحیت سے بے شمار زخم کھائے ہیں وہ سب سے چھوٹا عرب ملک ہے اور طرح طرح سے منقسم بھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانس نے اپنی تحویل میں رکھتے ہوئے لبنان کو شام سے علیحدہ کر دیا اس میں اپنا نظم ونسق قائم کیا، فرانسیسی زبان کے ذریعے تعلیمی نظام رائج کیا اور 1946ء میں ایک آزاد لبنان کا آئین وضع کیا جس میں اہم سرکاری عہدے ماروفی عیسائیوں کو دیئے گئے۔ اگرچہ عیسائیوں کی اکثریت کی بنیاد پچاس سال پہلے کی مردم شماری پر مبنی ہے اس کے باوجود 46 سے اب تک عیسائی ہی حکمران ہیں۔ شیعہ مسلمان اگرچہ غریب ہیں مگر سب سے بڑا طبقہ یا کمیونٹی ہیں۔ دوسرے تمام عرب ممالک میں سنی مسلمان ہی اکثریت میں ہیں مگر لبنان میں دروزوں کی طرح سنی اقلیت میں ہیں دروز مسلمانوں کا تیسرا فرقہ ہے۔ موخر الذکر دونوں کا لبنان میں قیام کے دوران پی ایل او سے بڑا قریبی تعلق تھا۔ دوسری طرف فلسطینیوں اور اسرائیل کی جنگ میں سب سے زیادہ نقصان شیعہ فرقے کو پہنچا اور پھر شیعہ فرقہ کو بچانے کے لئے ''امل'' نام کی فوجی اور سیاسی تنظیم ابھری۔ 1981ء کی اسرائیلی یلغار کے بعد جہاد اور حزب اللہ کے نام سے دو اور مزاحمتی گروپ بھی ایران کی مدد سے سامنے آئے۔ 1982ء میں ماروفی عیسائیوں نے اسرائیلی حملے میں اسرائیل کی فوج کی حمایت کی تھی جبکہ امل اور دوسرے مسلم گروپوں نے اسرائیل کو غیر ملکی غاصب قوت سمجھتے ہوئے اس کے خلاف لڑائی کی تھی۔

جنگ سے پہلے لبنان کثیر الثقافتی اور کاسمو پالیٹن ملک بن گیا تھا، عورتیں بڑی حد تک آزادی حاصل کر چکی تھیں اور لبنان واحد عرب ملک تھا جس میں خواتین کی اپنی ایسی تنظیمیں تھیں جن کا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر جنگ شروع ہوگئی جس کا سب سے پہلا نشانہ عورتیں اور بچے بنے۔ صرف جنوبی لبنان میں جتنی عورتیں اور بچے مرے ہیں ان کی تعداد کل مرنے والے اتنے ہی مردوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ یہاں جنگ، اس کے خلاف مزاحمت اور آزادی، سب عورتوں کے بھی مسئلے ہیں۔ یہ عورتیں ہی تھیں جنہوں نے جنوبی لبنان کے جنگی علاقوں سے نکلنے سے انکار کر دیا، ان کے اس فیصلے کے باعث یہاں مزاحمتی تحریک شروع ہوئی جس نے 1985ء میں اسرائیل کو یہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔

MashalBooks.org

اس باب میں ان عورتوں کے قصے ہیں جو جنگ آزما بھی ہیں، جن کی زندگیاں ایک طرح کا المیہ ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدوجہد سے بھی مضبوط پیمان وفا باندھ رکھا ہے۔ اوران کی آوازیں ماؤں، بہنواور بیویوں کی آواز کے ساتھ دیوقامت جنگ جوعورتوں کی آوازیں بھی ہیں۔

عرب ممالک میں سفر میں زنانہ مردانہ کی تفریق اب بھی ہے۔ پانچ سیٹوں والی ٹیکسی میں میں نے بیروت تک کا سفر کیا اس کا ڈرائیور خواتین کی واجب عزت کرتا تھا۔ اس لئے انہیں پچھلی سیٹ میں ٹھونس ٹھونس کر بٹھایا تھا۔ اس نے میرے ساتھی کو اپنے ساتھ والی اگلی نشست پر بٹھایا اور مجھے پچھلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا جگہ نہیں ہے ڈرائیور سے کہا ''جگہ نہیں ہے''

''نہیں نہیں بڑی جگہ ہے'' عورتوں میں سے ایک نے کہا جس کے دولڑکے اس کے گھٹنوں پر بیٹھے تھے اور تیسرا اس کی گود میں تھا۔ اس نے بچوں کے پیچھے سے گردن گھما کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی اور دونوں بچوں کو کھینچ کر تیسرے والے کے قریب کیا جواب اس کی گردن پر چڑھ کر اس کی سانس میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں روٹی تھی جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں گھٹیا قسم کی مٹھائی۔ تیسرا ماں کی چھاتی چوسنے پر شاکر تھا اور کبھی کبھی اردگرد والوں پر کافی نظر ڈال لیتا تھا۔ ماں نے پہلے بچے کا منہ صاف کیا اور دوسرے ہاتھ اور تیسرے کا گال سہلایا جس سے مقصود یہ دکھانا تھا کہ وہ میرے لئے جگہ بنا رہی ہے۔

جگہ بن گئی میں بیٹھ گئی اور راستے میں پتہ چلا کہ تینوں بچے جن کی عمریں ایک اور چار سال کے درمیان تھیں تین ماہ بعد ایک اور بھائی کا استقبال کریں گے۔ یہ خاتون بچوں کو اللہ کی دین سمجھتی تھی اس کا شوہر ایک چھاپے خانے میں کلرک تھا، آمدنی کم تھی مگر خدا پر بھروسہ تھا کہ وہ انہیں بھوکا نہیں مرنے دے گا اور یہ کہ بچے بھی اللہ کی امان میں ہیں۔ میری باتوں سے اس عورت نے یہ سمجھا کہ میں ملحد یا خدا کے وجود سے انکاری ہوں اس نے مجھے اسلام پر لیکچر بھی دینا شروع کر دیا۔ دریں اثنا ڈرائیور نے لبنان میں خونی جنگ کی تباہ کاریوں کی طرف اشارہ کیا۔ اچانک میرے دوست نے خوفزدہ ہو کر چیختے ہوئے کہا ''دیکھو دیکھو دیکھو، کوئی سوچ سکتا ہے کہ کبھی یہ خوبصورت پہاڑ ہوا کرتے تھے۔ میں نے سڑک کے دونوں کناروں پر گھر دیکھے یہ اجاڑ پڑے تھے یا جل گئے تھے یا گرا دیئے گئے تھے۔ پندرہ منٹ کے بعد ہم ایک اداس قصبے میں داخل

ہوئے جس پر جنگی تباہ کاریوں کے آثار بہت نمایاں تھے۔

میرے ساتھی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''یہ برج البراجنہ ہے پھر ایک بارونق مصروف گلی میں سے گذر رہے تھے جو سنڈے مارکیٹ کی طرح لگتی تھی جس میں لوگ ہر قسم کا سامان سبزیوں سے لے کر بستروں کی چادریں تک خریدتے اور بیچتے ہیں۔ ہم کار سے اترے اور ایک ریستوران میں جا بیٹھے جہاں شوارما سینڈوچ ملتے ہیں جہاں اردگرد بیٹھے لوگ مجھے بڑے تجسس سے دیکھتے تھے۔ ایسی عام جگہوں پر عموماً عورتیں نہیں آتیں۔ تاہم غیر ملکیوں کے بارے میں تھوڑی سی رعائت تو ہوتی ہے۔ مجھے بھی بڑی بھوک لگی تھی اس لئے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ چند منٹوں میں بھی شوارما سینڈوچ چیر پھاڑ کر کھا گئی اور ادھ رڑکا ٹھنڈا گلاس پیا۔

پھر ہم نے تنگ اور گندی گلیوں میں چلنا شروع کیا جو اس بات کی غماز تھیں کہ اردگرد بڑی غربت اور لمبی محرومیاں ہیں۔ ان گلی کوچوں کے عین درمیان ایک عام سی چھوٹی اور پرانی عمارت کھڑی تھی بتایا گیا کہ یہاں عمل کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اگر اس جگہ پر عمل کا ہیڈ کوارٹر ہے تو مطلب یہ ہوا کہ قیادت اپنے ارکان کی اکثریت کے حالات زندگی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس مرکز میں داخل ہوتے ہی ایک درمیانے درجے کے گھریلو سے ماحول کا احساس ہوتا ہے۔ میں انفرمیشن ڈیسک پر گئی وہاں پر لیٹے شخص سے کہا کہ میں کسی ایسی خاتون کا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں جو عمل کی کارکن ہو۔ وہ اٹھا اور سیڑھی کے راستے اوپر گیا۔ یہ دس منٹ بعد سبز اسلامی (الشرعی) اور اسی رنگ کے سکارف میں ملبوس آنکھوں والی ایک خاتون سیڑھی سے نیچے اتری۔ اس کے پر اعتماد قدموں اور آنکھوں کی چمک سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اسے سیاسی عورت کی حیثیت سے اپنے مقام و مرتبہ کی پوری پوری خبر ہے۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا ''یہاں کیوں کھڑی ہیں پلیز اوپر آئیں ناں، اور پھر مجھے راستہ بتاتے ہوئے تیزی سے سیڑھی کی طرف مڑی۔

ہم نے لبنان اور شام، جنگ اور اسلام کے بارے میں باتیں شروع کیں۔ میں اپنے وقت کو بہت احتیاط اور موثر انداز میں استعمال کرنا چاہتی تھی اس لئے زینب (یہ اس کا نام تھا) کو اپنے سفر اور ملاقات کی وجہ بتائی اور کتاب کی نوعیت بھی۔ میں نے اس سے یہ خواہش بھی کہ وہ بتائے کہ عمل کی سیاسی تحریک کی رکن کیسے بن گئی۔

بڑے دوستانہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے داستان شروع کی: ''میرا

محنت کش خاندان سے تعلق ہے ہم ایک قدامت پسند علاقے اور معاشرے میں رہتے ہیں اور میرا خاندان کوئی اس سے الگ نہیں ہے۔ میرے والدین نے ہم پانچ بہنوں اور ایک بھائی پر بھی اسی قسم کی زندگی نافذ کرنا چاہی جیسی انہوں نے گذاری تھی میرے والد اپنے خاندان کے زیر اثر تھے مگر ماں بڑے کھلے ذہن کی تھیں خصوصاً ہماری تعلیم کے بارے میں انہوں نے ہم سب کو سکول بھیجا۔ میں اور میری بڑی بہن نے ثانوی تعلیم مکمل کر لی مگر ہماری چھوٹی بہنیں صرف پرائمری پاس کر سکیں۔ 1978ء میں ملازمت کی خاطر میں نے ٹائپنگ سیکھ لی تب میں الشرعی الباس نہیں پہنا کرتی تھی 1979ء میں مجھے ثانوی تعلیم کا سرٹیفکیٹ ملا تب سے میں یہاں کام کر رہی ہوں۔''

تم نے الشرعی پہننے کا فیصلہ کب کیا؟

میرے والدین نے کبھی نماز پڑھنے کے بارے میں سختی نہیں کی مگر سر ڈھانپنے اور اشارب (سر کو ڈھانپنے کا کپڑا جس کی ڈوری ٹھوڑی کے نیچے باندھ لی جاتی ہے) پہننے پر سختی کی ہے۔ یعنی یہ مذہبی معاملہ نہیں بلکہ سماجی عادت تھی۔ میں ان سے بحث کیا کرتی تھی کہ اگر آپ مجھے صحیح مسلمان بنانا چاہتی ہیں تو پھر نماز پر سختی کیا کریں نہ کہ صرف سر ڈھانپنے پر۔ دوسرے اکثر لوگوں کی طرح وہ بھی قدامت پسند تھے لیکن اسلام کو نہیں سمجھتے تھے۔ پھر میں نے اپنی پسند الشرعی پہننا شروع کر دی۔ میں سکول میں تھی تب عمل کی خواتین کے بارے میں جاننا شروع کیا، مجھے وہ اچھی لگیں اور میں نے دیکھا کہ انہوں نے جو لباس پہن رکھا ہے وہ ہر شعبہ کی کارکن خاتون کے لئے بہت ہی مناسب تھا۔ ''آپ دیکھ رہی ہیں یہ بڑا آرام دہ سمارٹ اور حسب حال ہے۔ اسی لئے عمل میں شامل تمام عورتیں یہی لباس پہنتی ہیں۔ میں عمل میں آنے سے پہلے جو لباس پہنا کرتی تھی اور اب جو لباس پہنتی ہوں ان کا تقابل کرنے پر مجھے لگتا ہے کہ یہ لباس بہت بہتر ہے۔ کم از کم اس کی ایک خوبی تو ہے کہ یہ چلنے پھرنے میں ذرا رکاوٹ نہیں ڈالتا اور اس طور پر ذہن کو بے فکر رکھتا ہے۔ میں سیڑھیاں چڑھتی ہوں کار میں بیٹھتی ہوں، جلسوں میں شرکت کرتی ہوں اس دوران مجھے اٹھنے بیٹھنے میں اپنے لباس کی فکر نہیں ہوتی۔ ایک اور بات بھی ہے کہ اب مرد لوگ گلیوں میں نہ میرا پیچھا کرتے ہیں نہ فحش جملہ بازی اور نہ ہی غلیظ قسم کے مذاق کرتے ہیں۔ تمام عرب مرد ان عورتوں کی عزت کرتے ہیں جو الشرعی پہنتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مجھے احساس ہے کہ اس لباس نے میرے کردار کو مضبوط کیا ہے اور میری آزادی کو مستحکم کیا ہے۔''

''امل ایسی سیاسی تحریک میں شمولیت میں تمہارے والدین کا ردعمل کیا تھا؟''

MashalBooks.org

شروع میں تو میں نے انہیں بتایا ہی نہیں۔ انہیں بتائے بغیر میں دو سال تک تحریک میں کام کرتی رہی۔ شروع میں تو میرے تحریک میں شامل ہونے کے خیال پر بہت خوفزدہ ہوئے مگر جنگ کے دوران ان کی قلب ماہیت بھی ہوگئی۔ انہیں صرف ہماری یعنی اپنے خاندان کی فکر تھی انہیں لبنان کے مسلمانوں کو درپیش معاملات کی خبر ہی نہیں تھی۔ میں اولاً لبنان کی شہری ہوں اس لئے بطور مسلم یا عیسائی بات کرنا میرے لئے قابل نفرت ہے مگر ہمیں اس انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اب میرے والدین اس ملک اور اسکے مسائل کے بارے میں باخبر ہیں اور وہ عمل کے قومی کردار کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ جنگ کے دوران عمل نے متاثرین کو خوراک اور رہائش کی سہولتیں فراہم کیں اور انہیں تحفظ بھی فراہم کیا۔ شیعہ آبادی پچاس فی صد سے زائد ہے مگر انہیں کوئی خاص حقوق ہی حاصل نہیں۔ اب تک اس ملک نے ہمیں نظر انداز کیا ہے مگر اب اگر کوئی حکومت قائم رہنا چاہتی ہے تو اسی صورت میں کہ ہمیں ہمارے حقوق دینا ہوں گے۔ اگر ہمیں حکومت میں نصف حصہ نہیں ملتا تو کم از کم ہمیں فیصلے کرنے اور ان پر عملدرآمد کے سلسلے میں شریک تو کیا جائے۔ دلچسپ بات ہے کہ پہلے میرے والد گھر میں حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے مگر اب خاندان کے بارے میں مجھ سے پہلے مشورہ کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے بعض اوقات مجھے کام میں رات کے گیارہ بج جاتے ہیں جب میں واپس آتی ہوں تو مجھے اس وقت کھانا دیا جاتا ہے اور کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوتی کیونکہ انہیں یہ خبر ہے کہ میں کہیں کام میں مصروف ہوں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ انہیں مجھ پر مکمل اعتماد ہے۔ عمل میں شامل خواتین نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ملکی امور میں ایک ذمہ دارانہ کردار ادا کر سکتی ہیں اور اکثریت اس بات کو تسلیم بھی کرتی ہے۔

''آپ کے خیال میں کیا یہ تبدیلی اس لئے آئی ہے کہ کہیں قانون میں تبدیلی کی گئی ہے یا عملاً کسی سماجی تبدیلی کے نتیجے میں یہ صورت پیدا ہوئی ہے؟''

''نہیں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا، دراصل لبنان کا قانون خاصا جمہوری ہے۔ ہماری آزادی میں کوئی قانون رکاوٹ نہیں بنا۔ اصل رکاوٹ مجموعی طور پر خاندان اور معاشرے کا رویہ تھا۔ اب چونکہ یہ تبدیل ہو رہا ہے اس لئے میرے خیال میں اب کوئی مشکل باقی نہیں رہے گی۔''

''کیا عمل میں آپ کی سیاسی جدوجہد میں عورتوں کے حقوق اور آزادی سے متعلق عناصر بھی شامل ہیں؟''

میرا یہ خیال ہے کہ اس وقت میرا جو کردار ہے یہ اس تحریک میں ہی بنا ہے۔ اب میں

تحریک میں شامل ان عورتوں کو لیکچر دیتی ہوں جو مجھ سے یہ سوال کرتی ہیں کہ ہمیں اسلحہ کی تربیت کیوں نہیں دی جاتی ۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ ہمارا اسلحہ ہمارے افکار اور ہمارے الفاظ ہیں۔ ہتھیار اُٹھانے سے پہلے ہمیں یہ پتہ ہونا چاہیئے کہ ہم کہاں پر کھڑی ہیں اور کیوں کھڑی ہیں۔ اگر ہمیں ہتھیار اٹھانے پڑ بھی گئے تو ہم ہتھیار بھی اُٹھالیں گی لیکن ہمارا بنیادی کردار سماجی اور تعلیمی ہے۔ جب ہمارے مرد میدان جنگ میں تھے ہم اپنے ہمسائیوں اور مختلف گھرانوں کو صورت حال سے باخبر کررہے تھے۔ ہم نے انہیں سکھایا کہ کس طرح سنگین صورت حال کا سامنا کرنا چاہیے۔ ہم نے انہیں مختلف سروسز فراہم کیں، مختلف قسم کی تربیت دی کہ گاؤں کو جنگی صورت حال سے کس طور نمٹنا چاہیے۔ ہم نے انہیں مذہبی تعلیم بھی دی اور یہ بھی بتایا کہ اسلام میں عورت کا کیا مقام ہے چنانچہ میں کہہ سکتی ہوں کہ یہاں ایک جامع تعلیمی تحریک چل رہی ہے جس کے ذریعے معاشرے میں عورتوں کی موجودہ صورت حال میں بنیادی اصلاح ہورہی ہے۔ عمل میں یہ عورت کا تو کردار ہی نیا جنم لے رہا ہے۔ میرے خیال میں عمل کے وجود میں آنے سے پہلے عورتوں کی جو حالت تھی اب لبنان کی عورتیں کسی بھی صورت ادھر مراجعت نہیں کریں گی۔

ساری تاریخ اسلام میں عورتیں بڑی جنگ جو، بہادر اور عسکری راہ نما رہی ہیں۔ بعض جنگوں میں تو مرد محض اس لئے اپنا سر منڈوالیا کرتے تھے تاکہ جنگ میں شامل خواتین سے الگ پہچانے جائیں ۔ ایک جنگ میں مسلمانوں کے پاس ضروری سامان کی کمی تھی چنانچہ عورتیں گھوڑوں پر سوار ہوکر اس طور گرد اڑاتی آئیں کہ دُشمن کو یقین ہوجاتا کہ مسلمانوں کے پاس سپلائی کی کمی نہیں ہے۔ خود پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ بہادر اور قابل اعتماد قرار پائی تھیں۔ اور ہم اگر صحیح مسلمان بننے کی خواہش رکھتے ہیں تو پھر ہمیں ان بزرگوں کی تقلید کرنی چاہیے نہ عمل میں شیعہ خواتین کی سربراہ صبح کو آتی ہیں اور شام گئے تک گھر نہیں جاتیں۔ انہیں ہر روز اجلاس میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ لیکچر دینے پڑتے ہیں اور دوسری خدمات سرانجام دینا ہوتی ہیں۔ میں نے ایک بار پوچھا کہ یہ گھر کیسے چلاتی ہیں تو مجھے بتایا گیا کہ ان کا خاوند کھانا پکاتا ہے گھر کی صفائی ستھرائی کرتا ہے اور چھ بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ وہ خود عمل کارکن ہے اس لئے اپنی بچوں کے کام کی پیچیدہ نوعیت کو سمجھتا ہے۔ عمل میں یہ عام بات ہے کہ مرد عمل میں شامل ایسی خواتین سے شادی کرتے ہیں جو اپنا تمام وقت تحریک کیلئے وقف کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور آئندہ ایک سو سال تک نہیں سوچ سکتے تھے کہ

ہمارے مرد عورت کے اس مرتبہ اور مقام کو سمجھ سکیں گے اور تسلیم کریں گے اور یہ آپ دیکھ بھی سکتی ہیں۔

مسز فاطمہ فواز جنوبی ویمینز ہاؤس سوسائٹی کی نائب سربراہ ہے وہ ان چند ذہین عورتوں میں سے ہے جو جانتی ہیں کہ سماجی بہبود کا جو کام وہ کر رہی ہیں اس کی نشر واشاعت کے لیے اخبار کا کردار کتنا اہم ہے۔ چنانچہ وہ جب بھی کچھ کرتی ہے اس کی اخباروں میں اشاعت پر بھی خاص توجہ دیتی۔ مغربی بیروت میں میں جن لبنانی خواتین سے ملی ہوں ان میں سے مسز فواز زیادہ مغربی رنگ میں رنگی ہوئی اور فیشنی خاتون ہے نوجوان ہے اور دو بچوں کی ماں۔ اگرچہ عمل کی رکن ہے (اور ایک اہم رکن ہے) مگر نہ تو وہ الشرعی پہنتی ہے اور نہ الحجاب۔ فلیٹ میں خاصا ساز و سامان تھا اور وہ مجھے یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ اس کے پاس تازہ ترین آلات بھی ہیں۔ میں نے پہلی بار اسی کے فلیٹ میں بے تار ٹیلی فون دیکھا وہ بات کرنے کے لیے حال کی طرف آتی تھی اس کے ہاتھ میں بغیر تار کے ریسور تھا جس پر وہ باتیں کر رہی تھی۔ وہ بڑی محبت والی اور دوستدار خاتون تھی۔ زینب اور میں شام کے چھ بجے کے قریب اس کے فلیٹ پر پہنچی تھیں ہمیں بتایا گیا کہ آٹھ بجے کے قریب اس کے کچھ ملاقاتی آ رہے ہیں اس لئے بہتر ہوگا کہ ہم فوراً اس کا انٹرویو شروع کر دیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ہمارے انٹرویو شروع کرنے سے پہلے ہی کچھ غیر متوقع مہمان آ گئے اور ہمیں اس کے بیڈ روم میں جا کر اس سے مختصر گفتگو کرنا پڑی۔ اس نے بتایا کہ جنوبی ویمنز ہاؤس سوسائٹی جنوبی لبنان کی ایسی خواتین کی تنظیم ہے جو اسرائیل کے مقبوضہ جنوبی لبنان میں خدمات سرانجام دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ تنظیم 1981ء میں شروع ہوئی۔ اور پہلا کام جو ہم نے سوچا اور کیا وہ یہ تھا کہ ملازمت کرنے والی عورتوں کے بچوں کے لیے نرسریاں اور کنڈر گارٹنز کھولے۔ ہم نے انفرادی اور اجتماعی طور پر رابطے کئے تو کسی نے رضا کارانہ طور پر زمین دے دی۔ یہ زمین النبتہ AlNabitieh کے قریب طوئل میں تھی۔ تین نوجوان انجینئروں نے پیش کش کی کہ وہ عمارت کی تعمیر کی نگرانی کریں گے۔ ہم نے اس مرکز کے لیے پیسے جمع کرنے شروع کئے مگر 6 فروری 1982ء کو لبنانی فوج نے مغربی بیروت پر بمباری شروع کر دی۔ لبنانی فوج نے عمل سے معاملہ کرنے کی بجائے اسے تباہ کرنے کیلئے لئے بمباری کرنا ضروری جانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے۔ ہم نے مرکز کی عمارت تعمیر کرنے کا معاملہ ایک طرف ڈالا اور ہزاروں افراد کو جو اپنے قصبے میں ایک رات کو اندر مہاجر بن گئے تھے کھانے پینے کا سامان اور سر

چھپانے کے لیے جگہ فراہم کرنے کا کام شروع کر دیا۔

''ہم نے بڑے بڑے بزنس مینوں سے رابطے کیے جن کی بڑی بڑی بلڈنگوں میں بے شمار فلیٹ خالی پڑے تھے، سینکڑوں فلیٹوں کی چابیاں لیں اور پھر بے گھر ہونے والوں کو لاؤڈ سپیکر کے ذریعے متوجہ کیا۔ وہ آئے ہم نے پانچ عمارتیں کھول دیں ان میں ڈیڑھ سو فلیٹ تھے۔ ہم نے ایک کمرے میں ایک ایک خاندان ٹھہرانا شروع کئے مگر ضرورت مند بہت ہی زیادہ تھے اور ہم ان میں سے دسویں حصے کو بھی جگہ مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ ان فلیٹوں میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ نہ کرسیاں نہ بیڈ کچھ بھی تو نہیں تھا تاہم پہلی ضرورت خوراک تھی ہماری ساری خواتین نے اپنی اپنی جگہ پر جو کچھ ہو سکتا تھا کیا۔ میں نے ریڈ کراس والوں کو ٹیلی فون کیا اور ان لوگوں کیلئے خوراک مانگی۔ ریڈ کراس والوں نے مثبت جواب دیا۔ اگلے چند دنوں میں ہم نے ان افراد کے نام پتے اور دوسرے اعداد شمار اکٹھے کئے اور ریڈ کراس والوں کو دے دیئے۔ پھر ہمیں پتہ چلا کہ دوائیں ،دودھ اور بچوں کیلئے پٹیاں نہیں ہیں۔ ہم نے سیو دا چلڈرن فنڈ Save the Children Fund سے رابطہ کیا اور ان سے یہ چیزیں مانگیں۔ انہوں نے یہ چیزیں فراہم کیں اس کے علاوہ ہم نے اپنے فنڈ سے یہ چیزیں بھی خریدیں۔ 6 فروری کے بعد کچھ پناہ گزین اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور حالات کچھ بہتر ہو گئے۔ اب سیاسی کام کرنے کا وقت تھا۔ ہم نے ایک پریس کانفرنس میں اپنی سوسائٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہم جنوب کی عورتوں کی امداد کی خاطر دار الفتویٰ کی عمارت پر قبضہ کر رہے ہیں۔ اغوا شدہ بچوں کی مائیں اور اغوا شدہ خاوندوں کی بیویاں ہمارے ساتھ مل گئیں اور عمارت پر قبضہ ایک بڑے مظاہرے کی صورت میں ہوا۔ اس کے بعد ہم نے یتیموں کو ایک دعوت دینے کی تجویز کی۔ بچوں کو برج البراجنہ میں بلایا اور انہیں کپڑے مٹھائی اور دوسرے تحائف دیئے۔ ''یوم مادر'' کے موقع پر ہم نے بچوں والی ماؤں کی ایک بڑی پارٹی کی۔ ہم نے کھانے کا سامان نیلام کیا اور اس سے جو فنڈ اکٹھا ہوا وہ ان ماؤں میں تقسیم کر دیا جن کے خاوندان کے ساتھ نہیں تھے۔ پھر ہم نے اپنی سوسائٹی کے کام پر چاندی کے تمغے بنائے اور انہیں ہسپتال میں مریضوں کی نذر کر دیا۔ دریں اثنا ہم جنوب میں جنگ میں مصروف خواتین کے بارے میں اطلاعات اکٹھی کرتے رہے۔ ہمارے پاس ایسی خواتین ہیں جو جنوبی لبنان میں جاتی ہیں۔ جو ہمیں وہاں محاذ جنگ پر سرگرم خواتین کے بارے میں تصویریں اور دوسری معلومات فراہم کرتی ہیں۔ وہاں بعض عورتیں لڑنے والے مردوں کو پناہ بھی دیتی ہیں اور جان بچانے کے

راستے بھی بتاتی ہیں۔ہم چاہتی تھیں کہ ہم ان عورتوں کی مدد کریں چنانچہ ہم نے طرح طرح کی مشکلات اور تذلیل کے باوجود جنوب میں ان خواتین سے رابطہ کیا۔ میں نے جنوب میں خواتین کی طرف سے مظاہرہ کرانے کی تجویز رکھی میں نے مسٹر نمبیر اور ولید جمیلات سے ان کی رائے مانگی اُنہوں نے کہا خیال اچھا ہے مگر مارے جانے کا خدشہ ہے، ہوسکتا ہے اسرائیلی ہمیں گولی ماردیں۔''

''مختلف سیاسی تنظیموں اور شخصیتوں کی طرف سے مخالفت کے باوجود ہم نے اپنی تجویز پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔ ہم نے اخباروں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اس کا اعلان بھی کردیا۔ مقررہ دن ہم کاروں پر سوار مقبوضہ جنوب میں پیترے Pietre کی سرحد پر پہنچے جہاں ہم نے اپنی کاریں چھوڑیں اور پاپیادہ اسرائیلیوں کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ریڈ کراس والوں نے ہمیں متنبہ کیا کہ اسرائیلی گولی چلانا چاہتے ہیں۔ہم نے کہا پرواہ نہیں اور مظاہرہ جاری رکھا جب ہم نے اسرائیلیوں کی طرف بڑھنا شروع کیا تو اُنہوں نے خاردار تار پیچھے ہٹانے شروع کردیئے اور خود بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ ہماری بہت ساری عورتوں کے پاس لاؤڈ سپیکر تھے جن پر وہ اسرائیلی سپاہوں سے کہہ رہی تھیں۔''دور ہٹو، یہ ہماری دھرتی ہے، یہ ہمارا محبوب جنوبی لبنان ہے ہم تمہیں اس دھرتی پر چین نہیں لینے دیں گے۔''

''ہم نے لبنان کے جھنڈے سر بلند کئے اور اسرائیل سپاہیوں پر پتھراؤں شروع کردیا یہ بڑا جذباتی منظر تھا۔ تمام عورتیں سخت جذباتی اور پرعزم تھیں اور ہم سب مرنے اور اس محبوب دھرتی سے ہم آغوش ہونے کیلئے تیار تھیں۔ اسرائیلیوں نے ہم پر گولی نہیں چلائی اور ہمارا مظاہرہ بہت ہی کامیاب ثابت ہوا۔ اب ہم منصوبہ بنا رہے ہیں نیویارک میں اقوام متحدہ کی عمارت میں دھرنا مارنے کا۔ ہم اسرائیلی قبضہ کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتی ہیں تاکہ دُنیا کی ساری عورتیں ہماری آواز سنیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری حمایت بھی کریں گی۔ ہم ساری دُنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ جنوب میں ہم عربوں خصوصاً عورتوں کو کن مصائب کا سامنا ہے۔ اسرائیل نے ہمارے معصوم شہریوں پر جو ظلم کیا ہے ہم دُنیا کو وہ اسرائیلی جرائم دکھانا چاہتی ہیں۔ ہمارے پاس فلمیں ہیں کتابچے ہیں اور بہت سا لٹریچر دُنیا کیلئے کہ وہ دیکھیں اور پڑھیں مجھے یقین ہے کہ یہ کچھ دیکھنے اور پڑھنے کے بعد خواتین کی اکثریت ہماری حمایت کرے گی۔''

''آپ کی تنظیم کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہے؟''

''نہیں اس کی کوئی سیاسی شناخت نہیں ہے۔ یہ جنوبی لبنان کی عورتوں کی تنظیم ہے۔ ہماری سب ارکان کا تعلق جنوب سے ہے اس میں ہر مذہب عیسائی، دروز اور مسلمان اور ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں۔ اگر لبنان کے دوسرے علاقوں کے لوگ ہماری مدد کرنا چاہیں گے تو ہم خیر مقدم کریں گے۔ مگر ہماری ساری سرگرمیاں صرف جنوب پر مرکوز ہیں کیونکہ جنوبی علاقے کو ایک طرف سے ہمیشہ حکومت نے نظر انداز کیا دوسری طرف بھی زمین وحشی اسرائیلیوں کی مسلسل یلغاروں کا نشانہ بنی یہ دوسری بات ہے کہ اگر جغرافیائی اعتبار سے دیکھا جائے تو جنوبی علاقے میں تیل کی دولت وافر ہے اور یہاں کے لوگ بھی بہترین لوگ ہیں۔''

''جنگ کے دوران لبنان کی عورت نے جو نیا کردار ادا کیا ہے۔ اس سے یہ روایتی تصور ختم ہو گیا ہے کہ عورت صنف نازک ہے؟''

''یقیناً، عورتیں مردوں سے بھی زیادہ جفاکش ہوگئی ہیں۔ میری مثال لیں میں صبح پڑھاتی ہوں۔ سہ پہر کو سوسائٹی کے اُمور میں حصہ لیتی ہوں اور شام کو اپنے بچوں اور خاوند کے ساتھ ہوتی ہوں۔ یہ بھی تو میرا فرض ہے۔ ہمارے مرد ہماری نئی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھتے ہیں اور معترف ہیں۔ اگر وہ ہم سے اتفاق نہ کرتے ہماری مدد نہ کرتے تو گھریلو جھگڑے بھی ہوتے جس سے ہم سماجی کام اتنی خوبی سے نہ کر پاتے جس خوبی سے اب کر رہے ہیں۔

بہر طور ہم نے ملکی زندگی میں جو کردار ادا کرنا شروع کیا ہے۔ مردوں نے اسے حوصلہ دیا ہے۔ اکثر تعلیم یافتہ مردوں نے عورتوں کو مردوں کے برابر قبول کر لیا ہے۔ اگر آپ اس معاملہ کو مذہبی نقطہ نظر سے بھی دیکھنا چاہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے ہر صحت مند جسم والے مرد اور عورت اپنے معاشرے کیلئے مفید کام کر سکتے ہیں مگر بیکار گھر پر بیٹھے رہتے ہیں تو یہ اسلام کی توہین ہے یہ خلاف اسلام ہے۔ اسلام نے عورت کو معاشرے میں پورا پورا کردار ادا کرنے سے کبھی نہیں روکا۔ خود پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عظیم عورتیں تھیں جنہوں نے شاعری، میدان جنگ اور سماجی اور سیاسی شعبوں میں بڑا نام کمایا۔ جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے۔ عورتوں کا کام صرف گھر داری، کھانے پکانے اور بچے پیدا کرنے تک ہی محدود نہیں ہے بعض مسلمان آج بھی دراصل یہی دعویٰ کرتے ہیں۔ میرا احساس ہے کہ اگر اسلام کو صحیح معنوں میں نافذ کیا جائے تو عورتوں کو مکمل حقوق بھی حاصل ہو جائیں گے اور وہ مردوں کے برابر بھی آ جائیں گی۔ اگرچہ میں اسلامی لباس نہیں پہنتی مگر میں سمجھتی ہوں کہ یہ لباس عورت کو کام کاج

کرنے میں سہولت دیتا ہے۔ننوں کو دیکھوان کا لباس بھی تو مسلم خواتین والا ہے۔کسی نے آج تک یہ اعتراض بھی نہیں کیا جولباس نہیں پہنتی ان سے کام کرنے میں کوئی رکاٹ پیدا ہوتی ہے۔ حلانکہ یہ بہت محنت کش ہوتی ہیں۔ میں یہ بھی محسوس کرتی ہوں کہ جس انداز کا لباس ہم پہنتے ہیں۔ وہ مناسب بھی ہے اور اس میں ہماری عزت نفس کی بھی جھلک نظر آتی ہے تاہم میرے نزدیک الشرعی پہننا ضروری نہیں۔ پختہ عمر والی عورت نے نفیس اور اچھا لباس پہن رکھا ہو تو اس کا وجود زیادہ معتبر بن جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لبنان میں جنگ کی وجہ سے عورتوں کی آزادی کی جدوجہد پر مثبت اثرات پڑے ہیں۔ لبنانی خواتین کی زندگیوں میں ایک نئی صبح طلوع ہوگئی ہے۔ وہ زیادہ پراعتماد اور مستعد ہوگئی ہیں۔مگر اس کیلئے انہیں آرام واعصاب کی قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔ بہت سی عورتیں اعصاب شکنی کا شکار ہوئی ہیں۔اسی لئے اب ملک بھر میں سکون آور گولیاں بھی ملتی ہیں۔ لبنان میں لوگ ایک عام سی تھکن کا شکار ہیں۔ظاہر ہے کہ جب ایک لمبے عرصے تک آپ کو اپنے اوقات کار دوگنا یا تین گنا کرنے پڑیں تو قدرتی بات ہے کہ آپ کہیں نہ کہیں توڑھے جائیں گے۔''

''لبنانی عورت کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

لبنان ہمیشہ سے ایک کھلے معاشرے والا ملک رہا ہے۔ ہم پر مغربی طرز زندگی کا اثر رہا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں لبنانی عورت رجعت قہقری نہیں کرے گی۔ موجودہ ہنگامی حالت میں وہ جو کردار ادا کر رہی ہے وہ ہنگامی حالات کے ختم ہونے پر بھی جاری رہے گا۔صرف اس کی شکل بدل جائے گی۔ لبنانی عورت نے جنگ کے دوران جو فیصلہ کن رول ادا کیا ہے اسی کی کھوکھ سے اس کے لیے ایک ایسا کردار پیدا ہوا ہے جو وہ اپنے ملک کی آئندہ تاریخ میں ادا کرے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آزادی کے بعد الجزائر کی عورت کو جو صورت حال پیش آئی ہے ویسی صورت لبنانی عورت کو پیش نہیں آئے گی۔ یہ سچ ہے کہ الجزائر کی عورت نے اپنے ملک کی آزادی کی جنگ میں عملاً ہتھیار بھی اُٹھائے ،لڑی بھی اور اس طرح انتہائی اہم کردار ادا کیا مگر الجزائر کی عورت کو اپنے اس کردار کے بارے میں وہ شعور اور تفہیم حاصل نہیں تھی جو لبنانی عورت سمجھتی اور جانتی ہے۔

مسز رندا بیری Randa Berri سیاسی خاتون نہیں مگر تحریک عمل کے لیڈر نبیم بیری کی بیوی ہیں۔ حاملہ تھیں اس لئے بڑی پیلی اور تھکی ہوئی لگتی تھیں مگر گفتگو کیلئے آمادہ تھیں یہی نہیں مجھے

یہ بھی کہا کہ انٹرویو عربی یا انگریزی جس زبان میں چاہوں لے سکتی ہوں۔ لبنان میں یہ بات تھوڑی سی غیر معمولی ہے کیونکہ عربی کے بعد دوسری زبان انگریزی کی بجائے فرانسیسی ہے۔ مسز بیری واقعی ذہین اور خوش گفتار خاتون تھیں۔

جو پہلی چیز میں نے اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی وہ یہ تھی کہ آیا اس کا خواتین کی کسی انجمن سے کوئی تعلق ہے جس کے جواب میں اس نے کہا کہ وہ کسی تنظیم سے متعلق نہیں کیونکہ اس کام کیلئے بہت سا وقت چاہئے اور پھر مجھے سبھی ساتھیوں سے رابطہ رکھنا ہوتا ہے۔ تاہم اب ایک منصوبہ ہے کہ معذور اور لنگڑے لولے افراد کیلئے ایک بڑا مرکز بنانا ہے چنانچہ معذوروں کی دیکھ بھال کیلئے ایک سوسائٹی بنائی گئی جس کی صدر میں ہوں میرے ساتھ سوسائٹی کے چار بانی ممبر ہیں ڈاکٹر اور نرسیں۔۔۔۔۔۔۔ہم نے ایک چھوٹا سا مرکز کھولا اور اس اُمید پر کہ اس سے بڑا مرکز بنائیں گے۔ اس چھوٹے مرکز میں معذور افراد کو صرف طبی امداد فراہم کی جاتی ہے جبکہ بڑے مرکز میں طبی امداد پیشہ وارانہ تربیت اور تفریحی مواقع بھی فراہم کئے جائیں گے مگر یہ بھی کم ہے خاص طور پر مغربی بیروت میں جہاں جنگ کے باعث لوگوں کی ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی۔ پہلے میں جنوب میں یہ مرکز کھولنا چاہتی تھی۔ جنوب میں 1982ء میں ساٹھ ہزار افراد معذور تھے۔ مگر جنوب میں خصوصاً میرے لیے آنا جانا بڑا مشکل تھا چنانچہ مجھے ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ سوسائٹی رکن مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ ہماری اصل ضرورت عمارت اور دوسرا ساز و سامان نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ افراد ہیں۔

''ایک کارکن خاتون کی حیثیت سے جنگ کے دوران آپ کا کردار کس طور تبدیل ہوا؟''

ہر چند میں سمجھتی ہوں کہ ہر خاتون پر گھر اور بچوں کی دیکھ بھال فرض ہے مگر میں اس نظریہ کی شروع سے ہی خلاف ہوں کہ عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا چاہیے۔ لیکن جو عورتیں سماجی زندگی اور بہبود کے کام میں حصہ لینے کا فیصلہ کرتی ہیں انہیں خانہ دار خواتین کے مقابلے میں زیادہ قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ تاہم جب آپ اپنی زندگی کا خاص مصرف نکال کر معاشرے میں ایک مثبت کردار ادا کرنا چاہیں تو پھر یہ قربانیاں کچھ نہیں کہتیں۔ جب میں سکول سے فارغ ہوئی میں نے اپنے والد کے پبلشنگ ہاؤس دارلاندلس Dar Alandolos میں کام کرنا شروع کیا۔ والد کی وفات کے بعد میری بڑی بہن نے کام سنبھال لیا اور میں نے اس کی معاونت شروع کی۔ شادی کے بعد اور سماجی شعبہ میں مصروف ہونے کے باعث میں اب بہن کا ہاتھ نہیں

بٹا سکتی تھی۔ بالاخر میں نے ادب کے شعبے میں کام ختم کیا اور سارا وقت سماجی بہبود کے کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ میرا پختہ ایمان ہے کہ جو عورتیں گھر کی ہو کر رہ گئی ہیں اور برتنوں کو چمکانے دمکانے اور عمدہ عمدہ کھانے پکانے کیلئے وقف ہوگئی ہیں درحقیقت وہ اپنی زندگی ضائع کر رہی ہیں۔ تمام عرب ممالک میں سے لبنان وہ ملک ہے جس میں عورت کیلئے اپنی تربیت اور صلاحیت کے مطابق کام کرنے کے مواقع زیادہ ہیں۔ ذرا غور کریں عمل میں کام کرنے والی عورتیں عام نظر میں قدامت پسند مسلم خواتین سے کہنا ہے کہ وہ معاشرے کی خدمت میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کریں۔ چنانچہ مسلمان عورت پاک اور شفاف ضمیر کے ساتھ کام کرنے کے لئے نکلتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ وہ اسلامی فریضہ ادا کر رہی ہے دوسرے تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام عورتوں کے کام کی سماجی افادیت کو تسلیم کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر آپ ایک سفید یونٹ کا انتظام کر سکتی ہیں تو پھر ایک بہت بڑے سماجی یونٹ کے معاملات بھی سنبھال سکتی ہیں۔ اسلام دوسرے مذاہب سے اس لئے ممتاز ہے کہ اس میں ریاست اور مذہب دونوں کیلئے ایک مکمل نظام ہے ہر چند قرآن کو آئے ایک طویل عرصہ گذر چلا ہے مگر آج کا شاید ہی کوئی سوال ہوگا جس کا قرآن میں حوالہ نہ ہوا۔ اسی بنا پر میں سمجھتی ہوں کہ وہ عورت جو مذہب اور قرآن کو اچھی طرح سمجھتی ہے وہ یقیناً معاشرے کے لئے زیادہ مفید ہے۔

''مگر لبنان میں جنگ سے قبل مسلمان عورت کا ایسا کردار نہیں ملتا۔ کیوں؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ اخبارات کے ذریعے دُنیا کو پتہ چلا کہ لبنان کی کتنی عورتیں مختلف شعبوں میں سرگرم ہیں اور ان کی تعداد میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً جنگ سے پہلے ان معذوروں اور لولوں لنگڑوں کیلئے دو یا تین مرکز تھے جو یا پیدائشی طور پر معذور ہوتے یا ٹریفک کے حادثوں میں معذور ہو جاتے ہیں۔ مگر جنگ کے زمانے میں صرف ایک دن میں اتنے بہت سارے افراد زخمی ہوئے جتنے عام حالات میں تین یا چار برس کی مدت میں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی دیکھ بھال کیلئے ہمیں زیادہ افراد کی ضرورت تھی، اس کام کیلئے عورتیں سامنے آئیں۔ لبنان کے سماجی شعبہ میں عورتیں ہمیشہ سے کام کرتی آئی ہیں مگر جنگ کے دنوں میں ان کی تعداد میں ڈرامائی انداز میں اضافہ ہوا۔ اب بھی اخبارات مسلمان عورت سے انصاف نہیں کرتے۔ وہ دن رات کام کرتی ہے مگر کوئی بھی نہ اس کی سنتا ہے نہ اس کی بات کرتا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ اسلام میں نیکی کے کام کی تشہیر کو برا سمجھا جاتا ہے۔ صحیح مسلمان وہ

سمجھا جاتا ہے جو اگر دائیں ہاتھ سے نیک کا کام کرے تو اس کی خبر اس کے بائیں ہاتھ کو نہیں ہونی چاہیے۔ ہر مسلمان عورت اور مرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی خدمت کریں اور کسی کو یہ بھی احساس نہ ہونے دیں کہ وہ کوئی احسان کر رہے ہیں۔ کچھ عورتیں آگے آئیں۔ قدرتی بات ہے کہ جب ان شعبوں میں زیادہ عورتیں آئیں تو دُنیا کے اخبارات کو بھی پتہ چلا۔ جب اسلامی اُصولوں کی بنا پر بیوی اور شوہر میں اچھی افہام وتفہیم ہو تو پھر عورت کیلئے باہر جانے اور مرضی کے مطابق کام کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ میری مثال لو۔ میرے شوہر نیم پیری عمل کے راہ نما ہیں۔ اتنی مصروفیت کے باوجود انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ میں دن رات سماجی پروگرام میں مصروف رہوں۔ اس کے برعکس میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں جب میں کبھی تھکی تھکی نظر آؤں تو ڈھارس بندھاتے ہیں اور کہتے ہیں ''تم حاجت مندوں کی مدد کر رہی ہو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔'' اگر میرے خاوند حوصلہ نہ بڑھاتے میری مدد نہ کرتے تو میں یہ سب فریضے کہاں ادا کر سکتی تھی۔ درحقیقت جب میں نے اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے شوہر سے معاملات کئے تو مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی اور میں نے اپنے اردگرد کام کرنے والوں سے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ جو پورے اسلامی حدود کے مطابق زندگی گذارتے ہیں وہ بہت خوش ہیں اور جو ایسا نہیں کرتے (اور افسوس کی بات ہے کہ ان کی اکثریت) وہ ناخوش رہتے ہیں۔ جو میرا مذہب کہتا ہے کہ میرا خاوند کے ساتھ سلوک اسی قسم کا ہے اور ان کا میرے ساتھ ان تعلیمات کے مطابق ..... کوئی شک نہیں کہ مرد عورتوں کے محافظ اور نان نفقے کے ذمہ دار ہیں۔ مگر مجھے اپنی حدود کا علم ہے ان سے نکل کر مجھے خاوند سے ٹکرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس طرح میں خوشی رہتی ہوں۔ بعض اوقات میرے خاوند مستقل کام کرتے رہتے ہیں نہ سوتے ہیں نہ آرام کرتے ہیں میں پریشان ہوتی ہوں پھر بھی مجھے ان کی مصروفیات پر کوئی اعتراض نہیں۔ نہ میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہوں ہوسکتا ہے اس طرح میں انہیں لوگوں کیلئے کئے جانے والے کسی اچھے کام سے روکنے کا سبب ہوں اور بعد میں خود کو مجرم سمجھنا شروع کر دوں۔ میری اسلامی تعلیم وتربیت کے مطابق انہیں دوسری کی مدد سے روکنے کی بجائے مجھے ان کے بوجھ اُٹھانے میں مدد کرنی چاہیے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اچھی ازدواجی زندگی کیلئے اسلامی ضابطے بہت اچھے ہیں؟

''آپ کے خیال میں لبنانی اور الجزائری عورتوں کے تجربات میں کیا فرق ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ لبنان میں سیاسی نظام اور عورتوں کی صورت حال الجزائر سے مختلف ہے الجزائر کی جنگ آزادی کے دوران عورتوں کی تنظیمیں نہیں تھیں اور اب بھی وہاں پر صرف ایک ایسی تنظیم ہے جس کا لائحہ عمل سیاسی پارٹی ہی طے کرتی ہے اور وہی اس کی نگران ہے۔ اس وقت لبنان میں عورتوں کی بے شمار آزاد تنظیمیں ہیں۔ جو اپنی سماجی خدمات کی بنا پر عورتوں کے حقوق اور آزادی کے حصول کیلئے بھی معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ عورتیں ایک طرف معاشرے کے روشن خیال لوگوں کو متاثر کر رہی ہیں اور دوسری طرف سماجی کاموں میں ایک تجربہ بھی حاصل کر رہی ہیں۔ سیاسی عمل بھی خالی خولی نصابی تعلیم سے نہیں اس قسم کے تجربات سے شروع ہوتا ہے۔ سیاست معمولی کام نہیں ہے۔ اس وقت مشرق وسطیٰ میں معدودے چند عورتیں ہیں جو واقعی سیاستدان بننا چاہیں گی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں کبھی بھی سیاسی صرف اول میں جانا نہیں چاہوں گی کیونکہ مجھے علم ہے کہ میں وہاں بہتر ثابت نہیں ہو سکوں گی۔ مجموعی طور پر کہہ سکتی ہوں کہ الجزائر کے انقلاب کے زمانے اور آج کے لبنان کے حالات بہت مختلف ہیں۔ لبنانی عورتوں نے بارہا اپنے اس عزم کا اعادہ کیا ہے کہ وہ ملک میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ عورتوں نے ملک کی خانہ جنگی اور اسرائیلی حملے کے دوان بہت اعلیٰ کردار ادا کیا۔ بعض اوقات تو وہ عورتیں بھی بوڑھی اور حاجت مند خواتین اور یتیموں کی امداد کیلئے نکل آئیں جن کے اپنے خاوند مارے جا چکے تھے یا بچے مر گئے تھے یا بے گھر ہو گئی تھیں۔ بہت سی عورتوں نے تو اپنے گھر اور بچے چھوڑے اور ضرورت مندوں کی مدد کو پہنچیں اور حسب توفیق امداد دی۔ یہ پرعزم عورتیں جو مقام حاصل کر چکی ہیں وہ ہرگز نہیں چھوڑیں گی وہ یقیناً ان معرکہ آرا کامیابیوں سے کنارہ کش نہیں ہوں گی۔''

''لبنان نے جنگ کے دنوں میں جو عظیم کردار ادا کیا وہ عورتوں کے روائتی فرائض کے بوجھ میں اضافہ تھا اس دوران اس نے روائتی گھریلو کاموں میں سے کچھ کا بوجھ اتار بھی دیا ہے؟''

''تبدیلی تو اسی وقت آنا شروع ہو گئی تھی جب عورتوں نے گھر سے باہر کام کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ مرحلہ جنگ میں ان کے مکمل طور پر آنے سے بہت پہلے کا ہے۔ بہر طور ملازمت یا کام کرنے کے باعث عورتوں کو مزید قربانیاں دینا پڑیں۔ اس طرح ان کے گھروں کے اندر بحران پیدا ہو سکتا تھا مگر اُنہوں نے عزم کر رکھا تھا کہ وہ گھر میں یہ انتشار پیدا نہیں ہونے دیں گی۔ ان کی ذمہ داریاں دوہری ہو گئیں۔ اور یقیناً ان پر بوجھ بڑھ گیا۔ مجھے نہیں خبر کہ شوہر اپنی بیویوں کے معاملات کو کہاں تک ہمدردی سے سمجھتے ہیں اور کہاں تک گھر چلانے اور بچوں کی

دیکھ بھال میں ہاتھ بٹاتے ہیں تاہم اکثر عرب مرد گھر میں کام کرنے سے انکاری ہیں۔اس کے علاوہ مرد کے اپنے حقوق بھی ہیں۔جس طرح عورتوں کو گھر سے باہر ملازمت کا کام کرنے کا حق ہے اسی طرح مرد کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اس کی عورت اسے کمپنی دے اور خوش رکھے۔ہمیں زندگی کو اس روپ میں نہیں دیکھنا چاہیے جہاں جب مرد اندر داخل ہو رہا ہو تو عورت بیرون خانہ جا رہی ہو۔دونوں میاں بیوی کو ازدواجی زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔اس ضمن میں عورت کی ذمہ داری زیادہ ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ وہ کتنی متحرک اور مضبوط ہے۔

''اہل تحریک کے راہ نما کی بیوی کی حیثیت سے مجموعی طور پر لبنانی عورت کے کردار، اور اب تک کے حاصل حصول اور مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''بلاشبہ معاشرے میں عورت کے کردار کو نہ صرف تسلیم کیا جانا چاہیے بلکہ اس کی مزید حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ ہمارے پاس بڑی ذہین اور قابل عورتیں ہیں مگر ہمیں اس سے بھی زیادہ کی ضرورت ہے۔بعض اوقات گھریلو ذمہ داریوں یا دوسرے سے مخصوص حالات کی بناء پر عورتیں معاشرے کو اتنا کچھ نہیں دے سکتیں جتنا کہ وہ اصلا دے سکتی ہیں اس لئے ہم لبنان کی ہر عورت کو شریک کار کرنا چاہتے ہیں۔ہمیں بڑی مدد کی ضرورت ہے اس لئے ضرورت یہ ہے کہ ساری عورتیں جس قدر بھی معاشرے کو دے سکتی ہیں وہ دیں۔اگر ہم جنوب کی بات کریں یا افلاس زدہ علاقوں کی مدد کیلئے پکاریں تو عورتوں کی یہ ستر یا نوے سوسائٹیاں مطلوبہ امداد تو نہیں دے سکتیں۔جنوب کے لوگ بلاشبہ دوسرے علاقے کے لوگوں کی طرح باصلاحیت ہیں۔مگر اُنہوں نے دوسروں کے مقابلے میں بہت صعوبتیں اُٹھائی ہیں۔آج بھی وہاں تقریباً پچاس دیہات کیلئے صرف ایک سکول ہے۔اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ہماری عورتیں وہاں جائیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہاں کے لوگ کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔اور پھر ان کی مدد کی کوشش کریں۔میرا ایمان ہے کہ مردوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ عورتیں سماجی بہبود کے کام کرنے کی زیادہ اہل ہیں۔

بیروت میں نادیہ نوفہید سے ملاقات میری خوش قسمتی تھی جب میں نے اسے ٹیلی فون کیا تو وہ ہفتے کی چھٹی گذارنے کے لیے روانہ ہونے ہی والی تھی۔اس نے فون پر ہی کہا کہ اگر تم نصف گھنٹے کے اندر اندر آ جاؤ پھر ہم بیٹھ کر گفتگو کریں گے اور اگر تم آدھ گھنٹے کے اندر نہ پہنچیں تو پھر میں سمجھ لوں گی کہ تم نہیں آ رہیں اور میں جا سکتی ہوں۔ میں کینڈلزCandles کی مصنفہ سے

ملاقات کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اس کتاب میں بہت خوبصورتی اور حسن کاری سے عرب خواتین کے اصل مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ کینڈلز کے علاوہ بھی نادیہ نے لبنان کے اخباروں اور رسالوں میں سینکڑوں ہی مضامین لکھے ہیں۔ نادیہ لبنان کی خواتین کے بارے میں ''کون کیا ہے'' قسم کی کتاب بعنوان ''تاریخ سے مثالیں'' پر بھی کام کر رہی تھی۔

نادیہ نوفہید نے خوبصورت زبان میں اور مجھے مسحور کر دینے والی آواز میں گفتگو کی میں اس لئے بھی اس سے متاثر تھی کہ وہ چون پچپن کے پیٹے میں ہے اس نے چھ بچے بھی پالے ہیں جو سب کے سب یونیورسٹی گرایجوایٹ ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ وہ ''دروز ویلفر سوسائٹی'' کی سربراہ ہے چنانچہ میں نے سوچا سب سے پہلے اس سوسائٹی کے بارے میں سوال کروں گی۔ ان کی داستاں یوں ہے۔

''میں وینز ویلا میں تھی بیروت آئی المسیت بے قصبے میں ٹھہری جو بہت غریب علاقہ ہے۔ دروز ویلفیئر سوسائٹی بن چکی تھی۔ دفتر ایک پرائمری سکول میں تھا۔ تو آپ کہہ سکتی ہیں کہ یہ ایک معمولی سا آغاز تھا۔ میں سوسائٹی کی رکن بنی قصبے کی صورت حال کو بہتر بنانے کیلئے دوسرے ارکان کے ساتھ ایک منصوبے پر غور وفکر کیا اس کے فوراً بعد علاقے میں ایک مرکز صحت کھول دیا۔ پرائمری اور ثانوی سکول کھولے اور ان خواتین کے لیے ایک تربیت گاہ بنائی جو تعلیم جاری نہیں رکھ سکتیں یا تعلیم حاصل ہی نہیں کرنا چاہتیں۔ آپ جانتی ہیں کہ لبنان میں تعلیم مفت نہیں ہے بلکہ کسی حد تک مہنگی ہے اس لئے بہت سی عورتیں تعلیمی اخراجات برداشت ہی نہیں کر سکتیں۔ ہم سال بھر میں کم از کم ایک سو بیس عورتوں کو کپڑے سینے کی تربیت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹائپنگ، ڈرائنگ، نٹنگ اور سینے پرونے کا کام بھی سکھاتے ہیں۔'' مجھے ایک چینی ضرب المثل بڑی اچھی لگتی ہے جو یوں ہے ''غریب کو مچھلی دینے کی بجائے مچھلی پکڑنا سکھاؤ'' اس لئے کہ آپ اسے ایک دو بار تو کھانا کھلا سکتے ہیں تاحیات نہیں۔

ہماری تنظیم میں عورتوں کی تعداد بھی مردوں سے بہت بڑھ گئی ہے اور عورتوں کی کارکردگی بھی مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ صحت، تعلیم، مالیات اور نشر واشاعت کی کمیٹیوں میں بارہ بارہ سے بھی زیادہ خاتون ارکان ہیں۔ سوسائٹی کی خاتون ارکان کی تعداد پانچ سو ہے جبکہ صرف بیس مرد ہمارے رکن ہیں۔ ان کے علاوہ دو ہزار کے قریب اعزازی رکن ہیں۔ یہ اعزازی رکن زیادہ سرگرم نہیں ہیں ان کا سال بھر میں صرف ایک اجلاس ہوتا ہے جس میں وہ سوسائٹی کو اپنا چندہ

دیتے ہیں۔مگر جو رکن حقیقتاً سرگرم ہیں اور زیادہ تر کام کرتے ہیں وہ عورتیں ہیں۔مستعد قسم کے کام کر کے انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ بردبار اور مستعد ہیں۔ اسی بنا پر میں چاہوں گی کہ لبنان کی حکومت سیاسی اُمور میں عورتوں کو بھی شریک کرے۔ہم دریں اثناء اپنے آپ کو اگر مردوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر اہل ثابت کر چکی ہیں۔چونکہ مرد بہت ہی خودغرض ہیں اس لئے ہمیں اپنے ملک میں سیاسی کردار ادا کرنے کا موقع دیا جاتا۔اگرچہ عورتیں بارہا ہر شعبے میں یہ ثابت کر چکی ہیں کہ ان کی کارکردگی مردوں سے بہتر لیکن وہ ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ عورتیں یہ نہیں کر سکتیں عورتیں وہ نہیں کر سکیں۔جو عورت ایک گھر کامیابی سے چلا سکتی ہے وہ یقیناً ایک بڑا سماجی ادارہ بھی چلا سکتی ہے۔جو عورت معاشرے کو ہونہار کامیاب بچے دے سکتی ہے وہ پارلیمنٹ کی رکن بننے کے بھی اہل ہوتی ہے۔ہمارے بے شمار ایسے اسمبلی ممبر ہیں جنہیں آج تک بولتے نہیں دیکھا۔بے شمار ایسے سرکاری ملازم ہیں جو کبھی ایک لفظ بھی نہیں بولتے یا ہم نے ان سے کوئی رائے نہیں سنی۔اگر عورتیں ان ارکان اسمبلی یا ان ملازمین کی جگہ لے تو یقیناً نتیجہ بہتر ہوگا۔

اگر عورتوں نے اپنے زور بازو سے اندر داخل ہونے کا چارہ نہ کیا تو مرد انہیں آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔اس مقصد کیلئے عورتوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہئیں۔ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے اور ووٹ بھی ایک دوسرے کو دینا چاہیے۔ہمیں ووٹ دینے کا حق حاصل ہے تو پھر یہ ووٹ قابل عورتوں کے حق میں کیوں استعمال نہ کیا جائے مگر افسوس ہمارا ایک دوسرے سے اب تک ایسا تعلق پیدا نہیں ہو سکا۔ہم سب کہتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ عورتیں بلند ترین مقام حاصل کریں مگر ہم اس ضمن میں کوئی کوشش نہیں کرتے مدد نہیں دیتے۔اب وقت آ گیا ہے کہ اس ضمن میں کوئی واضح قدم اُٹھایا جائے۔سب سے پہلے تو یہ ہے کہ عورت سب سے پہلے عورتوں کے کام آئے۔جہاں کہیں ایک قابل عورت الیکشن لڑ رہی ہیں وہاں تمام عورتیں اسے ہی ووٹ ڈالیں۔اگر خود ان میں ایک قابل عورت ہے تو پھر وہ مرد کو کیوں ووٹ دیں سوائے اس صورت کے کہ عورتیں خود ہی اپنے آپ کو کمتر سمجھتے ہوئے عورت کے مقابلے میں مرد کو بالاتر قرار دے کر اسے ووٹ دے دیں؟ ہمیں ان عورتوں کی حمایت کرنی چاہیے جو ملک میں کامیاب عہدوں پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

آج عورتیں اگر مردوں سے بہتر تعلیم یافتہ نہیں تو ان کے برابر ضرور ہیں۔مجھے خبر ہے کہ

ہماری بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو ہمارے وزیروں اور پارلیمان کے ارکان سے زیادہ قابل ہیں۔لیکن ہماری پارلیمنٹ میں ایک بھی عورت نہیں۔کبھی مسز منیرہ البوستانی ممبر ہوا کرتی تھیں۔ ان کو بھی یہ نشست اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔وہ زیادہ دیر رکن بھی نہیں رہیں اور وہ کوئی جاندار قسم کی رکن بھی نہیں تھیں۔شاید پہلی خاتون رکن ہونے کے علاوہ وہ غلط انتخاب تھیں۔تاہم اب تو اور بہت سی قابل لبنانی خواتین ہیں جو اسمبلی کی نشست کیلئے بڑی اہلیت کی مالک ہیں۔ اس وقت کم از کم پندرہ ایسی خواتین ہیں جو وزارتی اور پارلیمانی عہدوں پر کام کرسکتی ہیں۔اور اس کیلئے تیار بھی ہیں۔لبنانی خواتین کو ریاست پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ عورتوں کے بارے میں اپنا رویہ تبدیل کرے۔مثال یہ ہے کہ اس جنگ کے دوران لبنانی عورتوں نے بے گھر لوگوں اور یتیموں کیلئے عظیم کام کیا ہے۔تو پھر انہیں اپنی مدد اور اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے کا اختیار کیوں نہیں دیا جاتا۔ہم پر اتنا اعتماد تو کیا جاتا ہے کہ ہم بچوں کو جنم دیں۔انہیں پالیں پوسیں جوان کریں مگر ان کی زندگیوں کے بارے میں کسی بھی مسئلہ پر ہمیں فیصلہ کا اختیار نہیں ہے۔نہ ہم پر اعتماد ہے اس کے برعکس وہ ہماری زندگیوں کے بارے میں فیصلے کرنے کے مجاز بنے ہوئے ہیں۔ زندگی ہم تخلیق کرتے ہیں مگر کنٹرول وہ کرتے ہیں۔اگر آپ کو کسی قوم کی تہذیب کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہے تو صرف یہ سوال کریں کہ اس تہذیب میں عورت کا کیا کردار تھا۔جاہل عورتیں غلام پیدا کرتی ہیں جبکہ تعلیم یافتہ عورتیں معاشرے کو تعلیم یافتہ اپنے بچوں لڑکوں اور لڑکیوں کی نشوونما برابری کی سطح پر کریں۔ہم لڑکوں کی تربیت ہمیشہ ایسے کرتے ہیں جیسے وہ خاندان کے سربراہ ہیں جبکہ بچیوں کو ہم قدم قدم پر روکتے ٹوکتے رہتے ہیں۔''یہ نہ کرو، وہ نہ کرو بدنام ہوجاؤ گی یوں نہ کرو کہ یہ سماج کو منظور نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔اس طرح ہم لڑکی کو احساس کمتری کا مریض بنادیتے ہیں۔جبکہ لڑکوں کو ہم صرف ہلا شیری دیتی ہیں۔''تم مرد ہو، تمہیں تو یہ کرنے کیلئے تیار ہونا چاہیے اگر ہم بچیوں سے بھی اسی طور سلوک کریں جس طور پر بچوں کی پرداخت کرتی ہیں تو وہ یقیناً ہر شعبہ میں مردوں کے مقابلے میں پوری اتریں گی۔

''آزادی کی سو تعبیریں ہوسکتی ہیں مگر ہم عورتوں کیلئے اس قسم کی آزادی چاہتے ہیں۔۔۔۔ایک آزاد فرد کی حیثیت سے جاننے، سمجھنے اور عمل کرنے کی آزادی۔اب لبنان میں عورتوں کو قومی فیصلوں میں بھی شریک کیا جانا چاہیے۔ویمنز کونسل ملک کی تمام زنانہ تنظیموں کی نمائندہ ہے اسے عورتوں کی سیاسی نمائندگی اور سیاسی اُمور میں شرکت کے لیے دباؤ ڈالنا چاہیے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر عورتوں کی تمام تنظیمیں متحد ہو کر اور ویمینز کونسل کے ذریعے سرگرم عمل ہوں تو وہ جلد ہی ملک کے سیاسی کلیدی عہدے پر پہنچ جائیں گی۔ ماضی میں عورتوں نے اس ویمنز کونسل کے ذریعے سیاسی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ لوگوں کو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ عورتیں بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ تاہم یہ کوشش قابل تعریف تھی۔ چنانچہ ان دنوں تو ووٹر عورتوں نے بھی کونسل کی حمائت نہیں کی تھی۔ خاتون ووٹریں بھی اکثر اپنے ووٹ والد، خاوند یا بھائی کے کہنے پر ڈالتی ہیں۔ ابھی تک ان کا معاملہ یوں ہے کہ وہ اس مقام پر نہیں پہنچیں جہاں وہ آزادانہ رائے رکھ سکیں اور پھر اس کا تحفظ بھی کر سکیں۔ آپ الیکشن کے مسئلے سمجھتی ہیں۔'' کچھ لوگ ووٹ خریدتے ہیں، کچھ ووٹ حاصل کرنے کیلئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں ہماری پس ماندگی کی علامتیں ہیں اور اس پس ماندگی پر ہمیں شرم آنی چاہیے۔ تاہم مجھے اُمید ہے کہ ہماری نئی کونسل کیلئے حالات مختلف ہوں گے۔''

''جو تنظیمیں جنگ کے دوران بنیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ان تنظیموں نے عورتوں کے لیئے روائتی قسم کے کاموں تدریس، نرسنگ وغیرہ پر ہی زور دیا یا آپ کی نظر میں ان تنظیموں نے لبنانی عورت کی زندگی میں نئے باب کی نوید دی ہے؟''

یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی کیونکہ ہماری پقری تاریخ میں جب عالم عرب میں کوئی مسلہ پیش آیا۔ عورتیں بھی اس سے نمٹنے کیلئے باہر آ گئیں اور اُنہوں نے ہمیشہ زبردست کارنامے سرانجام دیئے۔ اس لئے جو کچھ ہو رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ کہا کہ ہمارا کلام صرف پڑھانا، نرسنگ اور بحرانی کیفیت میں مدد کو پہنچنا ہی نہیں ہمیں درحقیقت اپنے ملک کے مقدر کا فیصلہ کرنے میں واجب حصہ ملنا چاہیے۔ ہمیں ایک ایسے مختلف سیاسی نظام کی ضرورت ہے جس میں عورتوں کو ایک بنیادی رول ادا کرنے کی اجازت ہو۔ عورتوں کو صرف زخمیوں کی مرہم پٹی اور بھوکوں کو کھانا ہی نہیں کھلانا۔ ہماری مائیں اور دادیاں تعلیم نہ ہونے کے باوجود یہی کچھ بہ احسن طریق سے کرتی تھیں۔ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ ہوسکتا ہے مرد پورے ملک کیلئے ایک غلط پالیسی بنا دیں اگر لبنان کی کابینہ میں تین یا چار عورتیں بھی شامل ہوتیں تو ممکن تھا کہ لبنان خون ریز خانہ جنگی سے بچ جاتا۔ اس لئے کہ عورتیں خون کی پیاسی نہیں ہوتیں وہ ڈرتی ہیں کہ ان کے بچوں میں پر آفت نہ آ جائے۔ اس لئے میں خاتون سیاستدانوں کو ترجیح دیتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ عورتوں کو بھی سیاسی میدان میں اپنے تمام پر بھی دیکھوں۔ میں اس کا زیادہ دیر

تک انتظار نہیں کرسکتی آج کل عورتیں بے گھروں کے دکھ میں شریک ہوکر اور زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے گھروں میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونے نہیں بیٹھتیں۔ وہ اسرائیل کا مقابلہ بھی کر رہی ہیں اور اپنی سرزمین کو آزاد کرانے کیلئے بہادری سے لڑ رہی ہیں۔ وہ اس نظام کو چیلنج کر رہی جوان کی حیثیت کا اعتراف نہیں کرتا۔ جنوب کی عورت لبنان کا وقار بن گئی ہے۔

لبنانی عورت کو اپنے مقصد کے حصول کیلئے کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔ ہم تمام لبنانی اور عرب عورتوں سے کہتے رہے ہیں کہ وہ جنوب والوں کی مالی مدد کریں، اسرائیل سے جنگ کیلئے انہیں ایک ایک پیسہ چاہیے۔ ہم لبنانی عورتیں چاہتی ہیں کہ ہماری آواز سنی جائے۔ اس پر لبیک کہی جائے اور ہمیں یقین ہے کہ ان تمام عورتوں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوں گی جنہیں اپنے بچوں سے پیار ہے مگر مسئلہ آج کل یہ ہے کہ سچ کی بجائے ذرائع ابلاغ زیادہ اہم ہیں۔ تمام امریکی اور مغربی ذرائع ابلاغ اسرائیل کے ہاتھ میں ہیں جب کہ ہماری ان تک رسائی ہی نہیں۔ اسی سبب مغرب میں ان کے حمائتی زیادہ ہیں۔ جہاں تک امریکیوں کا معاملہ ہے ممکن ہے انہیں یہاں کے انسانی معاملات کا زیادہ علم ہو مگر لبنان کی صورت حال ان کی سمجھ میں نہیں آتی نہ ہی وہ مجموعی طور پر عرب اور فلسطین کے مسئلوں کے بارے میں کچھ زیادہ جانتے ہیں۔ وہ اسرائیل کو ہم پر حملے کرنے کیلئے مالی امداد دیتے ہیں مگر انہیں اسرائیل اور لبنان کے تنازعہ کا کچھ علم نہیں۔ اسرائیل ان سے کہتا ہے کہ لبنان جاہلوں اور قرون وسطیٰ کے پس ماندہ لوگوں کا ملک ہے اور امریکی یہ بات مان لیتے ہیں۔ امریکیوں کا ایک یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر وہ کسی شئے کے بارے میں کچھ جان لیتے ہیں تو پھر حالات مختلف ہوجانے کے باوجود اسی پر قائم رہتے ہیں اپنی رائے تبدیل نہیں کرتے۔ وہ دُنیا میں ایسی قوم ہے جو آسانی سے بیوقوف بنائی جاسکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ لوگ جو کہتے ہیں اسے سننا بھی چاہیے اور اس پر غور بھی کرنا چاہیے مگر اسرائیل امریکیوں سے جو کچھ کہتا ہے وہ اس پر غور ہی نہیں کرتے بلکہ اسے حتمی سچ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔''

''آپ کے نزدیک جنگ کے دوران لبنانی عورت کا کردار کس طرح تبدیل ہوا؟''

جنگ سے پہلے عورتوں کی تنظیمیں حاجت مندوں معذوروں اور غریبوں کی مدد کیا کرتی تھیں۔ مگر جنگ کے دنوں میں اُنہوں نے ایک قومی کردار بھی اختیار کرلیا۔ اُنہوں نے مردوں کو ترغیب دینی شروع کی کہ وہ جائیں دُشمن سے لڑیں اور ملک کی حفاظت کریں۔ ان تنظیموں میں عورتوں کو سکھایا جاتا تھا کہ وہ کس طور اپنے مردوں اور بچوں میں محاذ جنگ پر جانے کیلئے جوش

خروش پیدا کریں تا کہ وہ پوری طاقت سے اپنے دُشمن اسرائیل کا مقابلہ کر کے اپنے گھروں اور دھرتی کو بچائیں۔ عورتوں کو اپنی صلاحیتوں کا بہتر شعور حاصل ہوا اور انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ملکی زندگی میں قومی کردار بھی ادا کر سکتی ہیں۔ اب ان کا مسئلہ صرف بچوں کو کھلانا پلانا اور گھر کو صاف ستھرا رکھنا نہیں رہا تھا وہ لڑنا بھی جانتی تھیں وہ اسرائیل پر یہ بھی ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ اس کیلئے اب یہ بات آسان نہیں رہے گی کہ جب جی چاہا اور جہاں چاہا وہاں بمباری کر دی یا توپوں سے گولے برسا دیئے۔ جنگ کے دوران میں نے دیکھا کہ عورتوں میں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کس بل تھا۔ غالباً ان پر پہلی مرتبہ یہ منکشف ہو رہا تھا کہ انہیں لبنان سے کس قدر محبت ہے اور یہ کہ ضرورت پڑے تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتیں۔ آپ کہہ سکتی ہیں۔ کہ جنگ نے لبنانی عورتوں کی صلاحیت اور جوہر کی خبر دی ہے میں نے ایک بھی ایسی عورت نہیں دیکھی جو بین کر رہی ہو یا حرف شکائت لب پر لائی ہو۔ وہ سب کی سب انتہائی پر جوش اور پر عزم پائی گئیں۔ میں ان کو دیکھتی تھی اور خود سے کہتی تھی۔ ''اوہ میرے اللہ، یہ زوردار مخلوق پہلے کہاں تھی؟ اپنے گھروں میں دس دس گھنٹے صرف برتن چمکانے اور فرش صاف کرنے پر صرف کر دیا کرتی تھیں۔ یہ کتنا افسوس ناک ضیاع ہے۔'' جنگ نے مجھے یہ ایمان دیا کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ حوصلہ مند، پر عزم اور ارادے کی پکی ہیں۔

''بہت سی عرب عورتیں آپ کی ہم خیال ہیں کہ عورتوں کی صلاحیتیں مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں اس کے باوجود زندگی میں انہیں ہمیشہ تابع مہمل بنا کر رکھا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں ایسا کیوں ہے؟''

''مرد ہمیشہ عورتوں کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو دماغ نہیں ان کے جذبات کنٹرول کرتے ہیں۔ مرد ایسی عورتوں کو پسند کرتے ہیں جو ان سے کمزور ہوں۔ ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا گیا کہ تمہارے خیال میں مرد خاندان کا سربراہ ہے؟ میں نے کہا یقیناً ہے۔ اگر وہ کمزور بھی ہے تو عورت کو اسے مضبوط ہونے کا احساس دلانا چاہیے کیونکہ عورتیں خود تگڑے مردوں کو پسند کرتی ہیں۔ مرد کو گھر کا سربراہ ضرور بنائیں مگر عورت بھی اتنی مضبوط ہونی چاہیے جو اس سربراہ کو صحیح سمت کی طرف موڑ سکے۔ کسی عورت کو یہ نہیں سمجھنا اور بھولنا چاہیے کہ وہ اپنے مرد کا سایہ ہے۔ اسے اس کا ساتھی اور دوست ہونا چاہیے۔ میں اپنے آپ کو مرد سے کم تر کیوں سمجھوں؟ میں اس کی ماں، بیوی اور بیٹی ہوں اور ہو سکتا ہے میں اس سے بہتر شہری ہوں۔ تو پھر میں اس کے

برابر کیوں نہیں ہوسکتی؟ عورت اور مرد دونوں کو ایک دوسرے کی عزت کرنی چاہیے، ایک دوسرے سے مشورہ کرنا چاہیے ایک دوسرے کی رائے لینی چاہیے۔ عورت کا یہ کام نہیں کہ وہ خاوند کی ہر بات پر ''جی ہاں جی ہاں'' کہتی رہے یہ فعل اگر کیا بھی جاتا ہے تو بے خبری کے عالم میں نہ کہ تابعداری میں۔ ہم جتنا اپنی آواز بلند کریں گی اور اپنے نظریات کی اشاعت کریں گی مرد ہمیں معمول کی شئے سمجھنے کی بجائے ہماری عزت کریں گے۔ مشرق میں عورتیں اس لئے مصائب کا شکار ہوئیں کہ اگر ایک عورت ناکام ہوتی ہے یا اس سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو ساری عورتوں کو موردالزام قرار دیا جاتا ہے۔ ایک بے سلیقہ یا جاہل عورت کو تمام عورتوں کے جاہل اور بے سلیقہ ہونے کے دعوے کے ثبوت کے طور پیش کیا جاتا ہے۔ اس اُصول کا مردوں پر اطلاق نہیں کیا جاتا۔ اگر ایک مرد غلط کام کرتا ہے تو اس کو سب سے الگ کر کے برافرد قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی بدنامی صرف اس کی ذات تک محدود رہتی ہیں، یہ داغ دوسرے مردوں کو نہیں لگایا جاتا۔ یہ ہے مشرق دہشت مغرب میں اگر ایک عورت کچھ کرتی ہے تو اس کے لیے ساری عورتوں کو وہی الزام نہیں دیا جاتا ہم اپنی عورتوں سے ہمہ وقت یہ کہتے رہتے ہیں ''یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ یہ عیب ہے یہ حرام ہے'' غرضیکہ ہم ہر شئے کے بارے میں ہدایت نامہ دے کر انہیں پریشان کر دیتے ہیں ''لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کل تک جو عیب تھا وہ اب عیب نہیں رہا۔ اہل مشرق کی حیثیت میں ہم سماج کی رائے کو زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں چونکہ عورتوں کو خاندانوں کی عزت وقار اور شرم تصور کیا جاتا ہے اس لئے قیمت بھی انہیں ہی زیادہ چکانی پڑتی ہے۔ تاہم میں یہ کہتی چلوں کہ ہمارے بہت سے پڑھے لکھے مرد اب ان روائتی باتوں کو چھوڑ چکے ہیں، جن میں عورتوں کو جنس، خوبصورتی یا سامان آرائش کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا۔ جب آپ باہر آ کر مردوں کے ساتھ کام کریں آپ اچھا اور واجب الاحترام لباس پہنے ہوں اور آپ اپنا کام انتہائی سنجیدگی سے کریں تو پھر مرد آپ کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے مرد ایک پڑھی لکھی انتہائی باخبر عورت کے معترف ہوتے ہیں۔

لبنان کے قانون کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ عورت اور مرد سے ایک سا سلوک کرتا ہے؟''

''عورتوں کے ضمن میں بعض فرقوں نے غیر منصفانہ قوانین بنا رکھے ہیں مگر مجموعی طور پر لبنان کا قانون عورت اور مرد میں زیادہ تفریق نہیں کرتا۔ مسلمانون کی مثال لیں میرے خیال

میں قرآن کا رویہ عورتوں کے بارے میں بڑا منصفانہ ہے ہمیں یہ بات یقینی بنانا ہوگی کہ قوانین میں بھی قرآن کی جھلک نظر آئے۔ یہ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن میں ایک عورت مرد کے سر بسر برابر تو نہیں مگر عورت کے حقوق تفصیل سے واضح کئے گئے ہیں اسے خاندان یا خاوند سے الگ تجارت کرنے اور ذاتی جائیداد رکھنے کا بھی حق ہے۔ لبنان کے عیسائیوں میں عورتوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو ملے ہوئے ہیں۔ عیسائی عورت کو ورثے میں بھائی کے برابر حصہ ملتا ہے جبکہ مسلمان عورت کو بھائی کے مقابلے میں نصف حصہ ملتا ہے۔

''میں آج بھی اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ عالم عرب میں قوانین اور ضابطوں میں تبدیلیوں کی بجائے مردوں کے عورتوں کے بارے میں رویوں میں تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ یہ سچ ہے کہ قانون بے خطا نہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ مردوں کا رویہ ان قوانین کے مقابلے میں زیادہ خراب ہے۔ میں عرب عورت کو بھی الزام دیتی ہوں کہ اس نے لوگوں کے عقائد و آرا کو تبدیل کرنے کیلئے زیادہ کوشش نہیں کی۔ عرب عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کو راہ راست پر لائے۔ اسے مردوں کو سکھانا چاہیے کہ وہ اپنی ماؤں بہنوں وغیرہ کی عزت کریں۔ عرب عورت کو چاہیے کہ اپنے بیٹے کو باور کرائے کہ وہ اپنی بہن کے برابر ہے نہ کم نہ زیادہ ..... لڑکے کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کیوں کیا جائے؟ اسے لڑکی کے مقابلے میں مختلف انداز میں کیوں پالا جائے؟ عورتیں لڑکیوں کو چھوڑ کر لڑکوں کو پڑھاتی تھیں کیونکہ لڑکے کام کرتے تھے اور خاندان کیلئے پیسے کماتے تھے ..... مگر اب تو عورتیں بھی کام کرتی ہیں اور پیسے کماتی ہیں اپنے خاندان کیلئے۔ تو اب فرق کہاں رہ گیا۔ اب تو عورتوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کیونکہ عورتوں کو ایک نئی نسل کو بھی تعلیم دینا ہے۔ میری رائے میں ہمیں پہلے اپنی عزت کرنی چاہیے اپنے بارے میں اچھی رائے بنانی چاہیے تاکہ مرد بھی ہمارے بارے میں بہتر سوچ رکھیں اور ہماری عزت کریں۔ اب میرا بیٹا اپنی بہن کی طرح مجھے بتا کر جاتا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ میں دونوں میں کسی کو بھی باہر جانے سے نہیں روکتی مگر یہ توقع کرتی ہوں کہ وہ جا کہاں رہے ہیں اور دونوں مجھے یہ بات بتا کر جاتے ہیں۔ اگر ایک عورت خود ہی تبدیلی نہ لائے تو پھر قانون تو ایسا کوئی نہیں جو مرد کا عورت کے بارے میں خود بخود تبدیل کر دے۔ ہم مردوں کو جنم دیتی ہیں، ہم انہیں پالتی پوستی ہیں۔ ہم انہیں وہ کچھ بناتی ہیں جو وہ ہیں ..... تو پھر ہم انہیں عورتوں کے برابر مناسب رویہ رکھنے کی تربیت کیوں نہیں دے سکتیں؟ اگر ہم اپنے آپ یہ نہیں کر سکتیں تو کوئی دوسرا ہمارے لئے کچھ بھی

نہیں کرے گا؟

''بعض ایسی عورتوں بھی ہیں جو اپنے خاوندوں کی توجہ چاہنے کیلئے بچوں جیسی باتیں کرتی ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی چیز پر خاوندوں کی رائے مانگتی ہیں۔ یہ رویہ انہیں مسلسل تابعداری میں رکھے گا اور ان کے بارے میں اس روائتی تصور کو مضبوط رکھے گا کہ عورت کمزور جنس ہے'' صلاح مشورہ اور بحث مباحثہ اور آنکھیں موند کر سر تسلیم خم کرنے میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً میں نیویارک میں اقوام متحدہ کی عمارت میں دھرنا دینے والی تحریک میں حصہ لینے کیلئے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے خاوند سے یہ نہیں کہا کہ جانم تم مجھے جانے دو گے۔ مجھ سے محبت کرتے ہوناں، مجھے جانے کی اجازت دے دو گے؟ نہیں۔ اس قسم کی کوئی واہیات بات نہیں کی۔ میں نے اس سے کہا'' آپ جانتے ہو کہ جنوبی علاقے کی خواتین کا اقوام متحدہ میں ایک وفد بھیجا جا رہا ہے اُنہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟'' ..... اُنہوں نے کہا اس پر بات کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس پر بات کی اور میں جا بھی رہی ہوں۔ آپ شاید اپنے ہمسائے سے بھی بات کر سکتے ہیں دوست کی رائے لے سکتے ہیں۔ اسی طرح خاوند سے بھی اس کی رائے لینے میں کوئی حرج نہیں مگر جو عورتیں برابری کی سطح پر ایک ساتھی کی حیثیت سے بات کرنے کی بجائے اپنے آپ کو مردوں کے تابع بنا لیتی ہیں۔ تو ان کا رویہ غلط ہے۔

''آپ لبنانی عورت کی آزادی کی جدوجہد کا مغربی عورتوں کی جدوجہد سے کس طور تقابل کرتی ہیں؟''

''لبنانی عورت کو دُنیا کے کسی خطے کی عورت سے رشک نہیں کرنا چاہیے۔ میں شمالی اور جنوبی دونوں امریکاؤں میں رہی ہوں۔ میں نے عورتوں کے بارے میں وہاں مختلف رویے دیکھے۔ میں آج بھی چاہتی ہوں کہ عورتیں اپنا وقار عزت اور احترام قائم رکھیں، ہماری بہت خوبصورت روایات ہیں اور ہمیں انہیں برقرار رکھنا چاہیے۔ جسم اور ذہن دونوں کی صفائی بہت اعلیٰ شئے ہے۔ عورت کی عزت انمول ہے اگر وہ ساری دُنیا کو جیت لے مگر عزت ہار جائے تو پھر وہ یقیناً اچھے مقام پر نظر نہیں آئے گی۔ مغربی عورت اپنا خاندان گنوا بیٹھی ہے۔ میں اپنے گھرانے سے پیار کرتی ہوں میں اپنے گھر کی خوشی دُنیا کی قیمتی سے قیمتی شئے کے عوض نہیں دے سکتی۔ جب ہم سب لوگ کھانا کھانے میز پر بیٹھتے ہیں تو اس وقت میں اپنے آپ کو دُنیا کی انتہائی خوش قسمت عورت تصور کرتی ہوں۔ مغربی عورت گم ہو گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسے مشرقی عورت کے مقابلے

میں زیادہ نجی آزادی حاصل ہے وہ خود کو زیادہ آسائش میں محسوس کرتی ہے۔ اسے آرام تفریح کا وقت بھی مل جاتا ہے جو ہمیں شاید ہی حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود لگتا ہے کہ ہم مغربی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ خوش ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ ہم اپنے گھروں اور اپنے خاندانوں کو بہت کچھ دے سکتی ہیں۔ اپنے عمر بھر کے تجربات سے اپنے بچوں کو زندگی کے مختلف مراحل پر آشنا کرانا ایک خوبصورت عمل ہے۔ پھر جب آپ کے بچے بیاہے جائیں تو آپ کے نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں ہوتے ہیں۔ میرے آٹھ نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں ہیں میں ان کی صحت اور نشوونما میں دلچسپی لیتی ہوں۔ اس میں ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے جس کا متبادل کوئی نہیں اور مغرب کو اسی کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک دُنیا میں کوئی بھی عورت لبنان کی عورت سے بہتر نہیں ہے۔ اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو ہم ساری دُنیا کیلئے ایک قابل رشک ملک تھے لبنان حقیقت میں ایک مہذب اور خوشحال ملک ہے۔ لبنانی مرد بیوی کا وفادار ہے اور بیوی خاوند کی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہیں چاہتی کہ لبنانی عورت دُنیا کی کسی بھی عورت کی نقالی کرے۔ گاندھی نے کہا ہے۔ ''ہم اپنی کھڑکیاں ساری دُنیا پر کھول دیتے ہیں مگر خود درون در رہنا پسند کرتے ہیں۔'' ہمارا ایک اپنا اخلاق، روایات اور طرز فکر ہے، ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارا یہ کردار قائم رہے نہ کہ نقالی کی فضول کوششوں میں ہم یہ کردار ہی کھو بیٹھیں۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم گھریلو زندگی کو بہت ہی عزیز جانتے ہیں اور ہمیں آئندہ بھی اسے عزیز تر رکھنا چاہیے۔''

MashalBooks.org

فلسطین: عورتوں کا طریق بقا

تاریخی لحاظ سے فلسطین عالم عرب کا دل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی اعتبار سے مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں کا مرکز بھی۔ شام لبنان اور اردن کی طرح اس پر صدیوں سے عثمانیوں کی حکمرانی تھی۔ پھر پہلی جنگ عظیم کے بعد اسے برطانیہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ برطانیہ 1948ء تک اس پر حکمران رہا۔

صدی کے آغاز میں پہلے مشرقی یورپ میں یہودیوں کی نسل کشی اور پھر ہٹلر کی یہود دُشمن پالیسیوں کے سبب یہودیوں کے ریلے کے ریلے جائز اور ناجائز طریقہ سے فلسطین میں آ بسے، آنے والے یہودیوں نے برطانی بحریہ کے آئینی حصار کو بھی توڑ کر رکھ دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ نے سفارش کی کہ فلسطین کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس سفارش کے مطابق پچپن فی صد رقبہ یہودی آبادکاروں کو دینا ٹھہرا۔ مگر اس سے قبل کہ مشترکہ مسئلے کا کوئی متفقہ حل تلاش کیا جاتا صیہونی سرگرم کارکنوں نے جو برطانوی حکومت کے خلاف گوریلا جنگ لڑتے رہے تھے فلسطین کے بارے میں یہودی ریاست ہونے کا اعلان کر دیا۔

ہزاروں بلکہ لاکھوں عرب بے گھر ہو کر ہجرت کر گئے۔ فلسطینی عوام کا کوئی ملک نہ رہا وہ اردن، لبنان، شام، مصر اور تیونس میں رہ رہے ہیں۔ جیسے جیسے حکومتیں اور ان کے اتحاد بدلتے رہے اس کا اثر فلسطینی باشندوں پر پڑتا رہا جو مزید ملکوں میں پناہ کی تلاش میں جاتے رہے۔ 1967ء میں مغربی کنارے (اردن) سنیائی (مصر) اور جولان کی پہاڑیوں (شام) پر حملے کے بعد مغربی کنارے اور غزہ میں فلسطینیوں کو مجبوراً یہودیوں کے زیر دست رہنا پڑا جس نے ان علاقوں میں یہودی آبادکاروں کی قلعہ بند بستیاں بھی بسا دیں۔ (1987ء میں ایسی ایک سو بیس بستیاں بس چکی تھیں) 1973ء کی جنگ کے بعد اسرائیل کے مقبوضہ علاقے میں مزید علاقہ شامل کر لیا گیا (لیوی ایشکول جس عظیم اسرائیل کی بات کرتا ہے اس کی حدود متعین نہیں نہ

نقشہ ہے) 1982ء میں لبنان پر حملہ کر کے اسرائیل نے جنوبی لبنان کے علاقے پر بھی قبضہ کرلیا یہ وہ علاقہ ہے جس میں فلسطینیوں کے سب سے زیادہ کیمپ تھے۔ آج چودہ لاکھ فلسطینی باشندے اپنی ہی سرزمین پر غیروں کے محکوم بن کر رہ رہے ہیں جبکہ پندرہ لاکھ فلسطینیوں کو یہ علاقہ بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بعض فلسطینی گذشتہ چالیس برسوں سے مہاجر کیمپوں میں پھنسے بیٹھے ہیں یا وہ دوسرے عرب ممالک یا یورپی اور امریکی ممالک کی طرف ہجرت کر گئے ہیں۔

1948ء میں دارئیسین میں 256 فلسطینیوں کا قتل عام ہوا تھا اس وقت سے لیکر 1987ء تک طلبا کو دبانے کیلئے کئے گئے کشت وخون تک ایک پوری تاریخ ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس اثنا میں فلسطینی عورتوں اور مردوں میں تعلیم غیر معمولی حد تک عام ہوئی۔ مغربی کنارے، غزہ اور دوسرے مہاجر کیمپوں میں بچوں نے پڑھائی کی، پھر انہیں غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم کیلئے بھجوایا گیا باہر جانے والوں نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم کیلئے سرمایہ فراہم کیا۔ عام خیال ہے کہ غلامی اور افلاس سے بچنے کا واحد روشن راستہ تعلیم ہے۔ یہ پالیسی لڑکوں لڑکیوں دونوں کیلئے تھی اس لئے دوسرے عرب ممالک کے مقابلے میں فلسطینی عورتیں زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔ اور یہ بھی تعجب کی بات نہیں کی مشرقی یروشلم کی بیرزیت یونیورسٹی کے ہنگاموں میں بھی اور غزہ اور مغربی کنارے میں۔ سکولوں کے بچوں کی یہودیوں پر سنگ باری میں لڑکیاں اور عورتیں بھی برابر حصہ لیتی ہیں۔

عورتوں کا طریق بقا

فلسطین کا نام پہلی بار 1967ء میں ایک خاص اور واضح مفہوم کے ساتھ میرے ذہن پر ثبت ہوا۔ ہم نے خبریں سنیں کہ اسرائیل نے امریکہ سے حاصل کردہ جہازوں کے ذریعے شام اور مصر پر بمباری کر کے جنگ چھیڑ دی ہے۔ اس جنگ میں ہمارے گاؤں کے تین آدمی جاں بحق ہوئے انکے جنازوں کو کسی ہیرو کی طرح خوش آمدید کہا گیا۔ ان کی ماؤں نے ناچ ناچ کر وہ نغمے اور ترانے گائے۔ جن میں ان کی بہادری اور ارض وطن کی خاطر جاں قربان کرنے کے جذبے کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے دیکھا کہ موت آنے پر بین نہیں ڈالے گئے بلکہ خوشیاں منائی گئیں اور پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اولاً عرب ہوں اور

بعد میں شامی۔ بلاشبہ میرا خون اس وقت کھول اُٹھا جب میں نے مغربی کنارے اور غزہ سے فلسطینیوں کو اور جولان کی پہاڑیوں سے شامیوں کو نکالنے اور ان کے گھر بار چھوڑنے کے قصے سنے تو مجھے شدید غم وغصہ تھا مگر مجھے اس بات کا اندازہ نہیں فلسطینیوں پر کیسے کیسے کوہ غم ٹوٹ پڑے تھے اور ان میں سے زیادہ پر عذاب فلسطینی عورتوں کے حصے میں آئے تھے۔

بیس برس بعد میں دمشق میں نے ان فلسطینی مہاجر عورتوں سے قصے سنے جنہیں اسرائیل نے مغربی کنارے اور دوسرے مقبوضہ علاقوں سے نکال دیا تھا اور جن کے شوہر اپنے حقوق کے حصول کیلئے جدوجہد کی پاداش میں اسرائیلی جیل خانوں میں بند تھے۔ ان میں سے بعض مرد تو بیس بیس برس سے قید میں تھے اور یہ عورتیں ان کی رہائی کے انتظار کے عذاب سہ رہی تھیں۔ ان کی سرگذشت سے فلسطینیوں کے المیے کے اب تک پوشیدہ رہنے والے پہلو بھی سامنے آئے۔ ان عورتوں کو جب بھی اپنا گھر، سکول اور خاندان کو چھوڑنا پڑتا ہے اور پھر کسی دوسری جگہ آباد ہونا پڑتا ہے تو ان کے کندھوں پر بوجھ اور بڑھ جاتا ہے۔ یہ عورتیں تو پہلے ہی مردوں کے تعصب کی شکار رہی ہیں ستم بالائے ستم یہ کہ بے گھری، بربادی اور جنگ جیسے عذاب بھی انہیں سہنے پڑے۔

1987ء میں مغربی کنارے سے ایک فلسطینی خاتون مریم پہلی بار دمشق آئی۔ اسے دیکھ کر مجھے زندگی میں پہلی بار حیرت ہوئی وہ بالکل میری ماں جیسی تھی۔ ہر چند مریم میری ماں سے بیس برس چھوٹی تھی مگر وہی گول براؤن چہرا جسم کے اوپر لمبی شاندار گردن۔ میری ماں کی طرح ہی اس کی براؤن آنکھوں اور بڑے بڑے ہاتھوں میں ایک خاص قسم کا دھاگہ بندھا رہتا جب بھی اس کی آنکھوں میں جذبات جھانکنے لگتے وہ ہاتھوں کو اسی طور دبانے لگتی۔ چہرے کے دونوں طرف گہرے براؤن بال سیدھے سادھے انداز میں پڑے اس کی گردن کی لمبائی کو اور نمایاں کرتے تھے۔ باقی بالوں کو سفید سکارف نے ڈھانپ رکھا تھا اور اسکارف گردن کے پیچھے بندھا اس کی چوڑی پشت اور کندھوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی پرسکون، نرم اور آنے والے کا استقبال کرنے والی مسکراہٹ بھی میری ماں جیسی تھی۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو چند لمحوں کیلئے میری زبان کو بھی چپ لگ گئی۔ وہ میری ماں کی صورت مجسم ہو کر میرے سامنے آئی تھی۔ میں اس کے جلوے سے اپنی آنکھیں، روح اور دل ودماغ کو بھر لینا چاہتی تھی۔ مجھے ماں کی کمی کا شدید احساس تھا اس کے چہرے کے تمام تر تاثرات اس کی ایک ایک حرکت اس کی مسکراہٹ، آواز اور سب سے زیادہ اس کی بولتی ہوئی آنکھوں سے میں اپنی ماں کی کمی شدت سے محسوس کرتی۔ میں

اپنی ماں کے اس ہیولے سے بے تابانہ لپٹ جانا چاہتی تھی میں اسے تھام کر اس کی خوشبو سونگھنا چاہتی تھی یہ جاننے کیلئے کہ کیا اس کے جسم سے بھی میری ماں کی سی خوبصورت خوشبو اُٹھتی ہے اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گئی پریشان ہوگئی اور شدید پریشانی میرے چہرے سے بھی ظاہر ہونے لگی جسے دیکھ کر مریم بھی پریشان ہوئی کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔اور پھر میں نے ایک ناگوار خاموشی کو توڑنے کیلئے فوراً کہا'' آپ میری ماں سے کتنی ملتی ہیں۔''

'' آپ کی ماں کہاں ہیں'' مریم نے غالباً یہ تصور کرتے ہوئے کہ میری ماں مرچکی ہے بڑے اداس لہجے میں آہستگی سے سوال کیا۔

''حمس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہیں'' میں نے جواب دیا اور پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا منہ کو پکا بنایا اور یہ کہہ کر موضوع تبدیل کردیا۔'' شوہر کی رہائی پر بہت بہت مبارک ہو۔ جب میں نے آپ کا چرچا سنا تو خیال ہوا کہ آپ جو اپنے خاوند کا سیاسی مقدر بنانے میں حصہ دار ہیں، کتنی عظیم عورت ہیں۔ پھر میں نے اس کے خاوند کو مخاطب کر کے کہا'' آپ کا کیا خیال ہے، کیا یہ عظیم خاتون نہیں؟''

'' بالکل ہیں'' اس نے اپنی طرف زیادہ توجہ مرکوز کرنے کے انداز میں جواب دیا'' فیصلہ مریم کا تھا کہ وہ میرا انتظار کرے گی۔ میں نے اسے انتظار کرنے کیلئے نہیں کہا تھا۔

جب مجھے چالیس برس قید کی سزا ہوئی تو میں نے اس سے کہا تھا'' یہ تاحیات قید کی سزا ہے تم میرے ساتھ یہ سزا نہ کاٹو، تم شادی کر کے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گذارو، میں تمہیں فوراً طلاق دینے کیلئے تیار ہوں۔ اس نے طلاق لینے سے انکار کردیا اور کہا'' تم اپنے وطن کے لئے زندگی قربان کررہے ہو میں تمہاری خاطر زندگی قربان کردوں گی یوں ہوا اور پھر پچیس برس قید کاٹنے کے بعد اسرائیل اور پی ایل او میں قیدیوں کے تبادلے میں مجھے رہائی مل گئی۔ لیکن یہ پچیس برس کا انتظار اور اس دوران دو بچیوں کی پرورش کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میرے لئے تو اس کا وجود بذات خود ایک زندہ رابطہ تھا اس کے ذریعے ہی آزاد دُنیا بلکہ زندگی کی خوشیوں سے میرا قابل رشک رابطہ تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے میرا آدھا بوجھ اُٹھالیا اس طرح وہ ایک بڑے انعام کی مستحق بن چکی ہے۔''

میں اس کی بیوی سے انٹرویو کرنے آئی تھی نہ عورتوں کی آزادی کے بارے میں اس کا لیکچر سننے کیلئے (سب مردوں کو عورتوں کی آزادی اور نجات کے بارے میں لیکچر دینے کا شوق ہوتا

ہے) اس لئے میں چاہتی تھی کہ یہ لیکچر جلد ختم ہو چنانچہ میں نے اس کی بیوی سے مخاطب ہو کر پوچھا آپ کے کتنے بچے ہیں؟ اس سے پیشتر کہ مریم بولتی اس کے خاوند نے میری طرف رخ کیا اور بڑی مروت سے کہا ''میری خواہش تھی کہ آپ سے مزید باتیں کرتا مگر مجھے واپس کام پر جانے کی جلدی ہے اُمید ہے برا نہیں مانیں گی۔''

جیسے ہی وہ باہر گیا اور دروازہ بند ہوا تو مریم نے سکھ کا سانس لیا، ذرا پھیل کر آرام سے بیٹھ گئی کچھ چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے۔ وہ مسکرائی، آنکھوں میں چمک آئی جبکہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ رگڑنا شروع کیا گویا کچھ لفظوں کو دوہرا رہی ہو۔ اس کے منہ نے ہتھیلیوں کے رابطے پر فوراً جواب دیا ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگی..... ''میری دو بچیاں ہیں ہاں صرف دو بچیاں۔ دونوں شادی کے بعد دو سال کی مدت میں پیدا ہوئی تھیں۔ چھوٹی صرف چار دن کی تھی جب اس کا باپ گرفتار کر لیا گیا۔''

''آپ چاہتی ہیں اور بچہ بھی ہو؟''

ہاں، بڑی خواہش ہے، اب میں چالیس کی ہوگئی ہوں اور بچہ جننے کی اہلیت کیلئے زیادہ وقت بھی نہیں رہ گیا۔ اس لئے میں تو فوراً ایک بچہ چاہتی ہوں مگر میرا خاوند نہیں چاہتا۔ کہتا ہے کہ اب وہ ذہنی طور پر ایک اور بچہ قبول نہیں کر سکتا۔''

میں نے سوچا کہ اس عورت نے پچیس ..... طویل پچیس برس تک اس مرد کا انتظار کیا مگر وہی مرد اب بچے کے بارے میں اس کی بالکل فطری اور سیدھی سادی خواہش ماننے کیلئے تیار نہیں ہے دریں اثنا مریم کی ایک دوست بھی گفتگو میں شریک ہو چکی تھی کہنے لگی۔ ''میں اسے کل ایک گائینا کالوجسٹ کے پاس لے گئی تھی اس نے کہا کہ اس میں بچہ جننے کی صلاحیت ہے اس کے خاوند کو دیکھنے کی ضرورت ہے مگر اس کے خاوند نے انکار کر دیا ہے۔''

مجھے اچانک یاد آیا میں نے ایک بار پڑھا تھا کہ فلسطینی مرد جب اسرائیل سے رہا ہو کر آتے ہیں تو وہ ناکارہ (بنجر) ہو چکے ہوتے ہیں۔ میں نے دونوں عورتوں سے اپنے خدشہ کا اظہار کیا اور مریم کی دوست کہنے لگتا ہے کہ اس کے خاوند کو بھی سٹیریلائز کرنے کے لئے دوائیں کھلا دی گئی ہیں اسے پتہ ہے کہ اب وہ کبھی بچہ پیدا نہیں کر سکے گا اس لئے اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کی تک سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ بچوں کو پیار کرتا ہے اس لئے یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ اب وہ نہیں چاہتا کہ اس کا ایک اور بچہ ہو۔''

MashalBooks.org

''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ مجھے سچ بات بتائے'' مریم نے کہا ''اگر مجھے پتہ چل جائے کہ وہ بچے پیدا کرنے کے اہل نہیں رہا تو کوئی بات نہیں، بس اس طرح میرے ذہن کو سکون مل جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ پر اعتماد کرے اور اس پر جو کچھ گذری ہے وہ سب کچھ مجھے بتا دے۔ اسے شاید یہ خدشہ ہو کہ جب میں اصل بات سنوں گی تو مرد کی حیثیت سے اس سے محبت کرنا یا اس کی عزت کرنا چھوڑ دوں گی۔ یہ اس کی کتنی بڑی غلطی ہے۔'' اس کے اندر شدید غصہ، نفرت، تکلیف اور گہرا درد تھا جسے اس کے سرخ رنگ نے چھپا رکھا تھا کیونکہ وہ میرے سامنے ان کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''مجھے آپ کے احساسات کا اندازہ ہے، میں نے ہمدردی کے طور پر کہا ''اگر چہ آپ جس تجربے سے گذری ہیں مجھے براہ راست اس کا اندازہ نہیں مگر میری بھی ماں ہے، بڑی بہنیں ہیں ہمسائیاں بھی ہیں اور سہیلیاں بھی۔ میں نے ان کی زندگیوں کو قریب سے دیکھا اور اب جو کچھ کہہ رہی ہیں مجھے اس کا بخوبی اندازہ ہے۔ کرم کریں مجھ پر اعتماد کریں اور مجھے اپنی سچی سچی سرگذشت سنائیں۔ آپ یہ سمجھیں کہ اپنی اس بہن سے بات کر رہی ہیں جس کے دل میں آپ کا خیال بھی ہے اور ہمدردی بھی اور جس کا واحد مقصد صرف یہ ہے کہ عرب خواتین کے حالات بہتر بنائے جائیں۔''

اس نے آنکھیں چرائیں، اس کے دونوں لب بڑی نرمی سے ایک دوسرے سے مل گئے، اور اس کی ہتھیلیاں بڑی دیر تک خاموشی سے ایک دوسرے سے رگڑتی رہیں جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں نے مریم کو جو پیش کش کی تھی اس نے قبول کر لی ہے۔ اور پھر اس نے اپنی داستاں شروع کر دی، ''میرا تعلق مغربی کنارے کے گاؤں بیت جن سے ہے۔ میرے والدین کاشتکار تھے، گندم، جو بویا اور زیتون اگایا کرتے تھے۔ ہم جو کچھ کماتے تھے۔ اس سے زندگی گذارتے تھے۔ ہم نو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ لڑکے کی خواہش میں میرے والد نے چار شادیاں کی تھیں پھر بھی لڑکا ایک ہی پیدا ہوا۔ اور وہ بھی میری ماں کے بطن سے۔ دوسری تین بیویوں سے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے والد نے ان کو طلاق دے دی۔ چالیس برس کی عمر میں میری والدہ کا اور اس کے فوراً بعد ہی میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ آٹھ بہنوں اور ایک بھائی کی پرورش کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی کیونکہ میں سب سے بڑی تھی۔ والدین کے انتقال سے تھوڑا عرصہ پہلے جب میری عمر تیرہ سال کی تھی میری شادی کر دی گئی، میرا خاوند میرا رشتہ دار تھا۔

''کیا شادی سے پہلے آپ کو علم تھا کہ آپ کا خاوند پی ایل او کا ممبر ہے؟''

''نہیں شادی کے دو برس بعد مجھے اس نے بتایا کہ وہ پی ایل او سے وابستہ ہے۔ اور وہ میرے بارے میں خود کو مجرم بھی گردانتا ہے کیونکہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ مگر اب میں کر بھی کیا سکتی تھی میرے ہاں ایک بچی بھی ہو چکی تھی اور دوسری پیٹ میں تھی اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی وہ پکڑا گیا، اسے چالیس برس قید کی سزا ہوئی۔

''جب آپ نے قید کے بارے میں سنا تو فوری طور پر کیا کرنے کا سوچا؟''

''میں کیا کر سکتی تھی؟ میں نے جانا یہی میرا مقدر ہے اور اسے ہی صبر شکر کر کے قبول کرنا ہے۔''

''آپ نے نہیں سوچا کہ اس سے طلاق لیکر اپنی مرضی کے مطابق زندگی گذاریں؟ یعنی دوسری شادی کر لیں؟''

''نہیں، انصاف کی بات ہے میرے شوہر نے خود ہی طلاق دینے کی پیش کش کی اور بارہا کہا کہ میں اس کا انتظار نہ کروں، اور یہ کہ مجھے اپنی زندگی اپنے طور پر بتانے کا حق ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اگر ہماری شادی کو صرف ایک ہی دن ہوا ہوتا تو ان حالات میں میں پھر بھی تمہیں نہ چھوڑتی نہ کسی اور سے شادی کرتی .....وہ میرا شوہر تھا اور ہر حالت میں مجھے اس کا ساتھ دینا تھا۔''

''اگر وہ آپ کی جگہ ہوتا تو آپ کے خیال میں وہ بھی ایسا ہی فیصلہ کرتا؟''

''میرے خیال میں وہ ایسا نہ کرتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو وہ ایک سال بھی میرا انتظار نہ کرتا جبکہ میں نے پچیس برس تک اس کا انتظار کیا۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں نے اس لئے انتظار کیا کہ میں کوئی اور راستہ اختیار کر بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ میرا فیصلہ تھا اور اس کا تعلق کسی صورت بھی میرے شوہر کے ساتھ نہیں ہے۔ میں نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ وہ اگر میری جگہ پر ہوتا تو کیا فیصلہ کرتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں اسے اور اس کے حالات کو نظر انداز نہ کر سکی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اسے چھوڑ جاتی ہوں شادی کر لیتی ہوں تو اس کا اس پر کیا اثر پڑے گا شاید اس طرح وہ ہل کر رہ جاتا۔ میں آپ کو سچ بتاتی ہوں کہ مجھے اس وقت تک اس سے کوئی محبت نہیں تھی کیونکہ ابھی تو میں اسے پوری طرح جاننے بھی نہیں پائی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ جینے مرنے کا فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ میں اس کی پوری پوری حمائت کرنا چاہتی تھی اور

اس کا محبت سے کوئی تعلق نہیں تھا، مجھے بچیوں کا بھی افسوس تھا میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو گھر لے آؤں جوان بچیوں پر حکم چلائے ان بے چاریوں کیلئے یہی المیہ تھا کہ ان کا باپ نہیں۔ میں نے اس خیال سے اپنی زندگی ان کے لئے وقف کر دی کہ انہیں باپ کی محبت اور شفقت سے محرومی کا احساس بھی نہ ہونے دوں۔ اور اگر میں شادی کا فیصلہ کر لیتی تو پھر یہ جو کچھ میں نے کیا ہے ہرگز نہ کر پاتی۔

''آپ کتنے عرصہ بعد خاوند سے ملتی تھیں؟''

''کبھی ہفتے میں ایک بار کبھی پندرھواڑے اور بعض اوقات نو نو ماہ گذر جاتے تھے ملاقات کو''

''آپ کا مطلب ہے باقاعدگی سے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی؟''

''نہیں ہفتے میں ایک بار ملاقات کی اجازت تھی۔ مگر سارا خاندان اس سے ملاقات کا خواہش مند ہوتا، اس کے قریبی عزیز ہی تقریباً تیس کے قریب ہیں۔ ہم باری باری اس سے ملتے تھے اس طرح مجھے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا۔ ہر ہفتے اس بات پر جھگڑا ہوتا تھا کہ اب کے کون اسے ملنے جائے گا۔ اس کی ماں اس کے بھائیوں سے کہتی ''اس کی بیوی کو بھی لے جاؤ، وہ اس کی کمی کو بہت محسوس کرتی ہے اس سے ملنا چاہتی ہے۔ جب میں یہ بات سنتی تو مجھے دکھ ہوتا اور میں ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی۔ میرا خاوند بھی اس بات پر ناراض ہوتا کہ میں اس کے بھائیوں کے ساتھ اسے کیوں ملنے نہیں آتی، مگر اسے کیا خبر کہ میں کس عذاب سے گذر رہی تھی مجھے اس کے بھائیوں کے ساتھ جانے سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ کہتے ہمیں عورت کو ساتھ لے کر چلنا اچھا نہیں لگتا۔ جیسے میں کوئی جانور یا کیڑا مکوڑا ہوں۔ چنانچہ جب کبھی ان کی باری آتی میں اس لئے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی کہ وہ کہیں عورت کی حیثیت سے میری بے عزتی نہ کریں۔

''بعض اوقات میں اس لئے بھی نہیں جا سکتی تھی کہ میرے پاس گاڑی کا کرایہ نہ ہوتا۔ پھر اگر وہاں جیل تک آدمی پہنچ بھی جائے تو اسے ملنا ایک اور عذاب تھا۔ اکثر یوں ہوتا کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور ان ٹوٹی پھوٹی، ویران، اور کیچڑ والی سڑکوں پر جانے کیلئے تیار ہی نہ ہوتا اس لئے ہمیں چار گھنٹے تک پیدل سفر کرنا پڑتا چنانچہ وہاں صبح سات بجے تک پہنچنے کیلئے ہمیں رات دو بجے گھر سے نکلنا پڑتا۔ صرف چند منٹ اس سے ملاقات کی خاطر اور ایسی ملاقات جس میں اس کی آواز تک

بمشکل سنائی دیتی۔ دوہری رکاوٹ والی کھڑکیوں کے اس طرف سے قیدی اپنے ملنے والوں تک اپنی آواز پہنچانے کیلئے چیختے چلاتے اور بعض اوقات ..... واویلا کرتے تا کہ ان کی آواز عزیزوں تک پہنچ جائے۔ یہ شور شور محشر ہوتا اور منظر اعصاب شکن، بیس افراد کو بیک وقت اپنے قیدیوں سے ملنے کیلئے بھیجا جاتا ان کے ساتھ ان کے بچے بھی ہوتے۔ چنانچہ نفسانفسی ہوتی شور غوغا ہوتا۔ کئی ملاقاتوں پر تو یوں بھی ہوا کہ میں اس سے جو کچھ کہنا چاہتی تھی اس میں سے ایک لفظ بھی اس کے کانوں تک نہ پہنچا سکی۔ یہ ملاقات صرف بیس منٹ کی ہوتی جس کے بعد واپسی کا سفر بارش ژالہ باری اور برفباری کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی کرنا پڑتا یوں وہاں ان اونچی اونچی ناقابل تسخیر دیواروں کے اندر مکروہ جیل تک جانے کے لیے جس فضا میں سفر شروع ہوتا واپسی کا سفر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتا۔ تمہیں سچ بتاتی ہوں کہ میں ان تکلیف دہ اور مشکل سالوں کے واقعات کی ٹیپ بار بار اپنے ذہن میں نہیں چلانا چاہتی میں اس زمانے میں تھکی ہوئی بیزار اور بیمار سی رہتی اور جی سانس لینے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔

''میں نے وہ زمانہ اپنے آپ پر جبر کر کے گذارا، خود کو مارنے کا جذبہ میرے اندر موجود رہتا۔ میری بیٹیاں اکثر روتی رہتیں وہ نہ کسی پارٹی میں نہ کسی شادی یا میلے ٹھیلے میں جانے کیلئے تیار ہوتیں۔ نہ تو ڈھنگ سے ہنستی مسکراتیں اور نہ ہی باتیں کرتیں۔ میں نے بہت کشٹ کاٹ کر معلوم کیا کہ انہیں باپ کے نام پر شرم آتی ہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا باپ جرائم پیشہ ہے جب وہ ذرا بڑی ہوئیں تب میں نے انہیں سمجھایا کہ ان کا باپ مجرم نہیں بلکہ سیاسی قیدی ہے اور اس میں شرم والی کوئی بات نہیں بلکہ انہیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے کیونکہ ان کا باپ گاؤں کے ہر فرد کو باعزت طریقے سے زندگی گذارنے کا حق دلانے کیلئے اپنی زندگی کی قربانی دے رہا ہے۔ جب وہ اور بڑی ہوئیں تب ان کا رویہ تبدیل ہوا اُنہوں نے معمول کی زندگی گزارنی شروع کیا اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی شروع کیا۔

''میاں کی قید کے دنوں میں آپ کیلئے سب سے زیادہ تکلیف دہ فکر کیا تھی؟''

''اس کے جیل میں ہونے کے باعث جب کبھی میں اس سے ملنے جاتی تو واپسی پر مجھے یوں لگتا کہ دُنیا ایک گیند ہے جس کے ہر طرف گہری تاریکی ہی تاریکی ہے اور کسی سورج کی کوئی کرن اس تاریکی کا سینہ نہیں پھاڑ سکے گی۔ جیل میں ملاقات کے بعد ہر مرتبہ یہ کہانیاں شروع ہو جاتیں کہ کس طرح قیدیوں کو ٹھڈے مارے جاتے ہیں ان پر تشدد کیا جاتا ہے اور انہیں پیٹا جاتا

ہے۔ جب میں اپنے شوہر پر گذرنے والی مصیبت کا سنتی تو میں اپنے آپ کو بہت ہی بے بس محسوس کرتی۔ان دونوں میری زندگی ایسی تھی جیسے میں مسلسل بے ہوشی کے عالم میں ہوں وقفے وقفے سے مجھے ہوش آتا جس میں میں اپنے وسائل اکٹھے کرتی۔ زندہ رہنے کیلئے قوت ارادی کا استعمال کرتی اور اپنی بچیوں کو خوش رکھنے کے لیے ادھر ادھر لوگوں سے بات چیت اور میل ملاپ کر لیتی۔

''اسرائیلی قبضے کے دنوں میں آپ زندگی کیسے گذارتے تھے؟''

''سچی بات یہ ہے کہ ہم نے ان کی موجودگی کو زیادہ محسوس نہیں کیا۔ ہمارا گاؤں دور دراز واقع تھا۔ ہم کاشتکاری میں مصروف رہے اور اسی پر گذر بسر کرتے رہے۔ ہفتے دو ہفتے کے بعد کوئی اسرائیلی گشتی گاڑی دکھائی پڑتی مگر ہم ریڈیو پر سن سکتے اور ٹیلی ویژن پر وہ کچھ دیکھ سکتے تھے جو ظلم اسرائیلی فلسطینیوں پر شہروں میں ڈھاتے تھے۔ جہاں تک ہمارا تعلق تھا ہمیں وہ اس وقت قابل نفرت لگتے جب وہ اپنی من مرضی کے مطابق ہماری زمینوں اور جائدادوں پر قبضہ کر لیتے۔ ہمارے زمینوں کے باغ اجاڑ دیتے وہاں پر اونچی اونچی عمارتیں بنا لیتے یا اپنی کاروں کی خاطر بڑی بڑی سڑکیں بنا لیتے۔ وہ ہم سے نہ کوئی مشورہ کرتے نہ ہماری رضامندی لیتے نہ ہی معاوضے میں ایک دھیلہ تک دیتے۔ انہیں زمین کا جو حصہ پسند آتا اس پر قبضہ کر لیتے اور جس طور چاہتے اسے استعمال کرتے اور ہم میں سے کسی کو ان سے کچھ پوچھنے کی جرات ہی نہ ہوتی۔ جس زمین پر ہم نسل در نسل خوش وخرم بستے رہے اس پر ان کا غاصبانہ قبضہ یا اس کی ضبطی بہت ہی تکلیف دہ گئی۔

''جب آپ کو بتایا گیا کہ آپ کا خاوند رہا کر دیا گیا تو آپ کو کیسا لگا؟''

''مجھے یقین ہی نہیں آیا اس کے رشتہ دار اور گاؤں والے ناچ گا رہے تھے مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کہ اب وہ ان آہنی سلاخوں کے اس پار نہیں رہا جنہوں نے میرے دل و دماغ کو بالکل بیکار کر دیا تھا۔''

''اب آپ کیسا محسوس کرتی ہیں؟''

''ستائیس برس کی ازدواجی زندگی میں ایک برس سے زیادہ عرصہ اس کے قریب نہیں رہی اس لئے مجھے یوں لگتا ہے کہ میری شادی اب پکی عمر چالیس برس میں آ کر ہوئی ہے درحقیقت میں خود کو بھی ایک اجنبی سی عجیب سی شئے لگتی ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ عجب سا خلا ہے۔''

MashalBooks.org

''آپ کے گاؤں میں عورتیں کیا کرتی ہیں؟''

''ہمارے گاؤں میں مرد اور عورتیں دونوں کھیتوں میں کام کرتے ہیں وہ گندم، جو، موٹھ اور زیتون اگاتے ہیں اور ہمیشہ سے عورتیں مردوں کے مقابلے میں دوگنا مشقت کرتی ہیں انہیں فصلیں اگانے کا زیادہ تجربہ ہے مگر نہ تو فصلوں کے بارے میں ان کی کوئی سنی جاتی ہے نہ گھریلو معاملے میں کوئی پوچھتا ہے۔ عورتیں صبح سویرے اُٹھتی ہیں سورج نکلنے سے پہلے گھر کا سارا کام کر لیتی ہیں پھر کھیتوں میں جا کر گوڈی کرنے، درخت لگانے یا بیجائی اور پانی لگانے کا کام کرتی ہیں۔ سہ پہر کے وقت مرد گاؤں کے قہوہ خانے میں یا کسی کے گھر مجلس جماتے ہیں شراب یا قہوہ پیتے ہیں، حقہ گڑگڑاتے ہیں اور پبلک گیمیں کھیلتے ہیں جبکہ عین اس وقت عورتیں کھیت میں کام کر رہی ہوتی ہیں۔

''آپ مغربی کنارے پر آباد فلسطینی عورتوں کا شام میں آباد فلسطینی عورتوں سے تقابل کرتی ہیں؟''

''شام میں مقیم فلسطینی عورتیں ہمارے مقابلے میں بہت بہتر حالات میں رہتی ہیں، خوشحال ہیں، لگتا ہے کہ ہم نے ان تمام پرانی بری عادات کو زندہ رکھا ہے جن سے عورت کی تذلیل ہوتی ہے۔ غالباً ہماری عرب شناخت قائم رکھنے کیلئے ہمارے مردوں نے ہماری عادات، روایات، اخلاقیات اور دوسری اقدار کو جامد کر کے ہم پر مسلط کر رکھا ہے چنانچہ اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں میں رہنے والے عربوں نے اس ڈر سے سب برے اور اچھے پہلوؤں کو قائم رکھا ہے کہ ہم انہیں کھو کر کہیں اپنی شناخت بھی نہ کھو دیں۔ ہم انتہائی غیر یقینی مگر جامد فضا میں سانس لیتے ہیں لیکن شام اور دوسرے عرب ممالک میں آباد فلسطینی روشن خیال بھی ہیں اور تبدیلیوں کو قبول کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کی نشوونما فطری طریقہ سے ہوتی ہے وہ زندگی کے بارے میں نئی عادات، روایات اور نئے افکار قبول کرنے سے نہیں ڈرتے۔ اسی لئے مغربی کنارے کی خواتین کے مقابلے میں وہ فلسطینی خواتین زیادہ بہتر پوزیشن میں ہیں جو مقبوضہ علاقوں سے باہر آباد ہیں، مقبوضہ علاقوں کی خواتین کو اب بھی فرسودہ افکار و رسومات کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

اس سارے عرصے میں مریم کی دوست ہمیں سنگترے کھلاتی اور کافی پلاتی رہی اور ہماری گفتگو پر بھی توجہ دیتی رہی چنانچہ میں نے اس سے پوچھا ''آپ فلسطینی ہیں مگر پیدا شام ہوئی

ہیں'' آپ میں اور مریم میں کیا شئے مشترک ہے؟ آپ کی زندگی میں کیا خاص شئے ہے جسے فلسطین سے منسوب کیا جاسکتا ہے؟'' یہ احساس کہ میرے گھر اور میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کیا گیا ہے۔'' اس نے غصے سے جواب دیا جس سے اس کے گال گلابی ہو گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا تعلق کہیں دور بہت دور کسی شئے سے ہے۔ بیرون فلسطین آباد تمام فلسطینیوں کو ملک کی آزادی کی جدوجہد جوڑتی ہے۔ ہماری تاریخ ایک ہے ہمارے مسائل ایک سے ہیں اور سب سے بڑھ کر ہمارے اغراض ومقاصد مشترک ہیں۔''

مجھے وہ خاتون پر لطف اور پر جوش نظر آئی اس لئے اس سے ایک سوال کرنے کا فیصلہ کیا'' آپ فلسطینی عورت کا مقابلہ شام کی عورت سے کس طرح کرتی ہیں۔''

''شام کی عورت کو کم از کم وہ مشکلات درپیش نہیں جو فلسطینی عورت کے مقابل ہیں۔ بہر طور ایک خوش وخرم فلسطینی عورت بھی اپنی زندگی میں ہمیشہ ایک خلا محسوس کرتی ہے۔ اپنی سرزمین سے دور ہونے اپنی قبروں سے اور اپنے والدین کی جڑوں سے دور ہونے کا خلا۔ اس بنا پر وہ دھیان رکھتی ہے کہ اس کے اردگرد دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس پڑھنے لکھنے اور دور بینی کی بھی ضرورت ہے۔ شام کی عورت کے مسائل کم ہیں کیونکہ اس کے ساتھ بے گھری کا کوئی احساس نہیں لگا ہوا۔ اسے صرف یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کس طور اپنا معیار زندگی بہتر بنائے اس کے مقابلے میں فلسطینی عورت کا ایک نصب العین ہے جس کیلئے اس کے جسم وجان بھی حوصلہ اور ہمت بھی اور زندگی بھی وقف ہوتی ہے۔ میں اپنی ہمسایہ شامی خواتین اور اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے یہ باتیں پیش کر رہی ہوں۔ میری ہمسائیاں صرف یہ سوچتی ہیں کہ انہیں کیا پہننا ہے اور کہاں جانا ہے۔ فلسطینی عورت اچھا کپڑا پہننا چاہتی ہے اور تفریح کیلئے باہر جانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ صرف ایک فکر میں غلطاں رہتی ہے۔ اپنی سرزمین کی آزادی کی طرف دھیان ..... ہم اس جدوجہد میں اپنے خاوندوں کی مدد بھی کرتی ہیں اور یہ بھی سوچتی ہیں کہ کس طرح سرزمین فلسطین سے غاصبانہ قبضہ ختم کرایا جائے۔

اس عورت کی پر جوش اور ناقدانہ انداز گفتگو سے لگتا تھا کہ مریم بھی متاثر ہوئی ہے کہ وہ زیادہ بے تکلفی اور سیدھے سبھاؤ سے اپنی بات کرے۔ موقع غنیمت جان کر میں نے وہ سوال کر دیا جو خاصی دیر سے میرے ذہن میں منڈلا رہا تھا۔'' کیا آپ کے گاؤں میں عورتوں کی بھی ایسی ہی کیفیت تھی جیسی آپ کی تھی؟''

MashalBooks.org

''نہیں'' مریم نے کہا''اس سارے علاقے میں صرف میرا شوہر ہی پکڑا گیا تھا۔ میرے گاؤں کی عورتوں نے بڑا زور لگایا کہ میں کہیں اور شادی کرلوں، بچے پیدا کروں اور من مرضی کے مطابق زندگی گذاروں میرا جی کبھی نہیں مانا۔ میں جانتی تھی کہ میرے اپنے شوہر کے بارے میں جس قسم کے جذبات ہیں ان کے ہوتے ہوئے میں کہیں بھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ اگر میں اپنا یہ رویہ ترک کر دیتی تو دراصل اپنے آپ کے ساتھ بد دیانتی کی مرتکب ہوتی۔''

''آپ کے گاؤں سے واحد آپ کا شوہر پکڑا گیا کیا اس بنا پر آپ اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس کرتی تھیں؟''

نہیں یوں نہیں .....اس طرح میرے دل میں اپنے خاوند کی مدد کرنے کا خیال اور بھی بڑھ جاتا۔ پورے گاؤں میں صرف ایک وہ تھا جو آزمائش سے گذر رہا تھا اس بنا پر بھی میں محسوس کرتی کہ میں اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے شدت سے یہ احساس رہا کہ مجھے اس کا ساتھ دینا چاہیے اور غیر مشروط امداد دینی چاہیے۔ جب کبھی میں جیل جاتی تو وہاں جا کر احساس ہوتا کہ صرف میں ہی ایک عورت نہیں بلکہ اور بھی بہت عورتیں تھیں جنہیں میرے جیسے ہی مشکل مرحلے درپیش تھے۔ میں اور وہ عورتیں ایک ہی کشتی میں سوار تھیں چنانچہ ہم فوراً ہی آپس میں باتیں شروع کر دیتیں دکھ سکھ بیان کرنے سے سکون سا حاصل ہوتا۔ مجھے اپنے خاوند پر بہت ترس آتا اور پھر مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میں اور کچھ نہیں کر سکتی تو اس کی رہائی تک اس کا انتظار کروں گی اور میرا یہ رویہ اسے احساس دلائے گا کہ اس کا وجود میرے لئے بہت کچھ ہے۔ جب میں دوسروں سے قیدیوں کے ناگفتہ حالات سنتی کہ کس طرح انہیں چھوٹے چھوٹے سیلوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اور اسرائیلی کس طرح ان پر گیس چھوڑتے اور گولیاں چلاتے ہیں تو یہ سن سن کر میں دہل جایا کرتی۔

''آپ نے باپ کی غیر موجودگی میں دو بیٹیوں کو پالا پوسا مگر جس طور اور جن حالات میں انہیں بڑا کیا وہ آپ کیلئے حوصلہ شکن تو نہیں تھے؟ یا آپ خوش تھیں کہ اس طور وہ زیادہ آزادانہ طریق سے پل رہی ہیں''

''میں نے کبھی ان کی زندگی میں دخل نہیں دیا نہ انہیں یہ احساس ہونے دیا ہے کہ ان کا باپ پاس نہیں ہے انہیں باپ کی شفقت اور محبت سے محرومی کے احساس کی بجائے میں نے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں بہترین کپڑے، بہترین خوراک اور زندگی کی بہتر

آسائشیں دیں اور ان کی ان سہیلیوں کے مقابلے میں جن کے ماں باپ دونوں زندہ تھے .....اب میں یہ چاہوں گی کہ وہ خود انتخاب کریں کہ وہ کس طور زندگی کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے کبھی مردوں، عورتوں یا بچوں پر کوئی شئے ٹھونسنے کو پسند نہیں کیا۔ میں فرد کی پیدائشی آزادی پر یقین رکھتی ہوں۔ جہاں تک میری بیٹیوں کا تعلق ہے میں چاہوں گی کہ وہ پہلے ڈگری لیں تعلیم مکمل کریں کام سیکھیں اور شادی سے پہلے ملازمت بھی کرلیں۔ ازدواجی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہر عورت کا ایک اپنا آزادانہ ذریعہ آمدنی ہونا چاہیے۔ مجھ پر جو کچھ گذری ہے اس سے میں نے سبق حاصل کیا ہے کہ خاوند کی آمدنی پر انحصار کرنا عورت کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کیونکہ جب بھی ایسے شوہروں کو کچھ ہوجاتا ہے ان کی عورتوں کو بدترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''چالیس برس کی عمر میں آپ اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟''

''میں یہ سوچ کر بہت پریشان ہوتی ہوں کہ ماضی میں اتنی ہولناک زندگی گذارنے کے بعد میں اب بھی اپنے خاوند اور بیٹیوں کے ساتھ پرمسرت زندگی نہیں گذار سکتی۔ میری بیٹیاں اب بھی مغربی کنارے پر ہیں۔ ان کے پاس پاسپورٹ نہیں اس لئے وہ یہاں میرے اور میرے شوہر کے پاس نہیں آسکتیں اس طرح صعوبتیں تو جاری ہیں صرف ان کی شکل بدل گئی ہے۔ جب کبھی میں حالات کی شکائت کرتی میرے رشتہ دار سرگوشیاں شروع کردیتے۔ ''بڑی بے چین ہورہی ہے اسے مرد کی ضرورت ہے۔ وہ شادی کرنا چاہتی ہے'' جب مجھے شکایت زمانہ کرنے پر یہ کچھ سننا پڑتا تو پھر میں سینے سے غبار ہی نہیں نکالتی تھی بلکہ سب اداسیوں اور زیادتیوں کو دل کے اندر دفن کردیا کرتی تھی۔ چنانچہ بیزاری یا سستی کی صورت میں کہہ دیا کرتی کہ بیمار ہوں یا سر درد ہے۔ رشتہ داروں کے رویے کے برعکس گاؤں کی عورتیں مجھ پر بڑی مہربان تھیں وہ میرے مسائل سمجھتی بھی تھیں اور میری بڑی مدد بھی کرتی تھیں۔ لیکن جب میں عورتوں کو اچھے کپڑے پہن کر بچوں اور خاوندوں کے ساتھ باہر جاتے دیکھتی تو پھر اپنی کم نصیبی بڑا دکھ دیتی۔ جب مجھے دلہن کا لباس پہنایا گیا اور میری سہیلیوں نے میرا من پسند گیت گانا شروع کیا تو میں نے خوشی سے چیخنا شروع کردیا، میرا خیال تھا کہ اُنہوں نے یہ لباس پہنا کر اور میرا پسندیدہ گیت سنا کر مجھے خوش کیا ہے۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اس روز ایسے حسن سلوک کا مظاہرہ کیوں کررہی تھیں۔ اگر مجھے یہ بھی بتادیا جاتا کہ آج میری شادی ہے مجھے تب بھی یہ پتہ نہ چلتا کہ شادی کے دن کے معنی

کیا ہوتے ہیں؟''

جب مریم اپنی شادی والے دن کی یاداشت سنا رہی تھی اس کی ایک اور دوست دو بچے ایک ایک بازو پر اُٹھائے آن پہنچی جب ہم نے اسے بتایا کہ یہ گفتگو کس مقصد کیلئے ہو رہی ہے تو کہنے لگی کہ ادھر ایک اور فلسطینی عورت بھی ہے اور مجھے اس سے بھی بات کرنی چاہیے۔ اس عورت نے بھی سات سال تک اپنے قیدی شوہر کا انتظار کیا ہے۔ یہ عورت پڑھی لکھی تھی اور عورتوں کے حقوق کا شعور بھی رکھتی تھی۔ اس نے مغربی کنارے پر عورتوں کی تنظیموں اور سیاسی تنظیموں میں بھی کام کیا تھا اپنے اور شوہر کے رشتہ داروں سے الگ دو بچوں کے ساتھ آزادانہ طور رہتی تھی۔ اس نے سات سال کے عرصہ میں کشیدہ کاری بھی کی اور دست کاریاں بھی اور اتنا پیسہ کمایا کہ خاوند کے آنے سے پہلے ایک خوبصورت گھر بھی بنالیا۔ اس کے خاوند کی رہائی اور مغربی کنارے سے جلاوطنی کا حکم بیک وقت سنایا گیا۔ اسے بیوی کو ٹیلی فون بھی نہیں کرنے دیا گیا چنانچہ اس خاتون کا اپنے خاوند کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔ اس خاتون اور مریم میں فرق یہ تھا کہ وہ ایک قصبے میں رہائش پذیر تھی اور اسی باعث وہ روزگار کمانے کے اہل ہوئی جبکہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے کا مطلب ہے کہ کوئی بھی عورت اپنے آزدانہ وسائل پر زندگی نہیں گذار سکتی وہ عورت مریم کے مقابلے میں زیادہ متحرک اور باشعور بھی تھی.....

''مریم کی دوست نے جو کچھ کہا تھا مریم نے اس کی حمایت کی کہ گاؤں میں عورت آزدانہ طور پر نہیں رہ سکتی یہ ممکن ہی نہیں۔ وہاں تو یہ عالم ہے کہ اگر کوئی مرد پاس سے گذرتے ہوئے سلام کردے تو سارے گاؤں کو پتہ چل جائے گا اور وہ سوچ میں پڑ جائے گا کہ اس مشکوک سلام کے پس پردہ کیا ہونے والا ہے۔''

دوسری عورت کے بارے میں ایک ستم ظریفی بھی ہوئی تھی جب اس کا خاوند شام آیا اس نے اردن میں اپنے سالے کو ٹیلی فون کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ اس کی بہن اب اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اس عورت کے خاندان اس لئے بھی سخت ناراض ہوا کہ وہ دو مہینے مغربی کینارے اور اردن کا بار بار سفر کرتی رہی تا کہ شوہر کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے۔ گھر والے اس کے خاوند کی اس سے بے پرواہی سے سخت شاکی تھے اُنہوں نے غصے کی کیفیت میں اسے چلے جانے کیلئے کہا چنانچہ خاوند نے بیوی سے ملنے یا گفتگو کی کوئی کوشش کرنے کی بجائے ایک فلسطینی لڑکی سے منگنی کرلی۔ اس کی بیوی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے عزیزوں نے ٹیلی فون پر

اسے کیا کہا تھا تاہم اس نے سنا کہ وہ شام میں ہوگا تو وہ بچوں کو لے کر شام پہنچ گئی جہاں اسے پتہ چلا کہ اس کے شوہر نے ایسی فلسطینی لڑکی سے منگنی کر لی ہے جسے اس نے دیکھا تک نہیں۔

مریم نے آہ بھری گہرا سانس لیا اور کہا ''آپ اندازہ لگائیں کہ اس عورت کو سات برس کی مدت میں کس کس عذاب سے گذرنا پڑا ہوگا۔ وہ سات برسوں میں ہر ہفتے اسے ملنے جاتی۔ اس نے جیل میں خاوند سے ملاقات میں ایک بھی گلہ نہیں کیا۔ کئی بار رات کو پلٹتے وقت وہ برف پوش پہاڑیوں اور وادیوں میں راستہ بھول جاتی اور تنہائی میں اسے سوائے جما دینے والی سردی کے اور کوئی خیال نہ آتا۔ بعض اوقات اسے ننگے پاؤں چلنا پڑتا کیونکہ سردی سے اس کے پاؤں تین گنا تک سوج جاتے اور کوئی جوتا ان پاؤں میں پورا نہ آتا۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا تھا ''میرے اللہ وہ جانتا تھا کہ اس کی قید کے دوران اس کی بیوی نے کیا کیا' یہ جاننے کے باوجود رہائی کے فوراً بعد ہی اس نے ایک دوسری عورت کا کیسے سوچ لیا۔ وہ یہ تو کر سکتا تھا کہ اپنی بیوی کی طرف سے خود پوری بات سننے کا انتظار کر لیتا۔ ایک اور عورت سے منسوب ہونے سے پہلے بیوی سے یہ تو معلوم کر لیتا کہ وہ واقعی اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اس نے اپنی منگیتر کو چھوڑ دیا ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی بیوی یہ جاننے کے بعد کہ اس کے دل میں اس کی کیا قدر ہے کیسے اس کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ وہ یقیناً بڑے کھلے دل والی ہوگی۔ وہ ان دنوں وادی بقاع میں رہتا ہے۔ چنانچہ بیوی کی ملاقات مہینے میں صرف ایک بار ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر مریم کا خاوند واپس آ گیا اور گفتگو میں بھی شریک ہو گیا، اس نے پرزور انداز میں متذکرہ خاتون کو اس لئے نفیس اور اچھا کہا کہ اس نے خاوند اور بچوں پر بہت توجہ دی اور ہر طرح کی مشکلات کے باوجود خاندان کو اکٹھا رکھنے کا عزم کئے رکھا۔

یہی حقیقت ہے جس پر تمام مرد زور دیتے ہیں ''عورت کی ذاتی قربانی اپنی ذات کی نفی اور کریم النفسی۔ مگر ان صفات کے باوصف عورت کو جو کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے مرد لوگ اسے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک اور بظاہر سادہ سی عورت کے تاثرات سے مجھ پر دیرپا اثر پڑا، اس نے عمیق نظری اور وجدانی حس کی بنا پر موجودہ صورت میں فلسطینی عورت کو درپیش مشکل کا جس طور پر تعین کیا اس سے بہتر تجزیہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تجربہ کار اور باخبر سیاستدان بھی ایسا تجزیہ نہیں کر سکتا۔

دمشق کے الخیم مہاجر کیمپ میں فلسطینی خاتون ام محمود رہتی ہے۔ جب میں ایک فلسطینی

دوست کو ساتھ لے کہ اسے ملنے پہنچی تو ہمیں بتایا گیا کہ وہ خاوند کو لے کر عینک ساز کے پاس گئی ہیں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی، جلد آ جائے گی۔ چنانچہ ہم اس کے گھر کے اندر چلی گئیں ..... یہ نہ تو گھر تھا ارنہ ہی فلیٹ۔ عربی میں اسے دار کہا جاتا ہے جس میں ایک بہت بڑا کھلا صحن ہوتا ہے جس کے اردگرد دو یا تین کمرے ایک باورچی خانہ اور ایک غسل خانہ ہوتا ہے۔ صحن میں طرح طرح کے پودے تھے۔ وہاں بیٹھے لوگ دھوپ کا مزا بھی لے رہے تھے اور ذرا تاخیر سے ناشتے سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔

ابھی ہمیں وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک کھلتی رنگت اور چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھوں والی خاتون صحن میں آئی۔ اس نے بوڑھے اور کمزور مرد کو سہارا دے رکھا تھا۔

اس نے بڑا سا سکارف اور ہلکے سلیٹی رنگ کا چھوٹا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں بڑی تیز تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ عورت بڑی دبنگ اور جفاکش ہے۔

عربوں کی روائتی مہمان نوازی میں افلاس یا غربت کبھی رکاوٹ نہیں بنی۔ ابھی دس منٹ نہیں گذرے تھے کہ وہی عورت جو صحن میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی ایک بڑی ٹرے لئے آئی جس میں شاندار عربی ناشتہ سجا ہوا تھا۔ انڈے، زیتون، حمص، انار، فلافل، کلدوس، جام اور چائے مجھے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ اس لئے اتنا کچھ کھانے کے لیے ملنے پر ہم ان کی بڑی شکر گذار ہوئیں۔ ناشتہ کرتے ہوئے میری دوست نے اُم محمود کو اپنے آنے کی غرض بتائی اور کہا کہ اُم محمود کو فلسطینی عورت کی حیثیت سے جو تجربات ہوئے ہیں انہیں تحریر کر کے اپنی کتاب میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔ اُم محمود کا چہرہ روشن ہو گیا۔

''میرا تعلق کسان گھرانے سے ہے، میرا باپ اور میری ماں دونوں ہی کسان تھے۔ میں ماں باپ کے ساتھ کھیت پر کام کرتی تھی اور شام کو واپس آ کر گھر کا کام بھی کرتی تھی تن تنہا ..... فلسطین میں دستور کے مطابق مجھے بھی چودہ برس کی عمر میں ایک کزن سے بیاہ دیا گیا۔ ان دنوں لڑکیوں سے ان کی پسند بالکل نہیں پوچھی جاتی تھی نہ ہی وہ خود یہ توقع کرتی تھیں کہ ان سے ان کی مرضی معلوم کی جائے گی۔ اکثر لڑکیوں کی طرح میں بھی مطمئن تھی کہ میرے والدین نے یقیناً میرے لیے بہترین رشتہ تصور کیا ہوگا اور اب مجھے مستقبل کے بارے میں ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ پندرہ برس کی عمر میں پہلا بچہ پیدا ہوا وہ لڑکا تھا صرف ایک سال زندہ رہا۔ سولہ برس کی عمر میں دوسرا لڑکا محمود پیدا ہوا جو 1973ء میں الزعتار کے محاصرے میں مارا

گیا۔ اس کے دو ماہ بعد میرا دوسرا بچہ ہوا۔ پھر ہم نے اسرائیل کے مظالم اور ان کے ہاتھوں ہونے والی متوقع بے عزتی کے خوف کی بنا پر گاؤں چھوڑ دیا۔ اسرائیلیوں کے مظالم کا حال ہم نے دوسرے دیہات اور قصبات کے لوگوں سے سن رکھا تھا۔ میرا بچہ میرے بازوؤں میں تھا۔ میں کھیت میں شاندار زیتون چن رہی تھی جب گاؤں کے دو چھوٹے بھاگے بھاگے آئے اور کہنے لگے کہ سوفسانی اور صفاد اسرائیلیوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں اور اسرائیلی سپاہی قصبوں اور دیہات میں فلسطینیوں کو ہلاک کر رہے ہیں اور فلسطینی عورتوں اور لڑکیوں کی عصمت لوٹ رہے ہیں۔ ہم ڈر گئے کہیں ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ نہ ہو۔ اپنے مردوں کی زندگی اور عورتوں کی عزت بچانے کی آخری کوشش میں ہم بھاگ کر لبنان پہنچ گئے۔

''ہم لبنان میں بنت جوبل میں پہنچے جہاں تقریباً بیس دن رہے پھر طائرے کے برج شانال میں گئے جہاں سرما کے دن آئے۔ پھر ہم انجاہ چلے گئے جہاں گرمیاں گذاریں مگر وہاں سردیاں نہ گذار سکے کیونکہ برفباری بہت ہوتی تھی اور کیمپوں میں سردی سے بچاؤ مشکل تھا۔ پھر ہم (طرابلس کے قریب) نہرالبارد کے مہاجر کیمپ میں چلے گئے جہاں ہم پانچ برس تک رہے۔ پھر ہم اپنے خاندان کے پاس الرشیدیہ کے کیمپ میں آ گئے جو طائرے کے قریب ہے یہاں بھی ہم پانچ سال تک رہے۔ اس وقت میرے بچوں نے میٹرک کر لیا تھا اور یونیورسٹی میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ طائرے میں کوئی یونیورسٹی نہیں تھی اس لئے ہمیں بیروت کے قریب اتل الزعتر کے کیمپ میں چلے آئے اور بچوں کو یونیورسٹی میں داخل کرا دیا۔ میرا بڑا بیٹا عرب نیشنلسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔ جب پی ایل او کی بنیاد رکھی گئی تو وہ اس کے اولین ارکان میں سے تھا وہ پی ایل او میں رضا کار اافسر تھا۔ میرے بچے اگرچہ چھٹیوں میں کام کر کے کچھ پیسے کما لیتے تھے مگر واحد کفیل میرا خاوند تھا۔

مئی 1973ء میں لبنانی ملیشیا نے برج البرجنۃ اتل الزعتر صبرہ اور شاتلہ کے کیمپوں پر حملے شروع کر دیئے۔ ان دنوں میرا بیٹا پی ایل او میں ایک اہم عہدہ پر تھا۔ 8 مئی کو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے پاس بلا لیا اس وقت میرا سب سے چھوٹا بچہ جسے آپ نے ابھی سکول جاتے دیکھا ہے صرف پانچ برس کا تھا۔ میرے دوسرے بیٹے نے مرنے والے بھائی کی بندوق پکڑ لی اور اپنے بھائی کی جگہ لینے کے لیے پی ایل او میں شامل ہو گیا۔ بڑی جلدی ہی میرا یہ بیٹا فوجی افسر بن گیا مگر 1978ء میں اتل الزعتر کے دوسرے محاصرے میں مارا گیا۔

آپ نے ایک طرف بڑے بیٹے کی موت کی خبر سنی دوسری طرف انہیں دنوں ایک بچی کو جنم دیا اس صورت میں آپ کے تاثرات کیا تھے!

سچی بات یہ ہے کہ پہلے بیٹے کی موت تو برداشت کر لی تھی مگر دوسرے بیٹے کے مرنے کا بہت ہی دکھ ہوا۔ میرا بڑا بیٹا بڑی محبت شفقت والا اور سادہ مزاج تھا۔ جب میں نے اس کی موت کی خبر سنی اللہ نے مجھے ہمت اور صبر دیا۔ ہمارے ایک ہمسائے نے بتایا کہ اس نے میرے بیٹے کو ایک قریبی فوجی پوسٹ پر زخمی حالت میں دیکھا ہے۔ میں اور میری بہن پاگلوں کی طرح وہاں پہنچے وہ مجھ سے بھی آگے تھی۔ جب تک میں بہن کے پاس پہنچی اس نے کپڑے پھاڑ لئے تھے۔ چنانچہ میں نے اس کے ننگے سینے اور جسم کو ڈھانپنا شروع کیا۔ میں نے بیٹے کی تلاش کی مگر سپاہی اس کو دیکھنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے وہ میرے بارے میں زیادہ پریشان تھے کیونکہ میں نے صرف پانچ روز پہلے بچے کو جنم دیا تھا اُنہوں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے کہا مجھے چھوڑ دو اور بیٹے سے ملنے دو میں نے وعدہ کیا کہ میں نہ کوئی شور کروں گی نہ زبان سے ایک لفظ نکالوں گی اس پر اُنہوں نے مجھے اندر جانے دیا جہاں میرے بیٹے کی لاش پڑی تھی میں جھکی دونوں گالوں کا بوسہ لیا اور کہا ''میرے پیارے بیٹے مبارک ہو'' اتنا کہا تو اُنہوں نے مجھے بڑے زور سے بیٹے کی نعش سے الگ کیا میرے دل میں آگ لگ گئی۔ وہ میرے بیٹے کو دوسرے تمام شہیدوں کے ساتھ مسجد میں لے گئے۔ میں سپاہیوں کے پیچھے پیچھے گئی اور کہا کہ مجھے اپنے بیٹے کو گھر لے جانے دیں ورنہ میں اس کے اور دوسرے شہیدوں کے ساتھ مر جاؤں گی۔ کہنے لگے تم اپنے گھر میں اسی کے ساتھ مر جانا۔ جب میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں خاموش رہوں گی اور اُنہوں نے بھی میرا حوصلہ اور صبر دیکھا تو وہ مان گئے۔ وہ میرے بیٹے کی لاش گھر پہ چھوڑ گئے جو دفن کرنے سے پہلے تین دن اور تین راتیں ہمارے گھر میں رہی۔ اس کے بھائی بہنیں اور باپ غش کھا کھا کر اس پر گرے مگر میں انہیں حوصلہ دیتی انہیں صبر کی تلقین کرتی ان کی دلجوئی کرتی۔ تین دن تک اپنی جگہوں میں نعشیں پڑی رہیں کیونکہ گولیوں کی بوچھاڑ میں کوئی بھی قبر کھودنے کیلئے باہر جانے کی جرات نہیں کر رہا تھا، پھر ایک عارضی جنگ بندی ہوئی۔

میرے چھوٹے بیٹے کی موت سے دو ہفتے پہلے سے ہی میری اس کی ملاقات نہیں رہی تھی۔ میں پانچویں منزل کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ وہاں سے گذرتا، گلی والی گھنٹی بجاتا اور مجھے کہتا کہ میں بالکونی سے اس کو دیکھ لوں۔ میں ناراض ہوتی اسے برا بھلا کہتی کہ وہ میرے لئے پانچ منٹ کا

وقت بھی نہیں نکال سکتا۔ بہر طور جس روز وہ مارا گیا صبح صبح گھر آیا کہنے لگا میرے دوستوں کے لئے ناشتہ تیار کرو اور دوپہر کیلئے مٹر چاول پکا دو۔ اتل الزعتر کے محاصرے کو پندرہ دن ہو گئے تھے۔ یہ محاصرہ تین مہینے جاری رہا۔ اس روز وہ سہ پہر چار بجے تک واپس نہیں آیا۔ آیا تو میں نے اسے لنچ دیا مگر اس نے کھانے سے انکار کر دیا اور الوداع کہنے سے پہلے صرف چائے کا پیالہ اور وہ بھی بڑی جلدی میں پی سکا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا ''ماں خدا حافظ، شب بخیر، میں واپس نہیں آ رہا''..... اور بلاشک وہ پھر واپس نہیں آیا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ مجھ سے رخصت ہونے کے دس منٹ بعد ہی اسے گولی لگ گئی تھی۔ وہ اسے گھر لے آئے اور میں پاگل ہو گئی۔ میں نے اس کے کفن کو سینے سے لپٹا لیا اور ساری رات اس کے قریب بیٹھی رہی۔ کوئی مجھے یہاں سے نہیں اُٹھا سکا تھا۔ میرے حواس بالکل گم ہو چکے تھے۔ وہ صبر جو اس کے بڑے بھائی کی موت پر مجھ میں تھا اب کے وہ نہیں تھا۔ باہر جنگ جاری تھی اس لئے ہم اگلی رات تک اسے دفن نہیں کر سکے۔ ہم بہت قریبی جگہ پر گئے، ایک گڑھا سا کھودا اور اس میں اس کو امانتاً دفن کر دیا کہ جب حالات بہتر ہوں گے اسے مناسب قبرستان میں دفن کر دیں گے۔ مگر اس کو موقع ہی نہیں ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں زیادہ پریشان تھے جو زندہ تھے اور اس طرح مردوں کو بھلا بیٹھے تھے۔ روٹی کا ٹکڑا اور پینے کے لیے ایک گلاس پانی کا حاصل کرنا بھی کارے دارد۔ خوفناک قحط سے اس طرح بچے کے الزعتر کے نواح میں دال کے بہت بڑے سٹور کا پتہ چلا عورتیں فیکٹری کے اندر گھس گئیں اور وہاں سے دال لے آئیں جسے پیس کر اُنہوں نے روٹیاں پکائیں۔ ہمیں نہ گیس نہ بجلی نہ لکڑیاں میسر تھیں اس لئے روٹی پکانے کی خاطر ہم نے کھڑکیوں اور دروازوں کی چوکھٹیں تک اکھاڑ لیں۔ دال یا پانی لانے کے لیے ہمیں بارہا موت کے منہ میں جانا پڑتا۔ اگر پانی لانے کیلئے سو عورتیں جاتی تھیں تو ان میں سے بمشکل دس واپس آتی تھیں۔ اس کے باوجود عورتیں اپنے بچوں کی خاطر پانی لانے کے لے باہر جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھیں؟ وہ اپنے بچوں کو پیاس سے مرتا ہوا تو نہیں دیکھ سکتی تھیں ..... مگر یہ بھی ہوا، اپنے پیاروں کو پیاسا مرتا بھی دیکھنا پڑا، آپ یقین کریں لوگوں نے گندے پانی کی نالیاں کھولیں ان میں سے پانی لیتے، ابال کر استعمال کرتے؟ خود مجھے بھی یہ کچھ کرنا پڑا۔ اتل الزعتر میں یہ سب کچھ ہم پر بیت گیا محاصرے کے دوران ہمیں زندگی کی اُمید بھی نہ رہی چنانچہ ہم نے اپنی باقی ماندہ طاقت لڑنے والوں اور بچوں کو بچانے پر صرف کر دی

۔اب ہمیں موت کا کوئی خوف نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اپنے نقصانات کا حساب کرتا تھا۔ اگر ایک ماں پانی کا ایک جگ باہر لینے گئی ہے اور واپس نہیں آئی تو پھر اس کی بیٹی ماں کی تلاش کی بجائے پانی کا جگ لانے نکل پڑی اگر گھر میں پانی اور روٹی کے بغیر پڑے رہیں تو موت یقینی تھی اور اگر باہر جائیں تو ممکن ہے مر جائیں مگر زندہ بھی رہ سکتے ہیں تو پھر باہر جانے کا خطرہ ہی مول کیوں نہ لیا جائے۔ تو اتل الزعتر سے نکلنے سے ایک دن پہلے ہمیں بتایا گیا کہ ریڈ کراس والے دُشمن سے مذاکرات کر رہے ہیں کہ وہ ہمیں اس علاقے سے نکلنے کی مہلت دے دے۔ مگر اسی رات نو بجے کے قریب ابو عمار (یاسر عرفات) کو حکم ملا کہ جدھر نکل سکتے ہو نکل جاؤ اکثر مردوں نے کیمپ سے پہاڑوں کا رخ کیا۔ عورتیں اپنے خاوندوں، بھائیوں اور باپوں کی خاطر رونے لگیں جنہوں نے اپنی منزل طے کر لی تھی اور پہاڑوں کے راستے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر جب یہ آدھے ہی راستے تک گئے ہوں گے کہ دشمن نے انہیں تاک لیا اور ان پر گولہ باری کی۔ نوے فی صد مرد مارے گئے صرف چند بچے۔ انہی میں سے ایک نے بتایا کہ جب انہیں شدید پیاس لگتی تھی۔ وہ اپنا پیشاب پینے لگتے تھے۔ جب ہم اتل الزعتر نے نکلے تو اگلی صبح دو میل تک تو ہمیں انسانی گوشت کی موٹی تہہ کے اوپر چلنا پڑا ..... ہم سڑک پر نہیں لاشوں پر چلتے رہے تھے دکوانی کی چیک پوسٹ پر وہ ہمارے لئے کاریں لے کر آئے تھے۔ بارہ سال سے زائد عمر کے لڑکے کو اس کی ماں بہن یا بیوی سے زبردستی الگ کر کے چیک پوسٹ پر ذبح کر دیا گیا۔ اس کے بعد آگے جانے کیلئے صرف عورتیں اور بچے بچ گئے پھر عورتوں کو بھی کہیں لے جا کر قتل کر دیا گیا۔

میری پوتی پی ایل او میں ایک ذمہ دار عہدہ پر ہے وہ پناہ کی تلاش میں تھی کہ ایک نقاب پوش آدمی نے اسے اغوا کر لیا۔ اس کی ساتھیوں نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ پہاڑی راستے سے جائے مگر اس نے کہا کہ وہ والدہ اور بچوں کا ساتھ دینا چاہتی ہے۔ وہ اپنی چھوٹی بہنوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھی کہ ایک نقاب پوش مرد اسے کھینچ کر لے گیا اور کسی کو روکنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ پھر اس کو کسی نے زندہ نہیں دیکھا۔ میری بھانجی حنا ریڈ کراس میں کام کرتی تھی وہ اپنی ماں کا پتہ کرنے گئی وہاں دو مسلح سپاہیوں نے پکڑ کر اسے پاس کھڑی گاڑی میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک سپاہی کے منہ پر تھپڑ مارا اور بھاگ نکلی۔ دوسرا سپاہی اس کے پیچھے دوڑا اور ریوالور اس کی گردن پر داغ دیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ دونوں سپاہیوں نے اس کار میں ڈالا اور ہم نے آخر بار اسے اس حالت میں دیکھا۔

MashalBooks.org

میں تمہیں اور کیا کیا بتاؤں؟ اتل الزعتر کی یادیں اتنی ہولناک اور دردناک ہیں کہ انہیں دوہرانے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا۔ پورے نوے دن نہ گولہ باری رکی نہ بمباری۔ ہمیں اپنے بچوں کو دفن کرنے، سانس لینے تک کی مہلت نہیں دی گئی۔ بجلی اور پانی ایسے علاقے سے آتے تھے جو دُشمن کے قبضے میں تھا چنانچہ بجلی پانی کی فراہمی پہلے روز سے ہی بند کردی گئی۔ ہسپتالوں میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے وقت روشنی تک نہ تھی۔ جب ہم دال والی فیکٹری میں گئیں ہم نے وہاں موم بتیوں کا ڈھیر دیکھا۔ ہم وہ لے آئیں موم پگھلا کر دیوں میں اکٹھا کیا ان میں فیتہ لگایا اور ہسپتال میں آپریشن کرتے وقت جلا کر روشنی کیا کرتے۔ ہسپتالوں میں دوائیں بھی ختم ہوگئی اور پٹیاں بھی۔ چنانچہ عورتوں نے پٹیوں کی جگہ پر سفید چادریں اور رضائیوں کے غلاف ہسپتالوں کو دے دیئے۔

محاصرہ کے دوران ایک بہت ہی خوفناک واقعہ ہوا جس نے بے شمار خاندانوں کا مکمل خاتمہ کردیا۔ کیمپ کے سب سے بڑے حصے میں تین ہزار کے قریب لوگ تھے۔ یہ ایک ایسی عمارت میں تھے جس کی کئی منزلیں تھیں، اس عمارت پر ہوائی جہازوں سے زبردست بمباری کی گئی۔ یہ لوگ گرتی عمارت میں پھنس گئے۔ ہم نے عرب اور غیر عرب اداروں سے کہا کہ وہ صرف ایک دن مداخلت کریں، جنگ بند کرائیں تاکہ لوگوں کو اس عمارت سے نکالا جاسکے۔ مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بمباری مسلسل اس عمارت پر ہورہی تھی اور جو کوئی اس عمارت تک پہنچنے کی کوشش کرتا راہ میں ہی مارا جاتا۔ اس عمارت میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے، ان کی امداد کی پکار اور دلدوز چیخیں دل کے ٹکڑے کردیتیں۔ وہ پانچ دن تک زندہ رہے اور پھر سارے کے سارے مرگئے، ملبے میں سے کوئی زندہ نہیں نکلا۔ غور کریں آپ کی ماں یا بیٹی سڑک کے اس پار زندہ ہے مگر نہ آپ اس تک زندہ پہنچ سکتی ہیں نہ کوئی امداد دے سکتی ہیں..... بتایئے ایسے موقع پر آپ کے جذبات کس قسم کے ہوں گے؟ میری بھتیجی کی ماں اس بلڈنگ میں تھی میری بھتیجی دن رات اس کیلئے روتی رہی وہ آدھی رات کا انتظار کرتی جب بمباری کچھ کم ہوتی تو وہ عمارت کے قریب جاتی اور ماں کی آواز سنتی جو مدد کیلئے پکار رہی ہوتی۔ فلسطینی عورتوں کی زندگی میں یہ وقت سب سے برا وقت تھا۔ صبرہ اور شاتلہ کی داستان کا زیادہ چرچا ہوا ہے مگر اسرائیل کے حمایت یافتہ فلنجی ملیشیا نے جو جو قتل عام کیا ہے اس کی کوئی مثال ہی نہیں۔ کیمپوں میں عورتوں کو سماجی بے انصافیوں کا نہیں مکمل طور پر بے قابو ہوجانے کا خوف تھا انہیں اپنے مردوں سے ذاتی لڑائیاں

لڑنے کی فرصت ہی نہیں تھی کیونکہ اس وقت سب اپنے آپ کو بیرونی تباہی سے بچانے میں مصروف تھے۔

''ایک روز مجھے سخت پیاس لگی، گھر میں پانی کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ اس وقت باہر گلیوں میں بھی کوئی آجا نہیں رہا تھا۔ لوگوں نے اپنے فلیٹوں کی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں؛ ہم ان کھڑکیوں کے ذریعے ایک فلیٹ سے دوسرے فلیٹ میں جایا کرتیں۔ میں نے کھڑکی کھولی اور رینگتی ہوئی ہمسایہ فلیٹ میں گئی۔ مجھ میں بات تک کرنے کی طاقت نہ تھی میں نے گلاس دکھا کر اشارہ کیا مجھے ایک گھونٹ پانی چاہیے۔ میرے ہمسائے نے تھوڑا سا پانی میرے گلاس میں ڈالا اور رونے لگا جب مجھ میں کچھ طاقت آئی تو میں نے پوچھا کہ وہ رونے کیوں لگا تھا کہنے لگا میری دو بیٹیاں پانی لینے گئیں اور ماری گئی تھیں اور وہ ان لڑکیوں کو چھوڑ کر پانی لے کر گھر پہنچ گیا تا کہ گھر میں موجود بچے پیاس سے نہ مر جائیں۔ اس سے اگلے روز میری بھتیجی جو میرے ساتھ رہ رہی تھی اور جس کی ماں عمارت کے ملبے میں دب کر مر گئی تھی پانی لینے کیلئے گئی اور راستے میں ماری گئی۔

دیمور میں ہم صرف عورتیں ہی عورتیں تھیں؛ مرد چند ایک ہی بچے تھے۔ یہ تمام عورتیں سیاہ پوش تھیں؛ گھر تمام جلے ہوئے تھے اور ہر شئے دھواں اگلتی تھی۔ کمروں میں نہ کھڑکی نہ دروازہ صرف کالی دیواریں۔ سات برس تک گرمیوں سردیوں میں مجھے ان دروازوں کی کھڑکیوں پر صرف پلاسٹک کی چادریں ڈال کر کام چلانا پڑا۔ جن عورتوں کے کفیل مارے گئے تھے ان کے اوسطاً چھ چھ سات سات بچے تھے۔ اس لئے انہیں محض زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کیلئے کیمپ سے باہر جا کر کام کرنا پڑتا تھا۔ 1982ء میں اسرائیلی طیاروں نے یہاں بھی ہمارے سروں پر چکر لگانے شروع کر دیئے۔ پھر بمباری بھی شروع کر دی۔ ہر ہوائی حملے کے بعد عورتیں گلیوں اور سڑکوں سے اپنے بچوں کی لاشیں اُٹھانے نکلتیں۔ جس وقت ہوائی حملے ہوتے عورتیں عموماً گھروں میں نہیں ہوتی تھیں کہ بچوں کو اندر رکھ سکیں۔ ان کی غیر موجودگی میں بچے جہاز دیکھنے کے لیے باہر آجاتے جہاز بم گرا کر گھروں کو لوٹ جاتے مگر بچے پھر گھر واپس نہ آتے۔ یہ حملے 1982ء میں اسرائیل اور لبنان کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہونے تک جاری رہے اور جنگ اس وقت شروع ہوئی جب اسرائیل نے بیروت میں شاتلا کیمپ کے پاس سپورٹس سنٹر پر حملہ کیا اور وہاں جتنے بھی لوگ موجود تھے سب کے سب مارے گئے۔

دیمور میں رہتے ہوئے میں نے ان وارداتوں سے بھی زیادہ خوفناک قصے سنے جنہوں

نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میری اذیتیں تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ وہاں میری ایک ہمسائی ام محمد دوشی کا خاوند، خاوند کے پانچ بھائی، چار بچے اور اپنے دو بھائی مارے گئے۔ اس کا صرف ایک چھوٹا بچہ زندہ بچ نکلا۔ راستے میں ٹانگ شدید زخمی ہوگئی جو کٹوانا پڑی۔ میں تمہیں اُم عدنان کا حال بتانا چاہتی ہوں جو اتل الزعتر میں اپنے خاوند اور دو بچوں سے محروم ہوگئی۔ وہاں سے وہ ایک چھوٹے بیٹے اور دو بیٹیوں فریال اور سمیعہ کو لے کر آئی۔ دیمور پر ایک اسرائیلی فضائی حملہ کے بعد اس کا بیٹا متاثرین کی مدد کیلئے نکلا کہ ایک ٹائم بم پھٹا وہ بھی مارا گیا اور جو لوگ اردگرد تھے وہ بھی۔ اس کی بیٹی سمیعہ ریڈ کراس میں کام کرتی تھی اسے تعلیم جاری رکھنے کیلئے وظیفہ ملا۔ وہ دمشق جانے کیلئے کار میں سفر کر رہی تھی اس کے ساتھ ایک اور عورت اور تین مرد طالب علم بھی اسی کار میں تھے اسے دمشق سے طیارہ پکڑ کر وہاں پہنچنا تھا جہاں اسے تعلیم حاصل کرنا تھی مگر شام کی سرحد تک پہنچنے سے پہلے ہی لبنانی ملیشیا نے انہیں پکڑ لیا اور سب کو مار ڈالا۔ اس طرح سات افراد پر مشتمل گھرانے میں سے صرف اُم عدنان اور فریال رہ گئی ہیں۔

دیمور میں آنے والی اکثر عورتوں کے خاوند اور بڑے بچے مارے گئے تھے اور چھوٹے بچوں کو ماں کی شفقت محبت اور موجودگی کی شدید ضرورت محسوس ہوتی۔ عورتیں کھیتوں پر کام کرنے جاتیں یا کھانے پکانے کیلئے پی ایل او میں۔ اور کر بھی کیا سکتی تھیں؟ ان تمام المناک واقعات کے باوجود انہیں اپنی قوتوں کو اور بچے کھچے وسائل کو اکٹھا کرنا پڑتا تا کہ وہ زیر کفالت بچوں کو پال سکیں۔ جب آپ کا بچہ پانی یا روٹی کے ٹکڑے کیلئے رونے لگتا ہے تو آپ اسے ایک بار پانی یا روٹی دینے کے لئے کوشش کرتی ہیں۔ لیکن روزی کمانے باہر نکلیں تو یہ بھی یقین نہیں ہوتا کہ زندہ بھی لوٹیں گی کہ نہیں؟ کئی عورتیں اپنے بچوں کیلئے پانی لینے کے لیے نکلیں مگر پانی تک پہنچنے سے پہلے ہی ماری گئیں۔ کوئی عورت اپنے بچے کو مشکل میں دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتی۔ عورتیں بچوں کو تکلیف میں دیکھنے کی بجائے مر جانے کو ترجیح دیں گی۔

میرا بھائی اسرائیلی حملوں کے دنوں میں طائر میں رہتا تھا۔ حملہ ہوا وقت اتنا نہ تھا کہ بچوں کو لے کر پناہ گاہ تک پہنچتا۔ چنانچہ اس نے ایک ایک کر کے بچوں کو کھڑکی میں سے اندر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس نے تین بچے اندر پھینکے چوتھا بچہ پھینکنے والا تھا کہ گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں لگی اور اس کے ساتھ ہی اس پر فالج گرا۔ اس وقت ہر کوئی محفوظ پناہ گاہ میں تھا ایک وہ تھا جو اپنے ہی لہو میں تر تھا اور ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ہوائی حملہ ختم ہوا اس کی بڑی بیٹی باہر آئی دیکھا اس کا باپ لہو میں

تر بتر پڑا ہے اور اس کا سب سے چھوٹا بھائی اب بھی اس کے بازوؤں میں ہے۔ اسے بیروت لے جایا گیا اس کے دو بڑے آپریشن ہوئے جن کے بعد وہ چھڑی کے سہارے چلنے کے قابل ہوا۔ بعد میں اس کی پندرہ سالہ بیٹی نے باپ سے ایک پچپن سالہ مرد سے شادی کرنے کی اجازت لی کیونکہ پچپن سالہ شخص نے کہا کہ وہ سارے خاندان کی کفالت کرے گا اور بچوں کی تعلیم کا خرچہ بھی اُٹھائے گا۔

ہم دیمور سے وادی بقاع پہنچے وہاں بھی اسرائیلی ہوائی حملے جاری رہے پھر شام پہنچے یہ المناک واقعات بیان کرنے کی طاقت کہاں سے لاؤں۔ یہ نا قابل بیان قصہ ہے کوئی روشنی نظر نہیں آتی، درحقیقت ہماری سرنگ کا دوسرا سرا ہے ہی نہیں۔ تمام فلسطینیوں کو صبر پر ہی قناعت کرنا پڑے گی۔

''اپنے تجربات کی روشنی میں کیا آپ کا عورتوں کے بارے میں نظریہ تبدیل ہوا ہے؟''

اتل الزعتر میں میں نے یہ دیکھا کہ عورتیں کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ مرد لڑ رہے تھے' عورتیں خوراک اور پانی فراہم کرتیں' زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرتیں' مرنے والوں کو دفن کرتیں اور بے حوصلہ لوگوں کا حوصلہ بڑھاتیں۔ تب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ عورتوں کی مدد کے بغیر کبھی کوئی قوم جنگ نہیں جیت سکتی۔ جو عورتیں زخمیوں کی دیکھ بھال کرتیں جب انہیں پٹیاں نہ ملتیں تو وہ اپنے سکارف اتار کر پٹیاں بنا لیتیں۔ اسلام میں اس بات کی اجازت ہے کہ کسی کی زندگی بچانے کیلئے اگر سرنگا کرنا پڑے تو یہ بھی کر گذرنا چاہیے۔

اکثر فلسطینی عورتیں اپنے بچوں کو پی ایل او میں شامل ہونے کی ترغیب دیتیں اور ان پر بڑا فخر کرتیں۔ میرا جولڑکا مرا تھا۔ وہ ہمارا ہی تو دفاع کرنے گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ شہید ہوا تھا تو میں نے اسے مبارک دی تھی۔ اگر ہم اپنا دفاع نہ کرتے تو دُشمن سیدھا ہم پر غالب آتا اور پھر ہم کیا کر سکتی تھیں؟ کیا ہمیں مزاحمت نہیں کرنی چاہیے تھی؟ اگر میرا دُشمن آ کر میری بیٹی کو پکڑ لیتا اور میرے ہی سامنے اس کی عصمت دری کرتا تو اس صورت میں میری حالت کیا ہوتی؟ اس لئے میں خوش ہوں کہ تین بھائی تو مر گئے مگر میری اور میری بیٹی کی عزت پر حرف نہیں آیا۔ اگر میری بیٹی کی عصمت لٹ جاتی میری عزت جاتی رہتی اور میرے تینوں بیٹے زندہ ہوتے تو پھر ان کی زندگی کس کام کی تھی۔ ہم نے فلسطین میں اپنے گھر اور کھیت اس لئے چھوڑے کہ ہماری عزت اور عصمت اسرائیلیوں سے محفوظ رہے۔ اسرائیلی یہ بات سمجھتے تھے اور اُنہوں نے اس سے پورا پورا

فائدہ بھی اُٹھایا۔ وہ لاؤڈ سپیکروں پر اعلان کرتے تھے کہ یا تو ہم علاقہ چھوڑ جائیں ورنہ مردوں کو قتل کر دیا جائے گا اور عورتوں کی عصمت دری کی جائے گی۔ فلسطینی مردوں کی کڑی آزمائش یہ تھی کہ کس طرح اسرائیلی درندوں سے بیویوں اور بیٹیوں کی عصمت بچائیں۔ لیکن اب ہم سمجھے ہیں کہ یہ دراصل سیاسی حربہ تھا، ہم اسرائیلیوں کے ہاتھوں میں کھیل گئے، تاہم اس بات کا پتہ بڑی تاخیر سے چلا۔ غالباً اس وقت لوگ سیاسی لحاظ سے زیادہ باشعور نہیں تھے انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مرد اور وہ بھی جو ذمہ دار عہدوں پر تھے ان سب کو جنون سا ہو گیا تھا کہ اسرائیلیوں سے اپنی عزت (عورت) کو بچائیں۔ چنانچہ جب وہ لڑے بھی تو وطن کی سرزمین کے لیے نہیں عورتوں کی عزت بچانے کیلئے۔ ان کے نزدیک وطن کی زمین کی کوئی زیادہ وقعت نہ تھی۔ اسرائیلی عربوں کے طریق فکر کو جانتے تھے چنانچہ اُنہوں نے اس کا بھرپور استعمال کیا اور ایک مکمل سازش کر دکھائی۔

''آپ کی ساری جنگیں آپ کے فلسطینی ہونے کی وجہ سے ہوئیں؟ کیا عورت کی حیثیت سے آپ پر جو مردانہ جبر ہوتا تھا آپ نے اس کے بارے میں ناگواری کا اظہار نہیں کیا؟''

''فلسطین کے کسانوں میں مرد اور عورت خوش خوش رہتے تھے اور برابر کام کرتے تھے۔ مرد کھیت کا سارا کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے باقی کام عورتیں کرتی تھیں۔ عورتیں اور مرد ایک ساتھ کھیتوں میں جاتے، ایک ساتھ کام کرتے، اکٹھے گھر آتے اور آج کے مقابلے میں خود کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب سمجھتے تھے۔ عورتیں گھروں میں گھر داری کے سارا کام کرتی تھیں، بچوں کی دیکھ بھال، مویشیوں کو چارہ وغیرہ ڈالنا، دودھ دوہنا اور پھر بلوہنا۔ وہ یہ سب کام کر کے بڑی خوش ہوتی تھیں۔ اور سچ ہے کہ اُنہوں نے اس کام کے بارے میں کبھی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ ان کے لیے ایسے ہی معمول کی بات تھی جیسے سورج کا مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہونا۔ خانہ داری، بچوں کی دیکھ بھال اور فصل کی فروخت ان کا شوق بھی شامل ہوتا۔ قصہ مختصر ہم اب کے مقابلے میں تب زیادہ خوش خرم تھے۔''

''فلسطینی کی حیثیت سے آپ کی نظر میں آپ کے مسائل کا کیا حل ہے؟''

''حل یہ ہے کہ تمام عرب ممالک اکٹھے ہو جائیں، ایک دوسرے سے محبت کریں۔ آپس میں ایکا کریں اور بیک وقت دل و جان سے دشمن کے خلاف ڈٹ جائیں۔ دُشمن کوئی اتنی بڑی چیز نہیں ہم اگر متحد ہوں تو اسرائیل تو اسرائیل امریکہ کو بھی شکست دے سکتے ہیں۔ ایک ملک

امریکہ ہے اور ایک اسرائیل۔ یعنی دو ملک اور عرب ملک بھلا کتنے ہیں؟ پندرہ یا سولہ؟ میری خدا سے دُعا ہے کہ عرب ایک دوسرے سے محبت کرنا سیکھیں، ایک دوسرے کی دلی حمائت کریں اور پھر بڑے سے بڑا دُشمن بھی ہمارے حقوق غصب کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔

جب لیانا بدر سے میں نے اپنے کام کی نوعیت بیان کردی اور اسے یقین دلا دیا کہ میں اس کے نام کا انکشاف نہیں کروں گی تو اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ تو یہ چاہے گی کہ میں اپنی کتاب میں اس کا پورا پورا نام چھاپ دوں۔ ''میں ایسا کیوں چاہتی ہوں میں یہ وضاحت بھی ابھی کر دوں۔ مغربی یورپ اور امریکہ میں جب لفظ ''فلسطین'' استعمال ہوتا ہے تو اس کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے میں محض اشارے اور علامتیں استعمال کر کے معاملات کو مزید مشکوک نہیں بنانا چاہتی۔ میرا ایمان ہے کہ جو تجربات میرے ہیں وہ دراصل میرے نہیں میرے لوگوں کے ہیں۔ یہ تو ان پر گذرنے والے عذابوں کی صرف مثال ہیں۔ مجھے کوئی شئے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو پہلے ہی سب کچھ گنوا چکی ہوں اب میرے پاس گنوانے کے لیے رہ کیا گیا ہے .....اب میرے پاس کوئی ایسی شئے نہیں جسے گنوایا جا سکے۔ اس لئے میں تو چاہوں گی کہ جو مجھ پر گذری ہے لوگوں کو خاص طور پر یورپی لوگوں کو خبر ہو جنہیں سیدھی اور صاف سچائی جاننے کا موقع خال خال ہی ملتا ہے۔

میرے والدین کی ملاقات 1948ء میں ہوئی، میری ماں 1948ء کی جنگ کے شکار لوگوں کی رضا کارانہ طور پر مدد کر رہی تھی۔ جبکہ میرے والد ڈاکٹر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئی اور جلد ہی شادی بھی ہوگئی۔ میرے والد سیاسی کارکن بھی تھے، اور دانش ور بھی سائنس اور لٹریچر سے والہانہ دلچسپی تھی۔ اُنہوں نے آئن سٹائن اور علم فلکیات پر کتابیں لکھیں۔ ان کی کتاب الکون الخالد (کائنات ابد) آج بھی عرب دُنیا میں اس موضوع پر سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور چھپنے والی حوالہ جاتی کتاب ہے۔ میری ماں بھی سیاسی کارکن تھیں وہ بھی بہت تیز تھیں، بلا کی ذہین اور بڑی گہری بصیرت کی مالک (بعد میں وہ لڑنے والی کی حیثیت سے بڑی مقبول ہوئیں۔ میرے لئے تو وہ ایک کامل دُنیا تھیں، ترقی یافتہ حتمی اور مفصل) ہمارے گھر کی فضا بیک وقت تعلیمی اور سیاسی تھی اور جب 1948ء میں فلسطین کا ایک حصہ اسرائیلیوں کے ہاتھ لگا تو ہمارے گھر پر یہ دونوں رنگ اور گہرے ہوگئے۔ اس کے لیے بہر طور ایک قیمت بھی تو دینا پڑی۔ مجھے یاد ہے میرا بچپن مسلسل عذاب میں گذرا۔ میرے والد اکثر

قیدی رہے اور والدہ عورتوں میں سماجی کام کرتی رہیں۔ انہیں ملک کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا اور اس میں عورتوں کا جو حصہ تھا یا ہونا چاہیے تھا اس کے بارے میں باخبر اور باشعور بناتی رہیں۔ سلویٰ ضیادین کے ساتھ مل کر میری والدہ نے 1952ء میں یروشلم میں عورتوں کا سب سے پہلا مظاہرہ کرایا۔ مظاہرہ نیشنل گارڈ کے حق میں اور فلسطین میں برطانوی فوج کی موجودگی کے خلاف تھا وہ پہلی فلسطینی خاتون تھیں جنہوں نے 1950ء کے شروع میں برسلز میں بچہ اور زچہ سے متعلق کانفرنس میں شرکت کی۔

''1957ء میں میرے والد گرفتار ہو گئے جبکہ میری ماں شام پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں جہاں انہیں سیاسی پناہ مل گئی۔ تقریباً تین ماہ بعد میں اور میری بہن اپنی جلاوطن ماں سے آملیں گویا بچپن سے ہی مجھے مشکل حالات سے گذرنا پڑا باپ کبھی جیل کے اندر اور کبھی باہر ہوتے (اکثر وقت جیل کے اندر ہی رہے) اور ماں اردن رجعت پسند حکومت کو مات دینے اور اپنی جدوجہد کو کامیاب بنانے میں مصروف رہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ گھر پر گھر بدلنا پڑا اور یوں اس عمل میں بھی انتشار کا سامنا کرنا پڑا۔ میری ماں شام میں ایک سال تک مقیم رہیں۔ 1958ء میں مصر اور شام میں اتحاد ہو گیا تو شام اور مصر تین برس (61-1958ء) ایک دوسرے میں مدغم رہے) انہیں مصر جانے کی اجازت مل گئی۔ اجازت ایک سال کیلئے تھی 1959ء میں اُردن کی حکومت نے عام معافی کا اعلان کیا چنانچہ میرے والد رہا ہوئے اور میری والدہ کو واپس گھر آنے کی اجازت مل گئی اس ہر دم بدلتی طوفانی زندگی نے مجھے اوائل عمر میں ہی ایک ایسا سبق سکھا دیا تھا جسے بعد میں حالات نے بار بار صحیح ثابت کیا اور وہ یہ کہ جب کسی فلسطینیوں کو صورت حال بہتر نظر آنے لگتی ہے کچھ استحکام سا لگتا ہے تو حقیقتاً اس کی کیفیت سراب کی سی ہوتی ہے جس کے قریب پہنچنے پر پہلے نظر آنے والی حقیقت واہمہ ثابت ہوتی ہے مجھے تو اپنے تجربے کے بعد یوں لگا کہ گھر یا خاندان کا ادارہ بھی اب زیادہ حقیقت نہیں رکھتا یہ دوسری بات ہے کہ مشرقی عورت کی حیثیت سے میں جس گھریلو ماحول میں میں پلی تھی اس پر ایمان لانے کی پوری پوری کوشش کی۔

''ہماری گھریلو زندگی ایسی خوشگوار نہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک اور تجربہ بھی ہوا جس نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ تجربہ تھا 1960ء سے 1962ء تک یروشلم کے ایک یتیم خانہ دارالاطفال المعربی میں زندگی گذارنے کا۔ ان تین برسوں میں میرے خاندان کی دنیا سے الگ ایک اور دُنیا میں میری نظر کو بھی گہرائی دی۔ مجھے یقین ہے کہ میرا ادبی ذوق اسی

سکول میں نکھرنا شروع ہوااس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر میں گھر میں رہتی تو میرا رول بڑا محدود ہوتا۔ اس سکول میں مجھے گانے، مضمون لکھنے اور شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ یوں میں نے اپنی ایک نجی اور بڑی دُنیا تخلیق کر لی اس دُنیا سے مختلف جو میرا خاندان مجھے پیش کرتا۔ اس سکول میں پڑھنے والی تمام لڑکیاں مفلسی، جبر اور بے چارگی کا نشانہ بنتی رہیں ان کے ذریعے مجھے انسانی تعلقات کی ایک اور ہی دُنیا مجھے دکھائی دی یہ دُنیا بڑی وسیع تھی اس نے مجھے ذہنی وسعت بھی دی اور زندگی کے بارے میں میری نظر کو بھی گہرائی دی۔ مجھے یقین ہے کہ میرا ادبی ذوق اسی سکول میں نکھرنا شروع ہوااس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر میں گھر میں رہتی تو میرا رول بڑا محدود ہوتا۔ اس سکول میں مجھے گانے، مضمون لکھنے اور شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ یوں میں نے اپنی ایک نجی اور بڑی دُنیا تخلیق کر لی اس دُنیا سے مختلف جو میرا خاندان مجھے پیش کرتا۔ اس سکول میں پڑھنے والی تمام لڑکیاں مفلسی، جبر اور بے چارگی کا نشانہ بنتی رہیں ان کے ذریعے مجھے انسانی تعلقات کی ایک اور ہی دُنیا دیکھنے کا موقع ملا۔ ان برسوں میں زندگی کے چمکتے جگمگاتے روپ نے میری توجہ کم کھینچی اور میں نے لوگوں کے ساتھ جذباتی دیانتداری کے ساتھ رہنے کا ڈھنگ زیادہ سیکھا۔ انہی دنوں میں نے پڑھنا بھی زیادہ شروع کر دیا ہفتے میں چار پانچ کتابیں پڑھ لیا کرتی تھی۔ یہ دراصل سچے انکشافات کا زمانہ تھا۔

''1964ء میں ہمارے والدین آ کر ہمیں لے گئے ہم ان کے ساتھ اریہا Arihaمیں رہے، جو آج بھی مجھے دُنیا کی سب سے بہترین جگہ لگتی ہے۔ اگرچہ میں پیدا یروشلم میں ہوئی تھی اور شہر کا نقشہ اب بھی میرے ذہن میں واضح ہے مگر مجھے اریہا بہت ہی عزیز ہے یہاں فطرت کے نوع بنوع روپ تھے اور عطر بیز اور مدہوش کرنے والی ہوائیں تھیں۔ اریہا رنگوں کی سرزمین تھا رنگ آج بھی مجھے اچھے لگتے ہیں آج بھی مجھے تیز اور ملے جلے رنگ پسند ہیں۔ لیانا نے اس قالین کے نکھرتے ہوئے رنگوں کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں رنگوں کے اس خوبصورت امتزاج اور آمیزش کو اس لئے بھی قریب رکھتی ہوں کہ یہ اس خوبصورت رنگا رنگ حسین مگر گمشدہ دُنیا کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ یروشلم میرے لئے ایک ایسی جگہ ہے جہاں میں پیدا ہوئی اور جو بڑا مہذب شہر ہے۔ یروشلم کیساتھ ذہن میں ایک قسم کا تقدس اور امن کا احساس ابھرتا ہے۔ یوں میرا بیک وقت دو دُنیاؤں سے تعلق تھا۔ اریہا حواس پر چھا جانے والا رنگوں، خوشبوؤں پھلوں اور اشجار کا خوبصورت شہر دوسری طرف یروشلم

ایک روحانی شہر، چٹانوں، رومن طرز کی عمارتوں اور قدیم تہذیب کا شہر۔ یروشلم لوگوں کو سکھاتا کہ انسانوں کو انسانیت کے حوالے سے ایک دوسرے سے پیار کرنا چاہیے۔ لبنان جانے سے پہلے مجھے ''فرقہ پرستی'' کے لفظ کا بھی علم نہ تھا۔ یروشلم میں ایک انسانی فراخی ہے اور یہ صفت اس قسم کی تہذیب کا بنیادی حصہ ہے۔ یروشلم میں میری بہترین دوست جن کی یادیں بڑی عزیز ہیں' عیسائی تھیں یہاں تک کہ جب کرسمس کا تہوار آتا میں بھی ان کی خوشیوں میں شریک ہوتی اور وہ بھی مجھے تحفے دیتیں اس کے علاوہ مختلف مذاہب کو اس انداز میں دیکھا جاتا تھا کہ اس طرح زیادہ تقاریب ہوتی ہیں اور ہمسائے اور دوست ایک دوسرے کی تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔

''کیا وہاں کے مردوں اور عورتوں میں بھی اسی قسم کا پیار بھرا اور کھلا ڈھلا رشتہ تھا؟''

''نہیں عورتوں اور مردوں میں اس قسم کا روحانی بندھن نہیں تھا، روایات رسوم ورواج اور عادات کے حوالے سے مردوں کا غلبہ تھا۔ اس کا مشاہدہ میں نے اپنے والدین کے باہمی تعلقات میں کیا۔ میری ماں سکول ہیڈ مسٹریس، سیاسی کارکن تعلیم یافتہ، ذہین بلکہ خدا داد صلاحیتوں کی مالک تھیں اس کے باوجود وہ میرے والد کو عورت اور مرد کی برابری کا قائل نہ کر سکیں۔ میرے والد کو میری ماں سے محبت تھی وہ عورتوں کے حقوق کو بھی مانتے تھے مگر وہ بھی مضبوط سماجی روایات میں جکڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب کبھی میرے والدہ کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوتا کہ وہ میری ماں کو اپنے برابر کا درجہ دے دیں عین اسوقت باہر کے دباؤ اور اثرات انہیں مجبور کر دیتے اور وہ روائتی اور رجعت پرستانہ رویہ اختیار کر لیتے یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اپنے دوستوں میں اپنے آپ کو خاندان کا سربراہ مرد ثابت کرنے کیلئے میری ماں سے نفرت آمیز سلوک بھی کرتے۔ میری ماں اس رویہ کے سبب اپنی سب کی بھی محسوس کرتیں۔

میری ماں عورت کی حیثیت سے اپنے مسائل کو بخوبی سمجھتی تھیں اس ضمن میں وہ دوسری عورتوں کے سلسلے میں بھی خود کو ذمہ دار سمجھتی تھیں اور تو اور خود میری ماں سے میرا تعلق بھی انہی مرد عورت کے تعلقات کے حوالے سے ہی رہا۔ جب اُنہوں نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے اور اپنے خاوند کے درمیان تعلق کے متعلق بتانا شروع کیا تو میں ماں کی طرفداری کئے بغیر نہ رہ سکی۔ انہیں سب سے زیادہ اذیت ناک بات یہ لگتی تھی کہ وہ دو دُنیاؤں کے درمیان گم ہوگئی ہیں۔ ایک وہ دُنیا تھی جس میں وہ ڈاکٹر کی بیوی کی حیثیت سے پرآسائش آرام دہ زندگی بسر کر سکتی تھیں یہ دُنیا اُنہوں نے ترک کر دی تھی اور دوسری یہ انقلابی دُنیا جس میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا

منوایا اور جس کے بعد یہ ان کی شدید ضرورت تھی کہ انہیں مردوں کی برابر کی ساتھی کے طور پر تسلیم کرلیا جاتا وہ جانتی تھیں کہ یہ حق یہ مقام اُنہوں نے حاصل کرلیا ہے مگر اسے ماننے یا دینے سے انکار کیا جارہا ہے۔ وہ میرے بارے میں بھی بڑی پریشان رہا کرتی تھیں کہ میں اعلیٰ تعلیم درمیان میں چھوڑ دوں، وہ مشورہ دیتی تھیں کہ میں اس چھوٹی عمر میں شادی نہ کروں اُنہوں نے مجھے آزاد، مضبوط اور اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کا سبق پڑھایا تھا۔ اس طرح ہمارے درمیان یعنی ماں بیٹی کے درمیان عقل و دانش کا ایک رشتہ تھا ہم دونوں پر باہر کا بہت دباؤ تھا چنانچہ باہر کی دُنیا سے تیز لڑائی نے دونوں کو زیادہ قریب کردیا۔ میری ماں سے بڑی دوستی بھی تھی اور وہ میری حمایت بھی بہت کرتی تھیں، مجھے یہ سب بھلی باتیں یاد ہیں، ماں سے اس تعلق نے مجھ میں صلاحیت پختہ کی کہ میں معاشرے میں عورتوں کے کردار، مقام اور حقوق کا گہرائی سے اور ناقدانہ جائزہ لیتی رہوں۔ میری ماں نے عرب عورتوں کیلئے بنائے گئے روائتی دستوروں کو توڑنے کیلئے میری مدد کی۔ رواج کے مطابق عرب لڑکی کو سکھایا جاتا کہ وہ زیادہ وقت اپنے لباس، زیوارت اور بناؤ سنگھار پر صرف کرے۔ میں نے ماں کی مدد سے ایسا نہیں کیا البتہ میری ماں نے مجھے بڑے سادہ اور فطری انداز میں سمارٹ اور مستعد رہنا بھی سکھایا۔

بدقسمتی سے اُنہوں نے عورتوں کے حقوق کی جنگ تن تنہا لڑنے کی کوشش کی۔ وہ بڑی سخت کوش مجاہدہ تھیں۔ جنہوں نے کبھی ایک پل بھی آرام نہیں کیا بالاخر بیمار پڑ گئیں اور صرف سینتیس برس کی عمر میں ایک ایسے فرد کی حیثیت سے انتقال کر گئیں جو فریب خوردہ بھی ہو اور مایوس بھی اور جس کے اندر بیماری سے لڑنے کی ہمت یا جینے کی خواہش ہی ختم ہوگئی ہو۔ میرے خیال میں انہیں کینسر ہوگیا تھا اور اب وہ جدوجہد میں ایک اندھے موڑ پر آ گئی تھیں تو پھر ان کے لیے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ نہ تو وہ روائتی قسم کی زندگی گذارنے کے لیے واپس جاسکتی تھیں اور نہ ہی وہ سیاسی کارکن اور عورتوں کی خاطر جدوجہد کرنے والے فرد کی حیثیت سے منزل مراد پر پہنچ سکتی تھیں۔ اُنہوں نے مرد کے ساتھ برابری اور مساوات حاصل کرنے کیلئے بڑی تگ ودو کی اور وہ اس مقام کی مستحق بھی تھیں مگر نہ انہیں یہ مقام دیا گیا نا ان کی برابری کو تسلیم کیا گیا۔ اس طور میری ماں ایک مایوس، شکستہ دل ہارے ہوئے فرد کی صورت جان ہار گئیں۔ وہ تنہا تھیں اور تنہائی انہیں مار گئی۔ میری ماں کی جدوجہد کا یہ پہلو کتنا دردناک ہے۔ بدقسمتی سے ان دنوں نہ تو عورتوں کی کوئی تحریک تھی نہ انقلاب کی ایسی تحریک جو عورتوں کے حقوق کا مسئلہ پوری سنجیدگی سے اُٹھاتی۔

MashalBooks.org

''جب میں پی ایل او کی رکن بنی جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ مسلئے کا حل ذاتی لڑائیاں یا انفرادی جدوجہد نہیں۔ اگر کوئی تبدیلی لانا ہے تو پھر اجتماعی طور پر سرگرم عمل ہونا ہوگا۔ یونیورسٹی جانے سے پہلے مجھے چودہ سال کی عمر میں بیاہ دینے کی کوشش کی جاتی رہی اور میں اس کوشش کو ناکام بنانے میں لگی رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ میری ماں تو اس عمر میں شادی کے ہی خلاف تھیں اور میرے باپ نے بھی مجھے شادی پر کبھی مجبور نہیں کیا مگر دوسرے عزیزوں رشتہ داروں اور سماج کی طرف سے دباؤ کو میں نے بھی محسوس کیا اور یہ ایسا دباؤ ہوتا ہے جو فرد کے عزم کو کمزور کر دیتا ہے۔ عزیزوں رشتہ داروں نے مجھے منانے کہ میرے اور میرے خاندان کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لیا ثقافتی اور سیاسی میدان میں بھی سرگرم ہوئی اور آزادروی اختیار کی اس زمانے میں نہ تو عورتوں سے اس کی توقع کی جاتی تھی اور نہ ہی ایسی عورتوں کو پسند کیا جاتا تھا۔ جو کچھ میں نے کیا اس کی قدر و قیمت کا تعین اس بات سے نہیں ہوتا کہ میں کتنی آزاد ہوئی بلکہ اس کی افادیت اس وقت سامنے آئی جب ان کا اثر میرے اردگرد کے لوگوں پر ہوا جب 1969ء میں پی ایل او میں شامل ہوئی میں نے جتنی بھی ذاتی لڑائیاں لڑی ہیں ان کی معاشرتی افادیت اب ظاہر ہونے لگی ہے، اس وقت میرا خیال تھا کہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی ذاتی کوشش دراصل دیوار کے ساتھ سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔

''پی ایل او کے حق میں ایک بات جاتی ہے جو اس سوال سے مشروط ہے کہ جب فلسطین کے لوگ ہی کئی ممالک میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کا کوئی حق بھی تسلیم نہیں کیا گیا تو ایسے میں ایک تحریک عورتوں کو کس طور آزاد کرا سکتی ہے؟'' یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ پی ایل او کے اندر عورتوں کے مسائل پر نظریاتی مباحث بہت کم ہوئے ہیں دوسری طرف میرا یہ بھی خیال ہے کہ جب تک ہم آزاد نہیں ہوتے اس وقت تک برابری یا اپنے حقوق کا مسئلہ حل ہونا ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ جب تک ہم دوسروں کی سرزمین پر زندگی گذار رہے ہیں اس وقت تک کچھ ثابت کرنا یا کچھ شروع کرنا بذات خود بڑا ہی مشکل کام ہے۔

''میں اس نقطہ نظر پر اعتراض کر سکتی ہوں؟ میں نے مزاحمت کی۔ شام کی شہری کی حیثیت سے میں سمجھتی ہوں کہ جن حالات سے فلسطینی گذر رہے ہیں وہ عورت اور مرد کے درمیان سچی برابری قائم کرنے کیلئے بہترین ہیں۔ آپ کو قدیم قوانین، جنسی امتیاز کے قانونی تحفظ اور مقررہ جنسی اخلاق اور روایات کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑتا؟''

''میرا خیال بھی کبھی ایسا ہی تھا'' لیانا نے گفتگو پھر شروع کی، میں سوچا کرتی تھی کہ سماجی رسم ورواج اور روایت کو ہلا کر رکھ دینے کا امکان موجود ہے اور اگر یہ ہو جائے تو اس طرح عورتوں کے مرتبہ میں بھی انقلاب آ جائے گا۔ میں نے اکثر اس بات پر سوچ بچار کیا کہ آیا فلسطینی خواتین کی ایسی یونین قائم کرنا ممکن ہے جس پر مردانہ سرپرستی کا کوئی سایہ نہ ہو۔ مگر فلسطینی خواتین کی یونین بھی دراصل دوسرے عرب ممالک میں قائم یونینوں کی طرح کی شئے ہے۔ ایک خاص سیاسی نظام کی طرف سے قائم کی گئی علامتی یونین ..... ایسا سیاسی نظام جو عورتوں کی آزادی کے حصول کو بھی ایک اپنے کارنامے کے طور پر پیش کر سکے۔ اس قوم کی یونین نے پہلے ان پڑھ عورتوں کو پڑھانا شروع کیا۔ پھر عورتوں کو کھانا پکانا، سینا پرونا، اور لکھنا سکھایا تمام عرب ممالک میں یونین یہی کچھ کر رہی ہیں مگر اس طرح تو عورتوں کے اسی پرانے روائتی رول کو ہی تقویت ملتی ہے اس کے برعکس ہمارے وطن مثلاً مغربی کنارے پر جہاں فلسطینی لڑ رہے ہیں وہاں آدھی مزاحمت تو عورتیں کرتی ہیں اور ان کو پی ایل او میں ہر سطح پر نمائندگی حاصل ہے۔ اسرائیلیوں کے خلاف نصف کاروائیاں تو عورتیں کرتی ہیں۔ ہمارے وطن میں عورتوں کی سرگرمیوں سے تو ایک اور مقبول ابھار آ گیا ہے۔ میں پی ایل او کی طرف سے عورتوں کے سوال پر کم توجہی کو جائز نہیں قرار دے رہی مگر میری حمتی رائے ہے کہ پہلے سوال وطن کا ہے۔ لبنان میں ہونے والے تجربوں نے مجھے یہ سبق دیا ہے کہ دوسروں کی سرزمین پر عمارت بنانا ہوا میں قلعے تعمیر کرنے کے مترادف ہے۔ جب بیروت سے ہمارا انخلا ہوا ہے تو وہ کارخانے، دفاتر اور ادارے جو ہمارے خون پسینے سے بنے تھے تباہ کر دیئے گئے اور اب وہ دوبارہ نہیں بن سکتے۔ ہم ایسا ہی کوئی عورتوں کا ادارہ کسی دوسرے ملک میں بناتے تو اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوتا جب آپ دوسروں کی سرزمین پر رہ رہے ہوں تو گویا آپ ریت پر دیواریں اُٹھا رہے ہوتے ہیں۔ مغربی کنارے پر عورتیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ عورتوں کے سلسلہ میں پی ایل او کا سب سے بڑا کارنامہ ہے دیکھیں نا، دو باتیں وہ ہیں جنہوں نے فلسطینی عورت کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں آج کل کھڑی ہے پہلی یہ کہ عورت کے سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے مرد کی نارضامندی اور دوسرا وطن کا مسئلہ اس کے باوجود پی ایل او عورتوں کے حق میں قوانین تو بنا سکتی تھی ایسے قوانین جو عورتوں اور مردوں کے برابر کے حقوق اور مواقع کیلئے فضا سازگار کرتے۔ پی ایل او لوگوں کے ذہن میں ایک جوت تو جگا سکتی تھی اگر ادارے قائم کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی تو پی ایل او اس نوع کی اقدار، روایات اور اخلاقی ضابطے

تو وضع کر سکتی تھی .....

''یہ کہنا پڑتا ہے کہ عورتوں کے حقوق کے بارے میں کچھ کرنے میں جو تاخیر ہوئی ہے اس سے پی ایل او میں شامل خواتین کو بڑا نقصان ہوا۔ ہم بڑی اُمیدیں لے کر پی ایل او میں شامل ہوئیں مگر اکثر عورتوں کو یوں لگا کہ انہیں تو صرف مردوں کی شرائط پر قبول کیا گیا ہے اور جیسے ہی اُنہوں نے پی ایل او کے اندر اور باہر عورتوں کے حالات بہتر بنانے کی کوشش شروع کی تو پی ایل او نے انہیں ناپسندیدہ بنا دیا۔ عورتیں تمام محاذوں پر لڑتے لڑتے تھک گئیں انہیں یہ احساس دلایا گیا کہ ان کی آزادی درحقیقت ان میں دوہرے کام کے عوض ہے۔ عورتیں گھر اور باہر دونوں جگہ پر کام کریں مگر مردوں کے مقابلے میں بعض حقوق ہی حاصل رہیں گے نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں پی ایل او سے الگ ہو گئیں۔

مگر یہ مطلب نہیں کہ پی ایل او میں ممتاز خواتین باقی نہیں رہیں۔ وہ تو ہیں مگر ایک انقلابی تحریک کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے پی ایل او نے انہیں کچھ خاص نہیں دیا اس کے برعکس اُنہوں نے صرف اپنی ذاتی کارکردگی کے زور پر یہ ممتاز مقام کمایا ہے۔ تمام عرب حکومتوں کی طرح پی ایل او کا بھی عورتوں کے بارے میں محتاط بلکہ رجعت پسندانہ رویہ ہے۔ میری مثال لے لو پی ایل او میں رہتے ہوئے مجھ پر کئی افق ہویدا ہوئے مگر پی ایل او نے ایسے حالات پیدا نہیں کئے کہ میں ان آفاق تک پہنچ سکوں۔ پی ایل او نے میرا نقطہ نظر وسیع ضرور کیا۔ مگر اس نے مجھے جو خواب دکھائے تھے ان کی عملی تعبیر کیلئے اس نے میری کوئی مدد نہیں کی حتیٰ کہ میرے بچے کیلئے ایک نرسری تک نہیں بنائی۔ پی ایل او آپ سے جو کام چاہتی ہے اسے کرنے کیلئے خود کوئی مدد نہیں دیتی یہ کام صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب آپ اپنی گھریلو یا خاندانی زندگی، آرام حتیٰ کہ صحت تک کی قربانی دے دیں۔

فلسطینی باشندے اور عورت' میں ہر دو حیثیتوں میں محسوس کرتی ہوں میرے لئے ہمیشہ پیشگی فیصلے کر لئے گئے تھے۔ مجھے بہر طور یہ احساس ہے کہ مجھے اپنے معاملات پر بلکہ اپنی زندگی کے بہت ہی ذاتی معاملات پر بھی کوئی کنٹرول نہیں رہا۔ مثلاً 1967ء میں مغربی کنارے کو چھوڑنے کا فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا۔ میرے والد نے بتایا کہ ہم ایک دو دن کیلئے عمان جا رہے ہیں اس لئے اپنے اور بہن کے رات کے کپڑے بھی ساتھ رکھ لوں۔ میرے والد اس انداز سے یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ یہ معمول کا سفر ہے مگر مجھے لگتا تھا کہ ہم اس سفر سے کبھی واپس گھر نہیں

آئیں گے۔ میرا دل پھٹا جاتا تھا۔ مگر میں والد سے جانے یا نہ جانے کے بارے میں دلیل بازی نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس وقت صرف پندرہ برس کی تھی اس عمر میں کیسی دلیل اور کیسا عندیہ مجھے شکست اور محصور ہو کر ہتھیار ڈال دینے کا احساس ہوا۔ میں جانتی تھی کہ ہم کبھی واپس نہیں آئیں گے اس لئے زیادہ کپڑے ساتھ لے لینے چاہیں مگر مجھے یہ کہنے کی جرات ہی نہ ہوئی کیونکہ اگر میں زیادہ کپڑوں کا کہہ دیتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں مان رہی ہوں ہم اس سفر میں واپس گھر نہیں آئیں گے۔ لیکن میرے اندر کسی شئے نے مجھے مجبور کیا اور میں نے دو قیمتی چیزیں ایک اپنی مرحومہ ماں کی تصویر اور ایک قلم ..... ساتھ رکھ لیا۔ ماں میرے گھر اور میرے ماضی سے رشتوں کی علامت تھی اور قلم میرا واحد وسیلہ رہا تھا، اور قلم ہی میرے بہتر مستقبل کی اُمید .....بعد میں قلم ہی میری آدمیت کو بحال کرنے اور برقرار رکھنے میں مددگار رہا۔

''عمان میں ہمارے پاس سونے کیلئے چٹائیاں تھیں، نہ کپڑے کہ تبدیل کرتے رہیں۔ اور نہ ہی خبریں سننے کے لیے ریڈیو۔ (اگرچہ وہاں بڑی زبردست بمباری ہوئی تھی) مگر گھر چھوڑنا کیسی حماقت کی بات تھی ایک ایسا گھر جس کے پاس ہی سنگتروں کے خوبصورت باغ تھے اور جہاں نیلا آسمان ہمارا سدا کا ساتھی تھا۔ عمان میں گھر، خاندان، دوستوں، روایات، ماضی غرضیکہ ہر شئے سے محروم ہوگئی اور زیادہ تر ننگے فرش پر سوئی رہتی۔ یہاں سے فلسطینی ہونے کے ناتے اور ادیب کی حیثیت سے میری ذاتی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ 1967ء کے بعد میں نے کیمپوں میں عورتوں کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں مجھ پر اپنے اور اپنی ذات کے متعلق اور اپنے اور اپنی ملت کے رشتوں کی نوعیت کا انکشاف ہوا۔ ہم میں مشترکہ شئے وطن واپسی کا خواب تھا اور یہی ہماری شناخت تھا۔ مگر صحیح سمت میں معاملات چلانے کیلئے کوئی مربوط پالیسی نظر نہیں آتی تھی۔

''آپ کی تحریروں میں عورتیں زیادہ نمایاں نہیں ہوئیں، کیوں؟''

''میں ایسی دُنیا میں رہتی ہوں جو میرے حقوق اغوا کرنا چاہتی ہے جب ہم سب پر ایک سی گذر رہی ہے، ہمارا نصیب ایک سا ہے تو پھر میں ساری قوم کو نظر انداز کر کے عورتوں ہی کو کیوں نمایاں کروں؟ مجھے تو فلسطینی عورتوں کو اس حوالے سے بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کہاں کہاں رہ رہی ہیں۔ اگر میں فلسطین میں رہ رہی ہوتی اور تو اور اسرائیلیوں کے مقبوضہ فلسطین میں تب بھی مجھ پر صورت حال زیادہ واضح ہوتی۔ کم از کم میں ایک فلسطینی دُنیا میں ہوتی جس کے نین نقش جانتی بھی

ہوں اور یقین بھی رکھتی ہوں۔ مگر یہاں رہتے ہوئے میں گم ہو جاتی ہوں، مجھے یہاں ایک عرب شہری کے بحرانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مسئلے بھی لگے ہوئے ہیں کہ نہ گھر ہے نہ زمین ہے نہ روزگار ہے اور نہ ہی کوئی حق حقوق ..... تاہم میں عورتوں کا معاملہ کتنی ہی شدت سے محسوس کروں میں اسے ایک ایسے معاشرے میں اولیت نہیں دے سکتی جو سماجی اور سیاسی مشکلات میں گھرا ہوا ہے اور جس کی شفاف حتیٰ کہ اس کا وجود تک خطرے میں ہے۔ مثلاً لبنان میں مردوں کو باہر جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں کیمپوں میں مقفل رکھا جاتا تھا' باہر نہ جانے کی بنا خوف تھا۔ صرف عورتیں معمولی معمولی اجرت والے کام کرنے جاتی تھیں یہاں جابر مرد یا خاوند نہیں بلکہ معاشرہ ہے۔ میں نے اپنی ایک کہانی میں ایک مرد کا ذکر کیا تھا جو اسرائیلی بمباری میں مارا گیا میں نے اس کا اپنی بیوی اور دوستوں سے تعلقات کا ذکر کیا تھا میں عورتوں کے مسائل کا یوں ذکر نہیں کر سکتی گویا ان کے علاوہ اور کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے کیونکہ اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلے موجود ہیں۔ بیرونی دُنیا کے ہاتھوں ہمارے مکمل طور پر ختم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ تاہم میں نے فلسطینی عورت (بیوی) کا خوبصورت خاکہ بھی لکھا جو موت اور دوسرے حوصلہ شکن مصائب کے باوجود مسکرا سکتی ہے۔ پیار کر سکتی ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ انہیں پیار کرنے والے پر اُمید اور درگذر کرنے والے انسان بنانے کیلئے۔ میں دکھاتی ہوں کہ عورت نے زندگی کے دامن کو کس مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے وہ زندگی کو نہ صرف گذارنے بلکہ پیار کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ یہ کہانیاں لکھنے سے میرا یہ مقصد تھا کہ لوگوں کی آنکھیں کھولوں کہ دیکھو یہ عورتوں کی صفات ہیں، یہ عورتوں کے اندر کا خوبصورت جہان ہے اور یہ دکھاؤں کہ وہ کس بہادری سے موت کا مقابلہ کرتی ہیں اور کس بہادری سے زندگی کو جنم دیتی ہیں۔ عورتوں کا مسئلہ میری تحریروں میں گہرائی پیدا کرنے کا سبب ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے نزدیک ایسے معاشرے میں ایک ہی مسئلہ رہ گیا ہے جو معاشرہ عذاب در عذاب میں گھر کر رہ گیا ہے۔ اگر میں ایسے معاشرے میں رہ رہی ہوتی جس میں عورت کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ ہوتا تو میں بھی اپنی تحریروں میں اسے بہت بڑا مسئلہ بناتی۔ جب میں عورتوں کے بارے میں لکھتی ہوں تو ان کو ان کے حالات میں رکھ کر دیکھتی ہوں جن میں وہ زندگی گذارتی ہیں۔ فلسطینیوں کے لیے تاریخ تو ہر روز کی آزمائش ہے۔ حالیہ تاریخ میں ہم پر تاریخی حالات و واقعات نے حکمرانی کی ہے۔

''میں عام عورتوں کے بارے میں باتیں کرتیں ہوں لکھتی ہوں، میں مشہور اور ممتاز قسم کی

عورت کی تلاش نہیں کرتی۔ عموماً عام گمنام افراد کی کہانیاں لکھتی ہوں اور ان کے حوالے سے فلسطین کی تاریخ کو جاننے پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں میں کوشش کرتی ہوں کہ حقیقی واقعات پہلے اکٹھے کروں اور اس پر کہانی کا تانا بانا بنوں جب آپ عام قسم کے لوگوں کی زندگیوں پر غور کریں، ان کی سرگذشت دیکھیں بات سنیں تو ان کے ذریعے ہی بھرپور شاعرانہ تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ آپ کو ادب میں کم اور زندگی میں زیادہ شاعری ملتی ہے۔ عام لوگوں کے پاس تو شاعرانہ تجربات کے ذخیرے ہوتے ہیں اور میرا قلم ان سے مصالحہ حاصل کرتا ہے۔ یوں میری کہانیوں میں کردار پانی کے قطروں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں مائیکروسکوپ کے نیچے رکھ کر دیکھیں تو اس میں ہزاروں زندگیاں سانس لیتی نظر آتی ہیں۔''

''آپ نے اپنی سرگذشت نہیں بتائی؟''

اکثر فلسطینی لڑکیوں کی طرح میں نے بھی خاندان اور سماج کے جبر کے باعث چھوٹی عمر میں شادی کر لی۔ اگرچہ میرا خاندان خاص ممتاز تھا اس کے باوجود مجھ سے توقع کی جاتی تھی کہ میں دوسری زندگی گذاروں۔ میں فراخ دل، ذہین اور آزاد ہو سکتی تھی مگر جب شادی کا معاملہ آیا تو مجھ سے توقع کی گئی کہ میں اپنی پسند کے مرد کی بجائے والدین کے منتخب کردہ مرد سے شادی کروں۔ فلسطینی لوگوں میں چھوٹی عمر میں شادی معمول کی بات ہے۔ جہاں تک نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کا تعلق ہے عرب خاندان کی روائتی پکڑ سے نکلنے کا واحد راستہ شادی ہے۔ اس لئے کہ غیر شادہ شدہ عورتوں کو آزادانہ کام کرنے بولنے حتیٰ کہ سوچنے تک کا حق نہیں ہے۔ یوں میری شادی دراصل آزادی کی طرف ایک قدم تھا۔

''شادی نے میری سرگرمیوں کو کم نہیں کیا مگر شادی کے نتائج یعنی بچوں نے مشکلیں پیدا کر دیں۔ ان کی پوری کی پوری ذمہ داری مجھ پر تھی، جو بیک وقت اچھی بات بھی تھی اور بری بھی ..... میرے لئے یہ بہتر ہوا کہ مجھے ماؤں کے جہاں کا بھی علم ہوا جو یقیناً ایک بھرپور تجربہ ہوتا ہے۔ ماں بننے نے مجھے جذبات و احساسات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت عنایت کی جو صلاحیت کنواری رہ کر مجھے کبھی حاصل نہ ہوتی۔ مجھے لوگوں کے مسائل سمجھنے اور ان سے ہمدردانہ تعلق رکھنے میں آسانی پیدا ہوئی۔ مامتا نے مجھے ادیب کی حیثیت میں صابر بنایا۔ وہ بے خواب راتیں جو میں نے اپنے بچوں کے ساتھ گذاریں اور جس طور ان بچوں نے میری زندگی کی ساری سرگرمیوں کو جامد کر کے رکھ دیا ان سب تجربات نے مجھے یہ سکھایا کہ جس طور صبر قوت

ارادی، اور مستقل توجہ میں بچوں کو دیتی ہوں وہی سلوک مجھے اپنی تحریروں سے بھی کرنا ہوگا۔

بچوں کی پیدائش کے سبب میں وہ تجربے نہ کر سکی جو میں اپنے طور پر کر سکتی تھی جبکہ وہ کیمپ بھی موجود تھے۔ بچوں کو چھوڑ کر جانا اور ایک کیمپ میں اس کی فضا اور نوعیت کے بارے میں لکھنا یہ عملاً ناممکن ہو چکا تھا۔ بچوں نے میرے تجربوں اور کام پر ایک طرح کی حد مقرر کر دی تھی مگر اس کی تلافی میں نے یوں کی کہ صحافت کی دُنیا میں زیادہ سے زیادہ حصہ ڈالا۔ ''جب میں نے محسوس کیا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک کامیاب صحافی ثابت کر دیا ہے (ان دنوں بیروت میں صحافت پڑھنے لکھنے والے پیشوں میں سے ایک اہم پیشہ تھا) اور اب مزید کوئی معرکہ سر کرنے والا نہیں رہا تو میں نے واپس یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور تین سال تک انگریزی ادب پڑھا۔ ماں اور بیوی ہونا یقیناً آپ کو پابند کرتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے میں بھی کامیاب ہونے کی کوشش کریں تو یہ بڑی جان ماری کا کام ہے زندگی کے ایک مرحلے پر میں بیک وقت صحافی، یونیورسٹی سٹوڈنٹ، بیوی، خانساماں، خاکروپ، ماں، بھی تھی اور شام کے بعد (یا جو بھی وقت بچ جاتا تھا) ایک ادیبہ بھی۔ میرا وقت سیکنڈوں تک میں بٹا ہوا تھا اور میں تھک گئی تھی۔ مگر جس طور پر میری پرورش (اکثر عورتوں کی پرورش اسی انداز میں ہوتی ہے) ہوئی اس سے مجھے یہ سب ذمہ داریاں پوری کرنے اور تمام مشکلات کا سامنا کرنے کی توفیق ملی۔ بہت سی عرب عورتیں بڑی صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ مگر ان سے دونوں کام نہیں چل سکے اُنہوں نے خانہ داری اور خاندان کو خوش رکھنے کی خاطر روزگار بھی چھوڑا اور لکھنا لکھانا بھی ترک کر دیا۔''

''مجھے شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ فلسطینیوں کی حیثیت سے ہماری سیاسی صورت حال ناقابل یقین قسم کی جغرافیائی حقیقت کی صورت میں مجھ پر ایک ادیب کی حیثیت میں ٹھونسی جا رہی ہے جس سے میری تخلیقی صلاحیت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ عورت اور ادیب دونوں حقیقتوں میں مجھے پرومیتھیس کے سے ناقابل شکست عزم کی ضرورت ہے جس کے دم پر میں آگے ہی آگے بڑھتی جاؤں۔ مگر اب میں ایک ناگفتہ بہ صورت سے دوچار ہوں وقفے وقفے کے بعد میرا کوئی نقصان ہو جاتا ہے اور پھر اس نقصان کو پورا کرنے کیلئے شروع سے ابتدا کرنا پڑتی ہے۔ مجھے نہیں خبر کہ اس قسم کا پریشان کن تجربات کا مقابلہ میں کہاں تک کر سکوں گی؟''

''مثلاً جب میں چھوٹی تھی تو میں نے بچوں کی کتابیں اکٹھا کرنا شروع کیں جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی یہ لائبریری ہوتی رہی۔ 1967ء میں، لائبریری چھوڑنی پڑی عمان جانا پڑا اور ایسے

گھر میں رہنا پڑتا جہاں نہ کتابیں تھیں نہ کپڑے، نہ بستر، نہ ماضی تھا اور مستقبل کی موہوم سی اُمید ۔جب میں عمان یونیورسٹی میں سٹوڈنٹ تھی میں نے ایک بڑی ادبی اور سیاسی لائبریری بنالی اور جب 1971ء میں ہمیں عمان سے دھتکار کر نکالا گیا تو ہمارے ہمسایوں نے اس لائبریری کو آگ لگادی۔ ہمارے نکالے جانے کے بعد اردن کی حکومت نے منظّم طریق سے انقلابی کتابوں اور نجی لائبریروں کو جلایا اور ان کے مالکان کو سزائیں بھی دیں۔ بیروت میں میں نے فیصلہ کیا کہ ذاتی لائبریری نہیں بناؤں گی کیونکہ میں اپنی قیمتی اشیاء کے ضیاع کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اور چار برس تک میں نے کوئی کتاب نہیں خریدی۔ مگر پڑھنا تو پڑتا ہے اور جب پڑھنا پڑتا ہے تو پھر کتابیں بھی آتی ہیں۔ میں نے ایک ایک پسندیدہ موضوع پر چھ چھ ہزار کتابیں اکٹھی کیں اور پانچ سو ریکارڈ بنائے یہ ریکارڈ اور یہ کتابیں میرے لئے باعث فخر اور باعث مسرت تھیں۔ 1982ء میں بیروت سے نکلتے وقت صرف نائٹ ڈریس کے سوا میں کوئی اور شئے لے کر نہیں نکلی ویسے ہی جیسے 1967ء میں اپنے گھر اریہا سے نکلتے وقت میں نے سرف سونے کے کپڑے ساتھ رکھے تھے۔ پہلے میری بہنیں میرے ساتھ تھیں اب کے میرے بچے میرے ساتھ تھے۔ میں کوئی بھی شئے حتیٰ کہ وہ ٹیپ تک ساتھ نہ لاسکی جس پر میں نے اپنے بچوں کے بولے پہلے پہلے لفظ ٹیپ کئے تھے۔ ایک بار پھر میری دُنیا بالکل بکھر گئی۔

میں نے زندگی بھر کبھی کپڑوں کا زیادہ خیال نہیں رکھا۔ کپڑے ایک بنیادی ضرورت ہیں۔ میں کچھ کچھ سمارٹ تھی۔ لیکن بیروت سے نکلنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ ایک جیکٹ اور ایک پتلون یا جامہ جو میں اکثر پہنا کرتی تھی میں وہ بھی ساتھ نہیں لاسکی وہ بے انتہا مجھے پسند تھے اور مجھے لگتا تھا کہ جب جب میں نے وہ کپڑے پہنے وہ ہمارے اچھے اور خوشیوں والے دن تھے 1982ء میں ان کپڑوں کے بغیر جب میں دمشق میں کپڑے کی ساری دوکانیں بھی میری عریانی نہیں ڈھانپ سکتیں۔ میرے کوئی کپڑے نہیں تھے۔ جو مجھے اپنے لگتے اور جن میں اپنے آپ کو ''میں'' محسوس کرتی۔ اچانک میری یادداشت چلی گئی اور پھر ایک حد تک میں اپنی شناخت بھی کھو بیٹھی۔ میں یہ بھول گئی کہ میں نے زندگی کا بڑا حصہ اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھلانے میں گذارا ہے جن میں رنگا رنگ اریہا، قدیم یروشلم، عمان اور بیروت میں میری کتابیں بھی شامل تھیں مجھے وہ ریکارڈ بھی بھلانے پڑے اور وہ پر لطف موسیقی جن کے بارے میں لکھا کرتی تھی۔ یہ بھول جانے کی یہ خواہش ہے جو فلسطینیوں کو ایک ایسی قوم بنا دیتی ہے جن کی نہ یادداشت ہے اور نہ کوئی

ماضی ..... میں ان یادوں کو اور ماضی کو اپنی تحریروں میں زندہ رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔ میرا سب سے ضروری کام یہی ہے۔''

''آپ چاہیں گی کہ عرب عورت بھی مغربی عورت کی طرح آزاد ہو، مثلاً آپ جنسی آزادی دینا پسند کریں گی؟''

''مغربی عورت آزاد نہیں ہے اس نے چند شعبوں مثلاً شعبہ جنس میں آزادی حاصل کی ہے مگر اب کئی بنیادی حقوق سے محروم ہے اور تعلقات میں بھی عدم توازن کا شکار ہے یورپ میں جنس تعلقات رکھنے کی آزادی اب کوئی طعنہ یا بے عزتی کی بات نہیں رہی اس کے باوجود جنسی تعلقات میں ہی اب بھی عورتوں کو بلیک میل کیا جاتا ہے انہیں مردانہ تعصب اور جبر کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ مغرب میں عصمت دری کے بے شمار واقعات ہوتے ہیں۔ نوجوان عورتوں کو جنسی علامتوں اور معاونین کے جذبات کی تشفی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مغرب میں آج بھی عورت کا جسم ایک نفسانی وجود کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی عورت کے وجود کو فیشن شو کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے خدوخال اور سراپا کے حوالے سے انہیں بیچا بھی جاتا ہے اور قیمت بھی لگائی جاتی ہے۔ مرد کو تو فیشن شو کی یا فیشنی ہونے کی ضرورت نہیں نہ ہی انہیں اپنی جلد یا اپنے قد وقامت اور سراپا کی فکر ہے مگر معاملے تو مردوں کے ہی ہیں جن کے تحت عورتوں کی زندگیوں کو خاص رخ یا روپ بھی دیا جاتا ہے اور ان پر غلبہ بھی مردوں کی بنائی اقدار کا ہوتا ہے مردوں کی نظر میں ہر جنسی اعتبار سے آزاد ہو جانے والی عورتیں پل کی پل میں طوائف بن سکتی ہیں۔ ان کی جنس آج بھی بے شرمی اور معاشری بے وقری کا ایک پکا ذریعہ ہے اور آج بھی مرد اس کے ذریعے عورتوں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ یوں میری نظر میں جو اقدار ہمارے مردانہ غلبہ والے معاشرے میں ہیں یورپ میں بھی ایسی ہی اقدار ہیں جو زیادہ تبدیل نہیں ہوئیں۔ عورتوں کی تحریک کو مشرق اور مغرب دونوں میں ابھی بڑے مرحلے طے کرنے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ مغرب میں عورت کو جنس کی جو آزادی ملی ہے وہ عورتوں پر زیادہ جبر اور استحصال کرنے کی ٹٹی بن گئی ہے۔'' عورت اسی وقت آزاد ہو سکتی ہے جب وہ معاشرے کا آزاد فرد ہو اسے برابر کے مواقع اور تنخواہ ملے اور اس صورت میں وہ جنسی اعتبار سے برابر کی سطح پر لطف لے سکتی ہے اور اسی صورت میں نہ اسے غلط طریق سے استعمال کیا جا سکتا ہے نہ بلیک میل اور نہ ہی اس سے بدسلوکی ہو سکتی ہے۔

MashalBooks.org

''فلسطینی عورتوں کے لیے ناممکن ہے کہ وہ گھریلو زندگی اور عورتوں کے حقوق، برابری اور آزادی کی الگ الگ جدوجہد میں ایک تفریق یا امتیاز پیدا کرسکیں۔ میں نسائت کی ان زنجیروں کو توڑنا چاہتی ہوں جنہوں نے میرے ذہین اور میری روح کو قید کررکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے وطن اور لوگوں کی آزادی کیلئے زیادہ جارحانہ طریق سے لڑتی ہوں۔ ہزاروں فلسطینی عورتوں نے جو جو قربانیاں دے رکھی ہیں۔ وہ میری جدوجہد کو بھی بامعنی بناتی ہیں۔ اسے ایک سمت اور مقصد دیتی ہیں۔ میرا خواب یہ ہے کہ میرا بھی گھر ہو میرا بھی وطن ہو جسے میں اپنا کہہ سکوں، میری شناخت ہو اور میرا پاسپورٹ ہو۔ میں ایک سیکولر غیر فرقہ وار ریاست میں رہنا چاہتی ہوں جہاں عورتیں اور مرد باہمی افہام وتفہیم اور پیار محبت سے برابری کا مقصد حاصل کرلیں گے۔ ایک فلسطینی کی حیثیت سے آزادی کی جو جدوجہد میں کررہی ہوں عورت کی آزادی کی جدوجہد سے الگ نہیں ہے یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔''

فلسطین واحد عرب ملک ہے جس میں مجھے جانے کی اجازت نہیں ہے اس لئے مزید فلسطینی خواتین سے انٹرویو کرنے کیلئے مجھے لبنان اور شام کے مہاجر کیمپوں میں جانا پڑا۔ ان میں سے بعض عورتوں کو **1948**ء کی جنگ اور اسرائیل کے قیام کے بعد زبردستی گھروں سے نکال دیا گیا تھا بعض **1967**ء کی جنگ کے بعد غزہ اور مغربی کنارے سے ہجرت کرکے آئی تھیں اور لبنان پر اسرائیلی حملے کے بعد وہاں سے **1982**ء میں آنے والی زیادہ عورتیں شام میں آباد ہوئیں۔ میری طرح ان فلسطینی عورتوں پر بھی غزہ اور مغربی کنارے کے ان علاقوں کے دروازے بند ہیں جہاں یہ پیدا ہوئیں جبکہ ان کے مقابلے میں اسرائیلی حکام روس، امریکہ اور پولینڈ کے یہودیوں کو یہاں آباد ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔

مونا فلسطین کی ہے اس نے تاریخ میں ماسٹرز کررکھا ہے **1982**ء سے دمشق میں فلسطینی کلچرل سنٹر میں کام کررہی ہے۔ وہ اسرائیل کے مقبوضہ یروشلم اور رملہ میں **1977**ء تک رہی ہے وہ بھی اسرائیلیوں کے خلاف جنگ آزما رہی ہے مگر جب اسے پتہ چلا کہ اسرائیلی اسے ہرصورت گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو وہ 1977ء میں بیروت چلی گئی پھر 1982ء میں دمشق آگئی جہاں میں نے اس سے انٹرویو کیا اور یہ انٹرویو ہی مجھے تصوراتی یروشلم میں لے گیا جسے دیکھنے کے خواب میں دیکھتی رہتی ہوں۔

ملاقات کا وقت صبح دس بجے کا تھا۔ ایک دبلی پتلی، لمبی، مصمم ارادہ رکھنے والی خاتون اپنے

دفتر کے دروازے سے اندر آئی چہرے پر مسکراہٹ بھی ریزوی تھی کہنے لگی ''یقیناً تم بثینہ ہو ہم نے مصافحہ کیا خیر خیریت پوچھی اس کا بایاں ہاتھ اپنے بیگ میں سگریٹ کی ڈبیا تلاش کرتا رہا۔ لگتا تھا کہ وہ بہت مصروف عورت ہے مجھے تھوڑا سا وقت دیا تھا اور چاہتی تھی کہ میں اس وقت کا بھرپور استعمال کروں کہنے لگی ''میں آپ کے منصوبے کی نوعیت سمجھتی ہوں اور میں کوشش کروں گی کہ اپنے جو جو تجربے یاد ہیں وہ پورے کے پورے بیان کردوں جب آپ محسوس کریں کہ میں پٹڑی سے اتر رہی ہوں یا غیر متعلقہ باتیں کر رہی ہوں تو آپ مجھے ٹوک دیں۔''

فلسطینی عورت کی صورت حال غالباً بالکل منفرد ہے۔ ہوسکتا ہے آپ نے دوسری عرب عورتوں کے بارے میں جو نتائج اخذ کر رکھے ہیں وہ آپ دیکھیں گی کہ وہ فلسطینی عورتوں پر لاگو نہیں ہوتے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے کوئی عورت ابتر زمانہ حال کا مقابلہ اپنے شاندار ماضی کے ساتھ کر رہی ہو وہ عہد رفتہ کی یادوں سے لطف لے رہی ہو اور کوشش کرے کہ فلسطینیوں کی موجودہ غیر اطمینان بخش صورت حال سے کوئی رابطہ نہ ہونے پائے۔ جب وہ اس قسم کا رابطہ قائم نہیں کرے گی تو پھر زمانہ حال کو دینے کیلئے اداسیوں اور تاسف کے علاوہ اس کے پاس اور کیا رہ جائے گا۔

اس سے سوالات کرنے سے پہلے میں نے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ میری کتاب فلسطینی عورت یا دوسری عرب عورتوں کے بارے میں پروپیگنڈے کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ میں عرب عورتوں کے بارے میں روائتی اور یکسار قسم کی کتابوں سے جو عموماً مردوں نے لکھیں ہیں بیزار ہوں۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ میں عرب عورتوں کے عذاب وثواب، جدوجہد اور اُمنگوں کو پوری دیانتداری کے ساتھ پیش کرنا چاہتی ہوں ان کی وہ آوازیں سنوانا چاہتی ہوں جو صدیوں سے مذہب، رسم ورواج اور سماجی اور سیاسی مباحثوں نے خاموش کر رکھی ہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور وعدہ کیا کہ وہ مقبوضہ عرب علاقوں میں جہاں وہ 1977ء تک رہی تھی فلسطینی عورت کی حالت زار کا سچا نقشہ پیش کرے گی۔

''میں پڑھے لکھے والدین کے ہاں پیدا ہوئی، میرے والد نے قاہرہ میں تعلیم پائی۔ شعبہ تعلیم میں کام کیا اور انہیں عالم عرب کے ممتاز لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میں فلسطینی عورت کا ٹھپہ نہیں لگتی میرے والد نے کبھی لڑکوں اور لڑکیوں میں امتیاز نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے لڑکیوں کو ترجیح دی اُنہوں نے ہماری تعلیم پر بہت توجہ دی اور ہماری کارکردگی کو

بہتر بنانے کیلئے پوری پوری کوشش کی میری ماں بھی پڑھی لکھی تھیں ان کی انگریزی کمال کی تھی، وہ ہمیں گھر میں تعلیم دیتیں اور ہوم ورک کراتی تھیں۔ گھر میں فضا تعلیم اور کتابوں اور والدین اور بچوں میں دوستی کی تھی۔ مالی اعتبار سے ہمارا حال بڑا اچھا تھا اور ہمارے پاس تازہ ترین بجلی کی چیزیں بھی تھیں۔ میرے والد کو سیاسی معاملات میں بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ دُنیا بھر کے ریڈیو سٹیشنوں سے خبریں سنتے۔ اگرچہ ہمارا اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ فلسطین میں کیا ہو رہا ہے مگر ہم نے بھی والد کی پیروی کی اور دُنیا بھر کی خبریں سنیں۔''

اصلاً ہم مغربی یروشلم میں رہتے تھے 1948ء کی جنگ اور دار یاسین کے قتل عام کے بعد ہم گھر چھوڑ کر مشرقی یروشلم میں آ گئے۔ اُمید ہے کہ آپ نے دار یٰسین کی روداد سن رکھی ہوگی۔ جہاں اسرائیلیوں نے پورے گاؤں کو بڑی مسجد میں جمع ہونے کی درخواست کی اور پھر اسرائیلیوں نے مردوں عورتوں اور بچوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا اسرائیلیوں کی طرف سے ہمیں دھمکایا ڈرایا جاتا اس بنا پر ہمیں مغربی یروشلم چھوڑنا پڑا اور وہ مقامات بھی جو ہمارے جگر گوشے تھے۔ یافا سٹریٹ، مسجد الاقصیٰ، مسجد ضحرا اور کنیت القائمہ (چرچ) وغیرہ وغیرہ۔ وہ عظیم قدیم شہر یروشلم مشرق و مغرب میں تقسیم کر دیا گیا درمیان میں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی جیسی خوفناک دیوار برلن کو تقسیم کرتی تھی۔ میں اور میری سہلیاں مشرقی یروشلم کے اونچے اونچے مقامات پر جا کر مغربی یروشلم میں اپنے گھروں اور کھیتوں، اور جمع حبتھ سے محرومی کا شدت سے احساس ہوتا، ہم اداس ہو جاتے، اور انتہا درجے کی تلخی محسوس کرتے۔ میرے والد کو پھر الف بے سے شروع کرنا پڑا۔ ہمارے اخراجات پورے کرنے اور ہمارے لئے ایک نیا گھر بنانے کی خاطر انہیں دن رات کام کرنا پڑتا۔ چند برسوں بعد وہ زمین کا ٹکڑا خریدنے کے قابل ہو گئے اس پر خوبصورت مکان بنایا اور یہ مکان رملہ میں بنا۔

''1956ء کی بات ہے ان دنوں گھریلو ماحول نسبتاً خاموش اور بہت خوشگوار تھا۔ ہم سب عربی سکولوں میں جاتے جہاں اردنی نصاب پڑھایا جاتا میں المونیہ سکول میں جاتی جو فلسطین اور مغربی کنارے کے بہترین سکولوں میں شمار ہوتا تھا۔ گریجوایشن کے بعد میں نے مختصر عرصہ پڑھایا بھی۔ جب میں نے میٹرک کر لیا تو دمشق یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں داخلہ لے لیا مگر 1967ء کی جنگ کے بعد مغربی کنارے پر اسرائیلی قبضہ کے بعد میرے لئے مشرقی کنارے سے گذر کر دمشق پہنچنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ 1967ء میں ہی اسرائیل نے پورے یروشلم پر قبضہ کر لیا اور

دونوں حصے اسرائیل کی حکمرانی میں آ گئے گویا اردنی نصاب پڑھانے والے تمام عربی سکول اسرائیل کی وزارت تعلیم کی تحویل میں چلے گئے جہاں عبرانی زبان کو پہلی بڑی زبان کے طور پر پڑھایا جانے لگا اور اسرائیلی نصاب بھی رائج کر دیا جو اردنی نصاب کے مقابلے میں بڑا بناوٹی قسم کا تھا۔ میں تعلیمی نظام کے بارے میں بات کر رہی ہوں یہ میرا شعبہ ہے میں اس کے اندر باہر کے سارے معاملات جانتی ہوں اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میں گھر پر رہوں گی اور اسرائیلیوں کے ساتھ مل کر سکول میں نہیں پڑھاؤں گی۔''

1967ء کے بعد جب اسرائیلی حکومت نے مغربی اور مشرقی یروشلم میں آنے جانے کی تھوڑی تھوڑی اجازت دی ہم نے والد پر زور دیا کہ ہمیں مغربی یروشلم میں اپنا مکان دکھائیں جس کے بارے میں ہماری ماں نے ہمیں بہت کچھ بتایا تھا وہ آخر راضی ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ دانتوں کا پولش ڈاکٹر اس گھر میں رہتا ہے۔ ہم نے اسے بتایا کہ کہ یہ ہمارا گھر ہے ہمیں اندر سے دیکھنے کی اجازت دے۔ کہنے لگا کہ بہت لوگ یہاں یہ کہتے آئے کہ یہ ان کا گھر ہے۔ مگر جب ہمارے والد نے گھر کے اندر کی ساری تفصیل اسے بتا دی وہ ہمیں اندر لے جانے پر راضی ہو گیا۔ میری ماں تو آنسوؤں میں ڈوب گئیں اور نیم بیہوشی کی حالت میں رہیں۔ ہم سب بہت رو رہے تھے۔ یہ دن بڑا ہی ہولناک دن تھا۔ ہم واپس رملہ چلے آئے یہ سوچتے ہوئے کہ ہمیں جس ذلت آمیز مقام تک پہنچا دیا گیا ہے اس کا کچھ علاج کرنا چاہیے۔

فوراً بعد ہی میں نے کچھ پر جوش عورتوں سے مل کر جمعیت النساء التعلیم طیبہ کے نام سے شہدا کے پس ماندگان کی مدد کی خاطر ایک سماجی تنظیم بنائی۔ ہم نے اردگرد کے دیہات اور قصبوں میں گھوم پھر کر چندہ جمع کیا جس نے جو دیا ہم نے قبول کیا ہم یہ سب کچھ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتے۔ **1967**ء کی جنگ کے بعد ہماری مارکیٹوں میں اسرائیلی سامان کا سیلاب آ گیا۔ ہم نے ایک جلسہ کیا اور اسرائیل کی تیار کردہ اشیاء پر پابندی لگائی۔ بازاروں میں اسرائیل کے بنائے بسکٹ بہت تھے ہم نے فلسطینی نام کے بسکٹ بنائے جو سپر مارکیٹوں میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہم چاہتے تھے کہ اگر اسرائیل کے بسکٹ نہ خریدیں ان کی جگہ فلسطین کے بنائے بسکٹ لیا کریں اکثر لوگوں نے اس کا مثبت جواب دیا۔ اسرائیلی قبضہ کے خلاف یہ ہماری مزاحمت کا آغاز تھا۔ ہم نے مزدوروں اور کارکنوں سے بھی کہا کہ وہ اسرائیلی کارخانوں میں کام نہ کریں اور اس کے ساتھ اپنے کارخانے کھولنے کا منصوبہ بنایا۔ جتنا زیادہ منافع ہوتا ہم اپنی

گھریلو صنعت کو اسی حساب سے وسیع کرتے رہے تھے کہ ہم اس قابل ہو گئے کہ وہ سب کچھ فراہم کر سکیں جو ایک عام فلسطینی خاندان کے کھانے پینے کی ضرورت ہے۔ ہم نے تقریبات شادی، سالگرہ اور پارٹی کیلئے بھی کھانا تیار کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے بعض ریستورانوں سے ٹھیکہ کیا اور انہیں روائتی کھانے پکا کر باقاعدگی سے فراہم کرتے رہے۔ ہم اپنے شعبہ وار جلسہ کے بعد تیولی (دلی ہوئی گندم میں بنایا گیا خاص عربی سلاد) کی ایک پلیٹ پچاس فلس میں فروخت کر کے پیسے جمع کرتے۔ ہم نے پیسے اکٹھے کرنے کیلئے مختلف طریقے اختیار کئے اور انتہائی قلیل عرصے میں اس قابل ہو گئے کہ ہم نے کرائے کی جگہ لے کر اس میں نرسری اور کنڈر گارٹن کھول لیا اور اس میں ہم بچوں کو گرم گرم کھانا بھی دیا کرتے تھے۔

پھر ہم نے دیکھا کہ اسرائیلیوں نے ہماری روائتی دستکاریوں کی نقل شروع کر دی ہے وہ کشیدہ کاری اور فلسطینیوں کا قومی لباس تیار کرتے۔ چنانچہ ہم نے خود ان دستکاریون کا آغاز کیا۔ ہم نے فلسطینی کشیدہ کاری کیلئے ایک مرکز قائم کر دیا جسے ان کاریگر خانہ دار خواتین نے جو اپنے بچوں کو چھوڑ کر باہر نہیں جا سکتی تھیں بہت پسند کیا ہم ان خواتین کو ضروری سامان دے دیا کرتے تھے وہ کشیدہ کاری کر کے چیزیں سنٹر میں لے آتیں جہاں انہیں معاوضہ ادا کر دیا جاتا۔ ہم یہ سامان نیلام میں بیچ کر سوسائٹی کے لیے خاصی رقم اکٹھی کر لیتے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ہم نے عورتوں کو کشیدہ کاری، کینویس سازی اور لباس سینے کی تربیت دینا شروع کر دی۔ ہم نے ایک پبلک لائبریری اور ایک بیوٹی سیلون بھی کھول دی۔ ہمارا کام انتہائی تیزی سے پھیلا حالانکہ ہم صرف بارہ خواتین تھیں اور وہ دن میں ہمہ وقت پڑھاتیں یا دوسرے کام کرتی تھیں، صرف شام کا وقت وہ رضا کارانہ طور پر سوسائٹی کو دیتی تھیں، اس وقت تک سوسائٹی نے ایک بھی ملازم نہیں رکھا تھا۔ ہماری ہر فیکٹری کی نگرانی مجلس عاملہ کی رکن کرتی تھی۔ دوسرے ملکوں میں مقیم فلسطینیوں نے ہماری سوسائٹی کی کارکردگی کی اطلاع پائی تو اُنہوں نے دل کھول کر عطیات بھیجنے شروع کر دیئے۔ ہمیں بھی تجربہ ہو گیا کہ کون کون سے کام منافع بخش نہیں ہیں۔ جو مالی مدد ملی اور ہمارے رضا کاروں کی مدد سے ہم نے اپنی سرگرمیوں کی خاطر ایک بڑی عمارت بھی تعمیر کر لی اور اس پر ہمارا زیادہ خرچ بھی نہیں ہوا۔

اسرائیلی حکومت نے ہمیں سال بھر میں صرف دو ویلفیئر بازار لگانے کی اجازت دی تھی۔ ہم نے پہلی بار باکفائت لنچ کا تصور عملاً پیش کیا۔ ٹکٹوں کی قیمت ایک اردنی دینار (تقریباً دو

پاؤنڈ) رکھی گئی، عورتیں روائتی ڈشیں مجاز را (دال اور دلی گندم) بناتیں جس کے ساتھ سلاد اور اچار دیا جاتا اکثر لوگوں کو یوں لگا کر وہ خوش خورا کی کیلئے تفریحاً گھر سے باہر آئے ہیں مگر ہمیں اس سے بہت فائدہ ہوا۔ دوسرے سالانہ میلے پر ہم نے بازار لگایا جس میں ہم نے فلسطینی مصنوعات، کشیدہ کاری، لکڑی کے کام، کینوس سازی، سلائی کڑھائی، مشروبات اور تمام گھریلو دستکاریوں کی نمائش کی۔ یہ اسی طرح کا ایک قومی میلہ بن گیا جس طرح مغربی کنارے پر کارنیوال ہے، جسے ہر کوئی دیکھنے جاتا ہے۔ ایک بار ہمارے بازار میں اسرائیلی گورنر بھی ازخود آیا تھا۔ ہم نے دعوت نہیں دی نہ ہم دعوت نامے بھیجتے ہیں ہم صرف عربی اخبارات میں اعلان کرادیتے ہیں۔ ہمیں بہت فائدہ ہوا کرتا تھا جس سے ہم نئے منصوبے شروع کر دیتے۔

1967ء کی جنگ کے بعد ہماری سوسائٹی نے مالی سرپرستی کے نام سے منصوبہ شروع کیا جس پر مجھے بڑا فخر ہے۔ پروگرام یوں تھا کہ بیرون ملک مقیم صاحب حیثیت فلسطینی مقبوضہ عرب علاقوں میں ایک ایک بچے کو منہ بولا بچہ بنالیں اور ان کی اور ان کے خاندانوں کی کفالت کریں۔ اس منصوبے کی اشد ضرورت تھی کیونکہ جنگ کے دوران روزی کمانے والے بے شمار مرد مارے گئے ان خاندانوں کا کمانے والا کوئی نہیں رہا تھا اور ہزاروں عورتیں اور ان کے بچے بے سہارا ہوگئے تھے۔ ہم نے دور دراز کے دیہات تک میں جا کر معلومات حاصل کیں کہ ایسے گھرانے کہاں کہاں اور کون کون ہیں اور ہر گھر کی کفالت عورت یا مرد کرتا ہے اور ان خاندانوں کو کس کس شئے کی زیادہ ضرورت تھی چنانچہ جب ہمارے پاس زائد رقم ہوتی ہم ضروری سامان لے کر ضرورت مند خاندانوں کو دے آیا کرتے۔ ہم نے عورتوں کو پڑھنا لکھنا بھی سکھایا ان کے گھروں کی صفائی بھی کی اور انہیں صحت صفائی کی باتیں بھی بتائیں جب دولت مند فلسطینی چھٹیوں میں آتے تو وہ ان خاندانوں کے ساتھ کچھ وقت گذارتے جنہیں ان کی مالی مدد پہنچ رہی ہوتی۔ یوں ہم نے کئی خاندانوں کے مالی مسائل بھی کسی حد تک حل کئے اور اندرون ملک اور بیرون ملک فلسطینیوں میں جذباتی رشتے بھی استوار کئے۔ اپنی شناخت برقرار رکھنے اور اسرائیلی قبضے کی مزاحمت کرنے کا ایک یہ طریقہ بھی تھا کام کرنے کا عورتوں کا ایک ڈھنگ یوں بھی تھا۔

ہماری سوسائٹی نے ایک اور بہت اہم کام کیا لوک گیت اور لوک کہانیاں اکٹھی کیں۔ ہم دور افتادہ دیہات میں جاتے۔ لوگوں سے چوک میں جمع ہونے کیلئے کہتے اور انہیں مقامی مقبول گیت اور کہانیاں سنانے کیلئے کہتے۔ مجھے یاد ہے جب مصری راہ نما جمال عبدالناصر کا انتقال ہوا

ہم دیہات میں گئے جہاں لوگوں نے ماتم اور مداحی کی ایک قدیم رسم اور طرز نبھائی تھی، لوگ ایک دائرے میں بیٹھ جاتے اور پھر مرنے والے کی تعریف میں گانے گاتے قصے سناتے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے، ہم یہ سب کچھ ریکارڈ کر لیتے۔ پھر ہم نے ایک گاؤں طورمس کے لوگ گیتوں اور کہانیوں کی ایک کتاب چھاپی۔ یہ گاؤں بلھوس اور دیر بزہ میں ہے۔ ہم مقبول عام ضرب الامثال بھی اکٹھا کرتیں، کلچر سوسائٹی کے نام سے ایک پرچہ بھی نکالتیں جس میں لوک کہانیاں اور لوک گیت بھی شامل ہوتے۔ یہ سارا کام صرف عورتیں کیا کرتی تھیں۔ اسرائیل کے قبضہ نے عورتوں میں یہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنی حقیقت سے بھی آگاہ ہوں اور اپنی پوشیدہ صفات کو صیقل کریں۔

''اس سے آپ کیا نتیجہ نکالتی ہیں؟''

دیانتداری سے کہتی ہوں کہ عالم عرب کی تمام عورتوں کے اندر اس قدر جوہر ہے کہ اگر صحیح تاریخی حالات میں اس کی آبیاری کی جائے تو عرب دُنیا کا نقشہ اور شناخت تک تبدیل کر سکتی ہیں۔ آپ کو عرب دُنیا کی عورتوں اور مقبوضہ علاقوں کی فلسطینی عورتوں کی ضرورتوں اور مطالبوں میں کتنا بڑا فرق محسوس ہوگا۔

اس مرحلے پر میں دمشق یونیورسٹی میں تاریخ پڑھانے لگی اور خود بھی پڑھنے لگی۔ میں یروشلم میں پڑھا رہی تھی وہاں تقریباً روزانہ ہی اسرائیلی فوجیوں سے ٹکر ہو جاتی تھی۔ پڑھانا اور روزانہ کام کرنا یقینی نہیں رہے تھے ہمیں روز نئی نئی صورت حال درپیش ہوتی ہم الاقصےٰ مسجد جایا کرتے تھے اللہ کے گھر میں حفظ وامان کیلئے۔ صرف وہی ایسی جگہ تھی جہاں ہم جو کہنا چاہتے تھے کہہ سکتے تھے۔ ہمارے خلاف الزامات میں بہت مبالغہ آرائی کی گئی تھی۔ تاریخ کی استاد کی حیثیت سے میں سامراج کے ہاتھوں درد غلامی کے مصائب اور اسرائیلی قبضہ کے حالیہ عذاب کا موازانہ کرنے کے اہل تھی۔

بعض معتبر ذرائع کا دعویٰ ہے کہ جو خاندان فلسطین چھوڑنے کو تیار نہیں تھے انہیں دھمکی دی جاتی تھیں کہ ان کی لڑکیوں کی عصمت لوٹ لی جائے گی۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ **1948**ء میں کچھ فلسطینیوں نے اخسر الارض ولا الارض (بیٹی کی عصمت لٹانے کی بجائے وطن چھوڑ دو کا نعرہ لگایا) ان حالات میں فلسطینی لڑکیاں اسرائیلی قبضے کے خلاف کیسے مزاحمت کر سکتی تھیں۔

لیکن چھٹی اور ساتویں دہائی میں اسرائیلیوں کے ہاتھوں لڑکیوں کی یہ تذلیل تذلیل نہیں

بلکہ ایک قابل تعریف صفت بن گئی ایسی مظلوم فلسطینی لڑکیوں نے زبردست کارنامے کئے اور ہتھیار بھی اُٹھالئے''

''آپ نے بالاخر مقبوضہ علاقوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''میں سوسائٹی کے رکن اور تاریخ کی استاد کی حیثیت سے سرگرم تھی۔ جو مضمون میں پڑھا رہی تھی بہت اہم مگر بڑا احساس بھی تھا۔ جب میں اپنی تاریخ کے حوالے سے موجود حالات کا موازانہ کرتی اور نتائج نکالتی تو لڑکیوں میں اسرائیلی دشمن کے خلاف جوش وجذبہ پیدا ہوتا۔ میں انہیں اہم قومی تقریبات بھی یاد دلاتی رہتی پھر ہم لوگ مظاہرہ کرتے، ہڑتال ہوتی یا اسی قسم کی کوئی اور کارروائی کیا کرتے ظاہر ہے کہ اسرائیلی بہت قریب سے میری نگرانی کررہے تھے اور مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے میرا پیچھا کرنا شروع کردیا۔ لینڈ زڈے پر ہم نے ہڑتال کردی اور میں گھر پر ہی رہی اسرائیل کے فوجی گورنر نے مجھے گھر پر ٹیلی فون کیا اور کہا کہ میں پاسپورٹ لے کر پولیس سٹیشن پہنچ جاؤں۔ میں تھانے چلی گئی تھانے میں ایک اسرائیلی مرد اور ایک عورت نے بہت موٹی فائل کھول لی اور خوف ودہشت کی فضا میں کئی گھنٹے تک مجھ سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ یہ وارننگ بھی تھی اور دھمکی بھی۔''

میرے پاس بعض قیمتی اسرائیلی دستاویزات تھیں۔ میں گرفتار ہونے سے پہلے ان دستاویزات کو لے کر فرار ہونا چاہتی تھی۔ اسرائیلیوں نے ایٹیز **Eighties** کے نام سے لوگوں کو بے خبر رکھنے کا ایک منصوبہ بنایا تھا اب منصوبے کی اصل دستاویزات میرے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ میں نے اپنے طالب علموں کے ذریعے پرانے یروشلم اور اس کے نواح کے بارے میں جامع معلومات اکٹھی کررکھی تھی وہ بھی میرے لئے بڑا قیمتی مال تھا تعلیمی نظام کے بارے میں میرے پاس معلومات کا خزانہ تھا جو میں اسرائیلی دشمن کی پہنچ سے باہر لے جانا چاہتی تھی۔ تاہم میری نگرانی کڑی ہوگئی اور مجھے پتہ چل گیا کہ وہ مجھے چند ہی دنوں میں گرفتار کرنے کا فیصلہ کرلیں گے۔ (درحقیقت میرے وہاں سے مغربی کنارے آجانے کے ایک دن بعد ہی وہ میرے گھر مجھے ڈھونڈنے پہنچ گئے تھے) میں **1977**ء میں بیروت چلی گئی جہاں سی بی اے، ایم اور پھر پی ایچ ڈی کی میں پی ایل او میں ملازمت کرکے پڑھا بھی رہی تھی اور پڑھ بھی رہی تھی۔ **1982**ء میں فلسطینی ریڈ کراس کے ساتھ رضا کارانہ طور پر کام شروع کیا۔ میں نے کھانا پکایا۔ صفائی ستھرائی کی اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کی۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں بیروت میں ہی رہوں

مگر شاتلہ اور صبرہ کے قتل عام سے ایک روز پہلے آخر کار مجھے بیروت چھوڑنا پڑا۔

آپ فلسطینی عورتوں اور لبنان، شام اور عام عرب عورتوں میں کس طور تقابل کریں گی۔

فلسطینی عورت گھر دار تھی اب اسے کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور جدوجہد بھی۔ بالکل ان پڑھ فلسطینی عورتیں بھی سیاسی اعتبار سے بڑی باشعور ہیں اور بڑے منطقی انداز میں سیاست کے بارے میں باتیں کرتی ہیں۔ بیروت میں ہمارے قیام نے لبنانی عورتوں پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور وہ بھی سیاسی اعتبار سے خصوصاً 1982ء میں جنوبی لبنان پر اسرائیلی یلغار کے بعد باخبر ہوگئی ہیں۔ آپ صرف فلسطینی عورتوں کے کیمپوں میں چلی جائیں آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ عورتیں کتنی زیردست ہیں اور ہر قسم کا کام کس چابکدستی سے کر رہی ہیں۔ جبر ظلم وستم جارحیت اور غاصبانہ قبضہ کی صورتوں میں عورتوں کی کارکردگی نہایت شاندار ہوتی ہے مگر بدقسمتی کی بات ہے کہ جب یہ بحران ختم ہو جاتا ہے تو عورتوں کو عموماً پھر خانہ داری کیلئے بھیج دیا جاتا ہے جیسے ان کی یہ عظیم جدوجہد دراصل ایک قلیل المدت معاہدہ کے تحت تھی۔ مجھے اُمید ہے کہ فلسطینی عورت کا رول کم نہیں ہوگا۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ مقبوضہ علاقوں کی فلسطینی عورتوں کی پوزیشن جلاوطن فلسطینی عورتوں سے بہت بہتر ہے۔ جلاوطن خواتین کے مقابلے میں مقبوضہ خواتین کی آزادی اور مرد عورت کی برابری کی جدوجہد حقیقی اور بڑی موثر ہے۔

''فلسطینی عورتوں کی آزادی اور مغربی عورت کی پوزیشن میں آپ کیا فرق پاتی ہیں''

''دراصل مجھے فلسطینی عورت کا مقابلہ ویت نام کی عورت سے کرنا ہمیشہ اچھا لگتا ہے میرے خیال میں مقابلہ بھی یہی ہے مغربی عورت کام کاج کرتی ہے مگر غیر سیاسی ہے وہ اپنے جذباتی اور مالی معاملات میں الجھی رہتی ہے۔ فلسطینی عورت کے پاس فیشن، خوبصورت بننے اور جلد کی تازگی وغیرہ کیلئے کوئی وقت ہی نہیں ہے۔ وہ مجاہدہ بھی ہے جو فوجی آپریشن بھی کرتی ہے لیکن اس نے بیوی اور ماں والا مقام ترک نہیں کیا۔ اس نے انتہائی مشکل حالات میں باپ' خاوند' بچے گنوا کر اور دوسرے خطروں کے ہوتے ہوئے بھی یہ دونوں رول نبھائے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مغربی عورتوں کے مقابلے میں ہم خاندان والدین اور بچوں کا زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کی تعلیم میں بھی بڑی دلچسپی رہی ہے۔''

اکثر عرب عورتیں کے یہی خیالات ہیں مجھے لگتا ہے کہ اس طرح عرب عورتیں مغرب کی عورتوں کو خاندانی پیچیدگیوں اور مسائل کی ذمہ دار ٹھہراتی ہیں۔ مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ

پر مسرت اور خوشگوار گھریلو فضا بڑی قیمتی شئے ہے مگر ہم یہ توقع کیوں کرتے ہیں کہ یہ خوشگوار برقرار رکھنے کے لیے ہمیشہ عورت ہی قربانی دے؟''

آپ صحیح کہتی ہیں مگر یہ عورت اور مرد دونوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خاندان کی فلاح کے لیے کام بھی کریں اور بچوں کی دیکھ بھال بھی۔ مگر مغربی عورت تھوڑی سی خودغرض ہے وہ اپنے خاوند اور بچوں کیلئے اتنی محنت نہیں کرتی جتنی محنت ایک فلسطینی عورت کرتی ہے۔ مغربی عورت اپنی ذات کی نفی نہیں کرتی جبکہ عرب عورت کی زندگی کی تعلیم میں سب سے بڑا ضابطہ یہی ہے۔

''آپ عورتوں کی جنسی آزادی کے حق میں ہیں؟''

''یقیناً نہیں، جنسی آزادی سے ہر قسم کے جذباتی اور سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں، گھر مکمل نہیں رہتا اور جنسی امراض پھیلتے ہیں جب انسانی تعلقات صرف جسمانی سطح تک محدود ہو جائیں تو پھر ان کی کشش اور اسرار دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔

''مگر آپ ایک مغربی عورت کو کیا جواب دیں گے جو آپ سے پوچھ سکتی ہے کہ آپ ایسی عورت کے اپنے جسم کے بارے میں بنیادی حق کی نفی کا جواز کیا دیں گی جو آزاد بھی ہے سمجھدار بھی ہے اور اپنے ملک کے مستقبل کی تعمیر میں حصہ بھی لیتی ہے اور لڑتی بھی ہے؟''

جسم کو جنسی آزادی ازدواجی تعلقات کے اندر کیوں نہ دی جائے؟ اگر شادی سے مطلب نہیں نکلتا تو آپ کو طلاق لینے کا حق حاصل ہے۔ آپ دوسری شادی کر سکتی ہیں۔ اپنے شریک سفر کے انتخاب میں اگر آپ سوچ سمجھ سے کام لیتی ہیں تو غالباً آپ زیادہ پر مسرت اور بھرپور زندگی گذاریں گی۔ اس کے برعکس بیک وقت کئی مردوں سے جنسی تعلقات انسانی نہیں حیوانی صورت بنتی ہے۔ جنسی تعلق کو دراصل بہت پر مسرت، گہرا اور قریب کا رشتہ بن جانا چاہیے نہ کہ سستی جسمانی خواہش کی تسلی کیلئے کسی کے بستر میں گھس جانے کی حرکت۔ اس کے علاوہ اکثر عورتیں جو اس قسم کا راستہ اختیار کرتی ہیں ساتھی چن چن کر تھک جاتی ہیں۔ وہ عموماً بیزار اور اعصابی مریض بن جاتی ہیں اور ان کے اندر ایک دیرپا پر مسرت اور قربت کا رشتہ قائم کرنے کی حسرت رہ جاتی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو تو اس قسم کے تعلق میں بڑا مزا آ سکتا ہے مگر آخر کار اس کا انجام تنہائی، اعصاب شکنی اور بے بسی پر ہوتا ہے۔ ایک خوش آئند اور محفوظ جنسی تعلق عورتوں کیلئے زیادہ بہتر اور صحت مند ہوتا ہے۔ ساتھی کی بار بار تبدیلی سے عورتیں فائدے میں نہیں رہتیں۔ آپ اپنے کپڑے روز تبدیل کرتی ہیں مگر جس آدمی سے آپ محبت کرتی ہیں اور جسے بخوبی سمجھتی

ہیں اسے تو اس طور تبدیل نہیں کر سکتیں۔ آپ کو نتائج پر غور کرنا ہوگا۔ کیا یہ اچھی بات ہے کہ آپ پانچ دس سال تو جنسی رشتے سے لطف اندوز ہوں اور باقی کی زندگی تنہائی اور مایوسی میں گذاریں؟ میں جنسی آزادی کے اس لئے خلاف ہوں کہ میرے نزدیک اس سے عورت کو کوئی فائدہ نہیں۔

فلسطینی خاتون نبیلہ چار بچوں کی ماں تھی۔ تیونس کے شہری کے ساتھ شادی کی جو 1982ء میں بیروت پر اسرائیلی فضائی حملہ کے دوران مارا گیا۔ جب میں نے اس کے بارے میں سنا تو دل کو اس قدر تکلیف ہوئی کہ میں لرز گئی اور سوچ میں پڑ گئی کہ کیا ایسی خاتون سے انٹرویو کرتے وقت میں اپنے آنسو روک سکوں گی۔ کہیں اس صورت میں انٹرویو کا ناس تو نہیں ہو جائے گا۔ نبیلہ کی کہانی بھی ان فلسطینی عورتوں جیسی ہے جو جلاوطنی میں ملکوں ملکوں بھٹکتی پھریں اور جن کے خاوند بھی مارے گئے اور بعض اوقات بچے بھی جاں بحق ہوئے۔ آخر کار میں نے اسے دمشق کے ایک ریفوجی کیمپ میں ملنے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ ایک خوشگوار اور پر مسرت ماحول میں رہ رہی تھی اور اس کے بچے بھی ہنستے مسکراتے بڑے بامروت اور پیار والے پائے۔ اس قسم کے حالات عموماً عورتوں کی کمر ہمت توڑ کر رکھ دیتے ہیں لیکن بعض اوقات اسی نوعیت کے حالات عورت کے اندر ایک مہاجرہ کی حیثیت سے روزمرہ کے مصائب کا مقابلہ کرنے کی بے پناہ قوت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ اسے بیوہ ہوئے چار سال کا عرصہ گذر چکا تھا مگر وہ بہت خوش وخرم نظر آئی، وہ زندگی سے اتنی بھرپور تھی کہ میں خود سوچ میں پڑ گئی کہ آیا اس کے شوہر کا اس مرحلہ پر ذکر مناسب بھی رہے گا کہ نہیں جبکہ میں یہ توقع کر رہی تھی کہ اس عرصے میں زیادہ تر ذکر اس کے شوہر کا رہے گا میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے یہ پوچھوں کہ شادی سے پہلے اس نے مہاجر کیمپ میں کس طرز کی زندگی گذاری تھی ..... اس کی تو پرورش ہی کیمپ میں ہوئی تھی۔

''میں 1948ء میں عمان میں پیدا ہوئی ہم چودہ بہن بھائی تھے سات بھائی سات بہنیں۔ صرف والد روزگار کماتے تھے مگر ماں بڑا اچھا انتظام کیا کرتی تھیں۔ وہ ہمارے کپڑے بھی سیتیں اور سوئیٹر وغیرہ بھی بنتی تھیں۔ میرے والد کی آمدنی تھوڑی تھی مگر والد اس تھوڑی آمدنی میں بھی اپنے حسن انتظام سے سولہ افراد پر مشتمل گھرانے کو بخوبی چلا رہی تھیں۔ ہمارا خیمہ بڑا پرانا اور ٹھنڈا تھا مگر اُنہوں نے ہم سب کیلئے اسے بڑا آرام دہ گھر بنا رکھا تھا۔ غربت کی تلخیاں اور مہاجر ہونے کی صعوبتوں کے تجربے کی بنا پر میں نے پی ایل او کا رکن بننے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا ایمان تھا کہ صرف مسلح جدوجہد ہی کے ذریعے ہم اپنا وطن آزاد کرا سکتے ہیں اور اپنا ننگ و ناموس

بھی اسی صورت بحال ہوسکتا ہے۔

1971ء میں میں اپنے خاوند سے ملی۔ وہ تیونس کا رہنے والا تھا اور ہم فلسطینیوں کیلئے لڑنے آیا تھا اس بات نے مجھے بڑا متاثر کیا ..... ہمارے تعلقات میں اضافہ ہوا اور 1972ء میں بیروت میں ہم نے شادی کر لی۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ مجھے اس سے بڑی محبت تھی اور ہم ساتھی، دوست اور شریک زندگی کی حیثیت سے بڑی خوش وخرم زندگی گذار رہے تھے۔ بیروت میں دس سالہ قیام کے دوران ہر چند گھر اور بچوں کی زیادہ تر ذمہ داری میری تھی پھر بھی میں خوش تھی ہماری محبت گہری باہمی مفاہمت اور قربت پر مبنی تھی اگر چہ وہ گھر کے زیادہ کام کاج نہیں کرتا تھا مگر بڑا خوش مزاج ہمدرد اور میرے کام کا معترف تھا۔ گھر میں بچوں اور خود اس کیلئے میں جو کچھ کرتی وہ اس سب کا بڑا شکر گذار رہتا۔

1982ء میں لبنان میں سیاسی صورت حال بہت خراب ہوگئی۔ میرے خاوند کی شہادت سے ایک روز پہلے اسرائیلی طیاروں نے بیروت کے اردگرد موجود پلوں پر بمباری کی۔ اس روز وہ آدھی رات کے بعد گھر آیا۔ میں نے اس سے صورت حال کے بارے میں سوال کیا کہنے لگا بہت خراب ہے۔ اگلے روز **17** جولائی **1982**ء کو میری پہلی بیٹی کی سالگرہ تھی اس روز میں اُٹھی تو بہت غمگین تھی جدھر دیکھتی جی چاہتا رو پڑوں۔ میں نے خاوند سے کہا کہ میں سو سال کی بوڑھی لگتی ہوں۔ میرے خاوند نے باہر جانا چاہا مگر چھوٹی بچی نے اسے نہیں جانے دیا اسے بچی کو اُٹھانا پڑا، بچی اس کی خوشبو سونگھتی رہی اور اپنا چہرہ اس کی گردن سے رگڑتی رہی۔ یہ کسی نحس واقعہ کے ہونے کا پکا اشارہ تھا۔ میں بعض اوقات وہمی ہوجاتی ہوں۔ وہ دفتر چلا گیا۔ میں نے بیٹی کو لیا اور اپنے دفتر چلی گئی۔ آدھ گھنٹے کے بعد ہمارے دفتروں پر اسرائیلی طیارے بمباری کر رہے تھے اور ہمارے روشن دن کو ہولناک تاریک رات میں بدل رہے تھے۔ میں نے بچوں کو سکول سے لیا پھر میں کس طرح گھر پہنچی مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ جب بمباری ختم ہوئی اور وہ ہماری خبر لینے نہ آیا تو میں جان گئی کہ وہ ختم ہوگیا ہے۔ میں ملبے میں اسے تلاش نہ کر سکی۔ چنانچہ میں نے بچوں کو لیا اور اس علاقے سے نکل آئی۔ اب بچے سر بسر میری ذمہ داری تھے۔ اگلے روز میں امریکن یونیورسٹی ہسپتال گئی جہاں وہ ایسے لیٹا تھا جیسے سویا ہوا ہو۔ ہزاروں بیویاں، مائیں اور بہنیں میری طرح اجڑ گئی تھیں ..... اب کہنے کیلئے کیا بچا تھا۔

''میں جب دوسری عورتوں کے دکھ دیکھتی ہوں تو اپنے بھول جاتی ہوں۔ وہاں وہ ان پڑھ

عورتیں بھی تھیں جو کوئی ملازمت نہیں کرتی تھیں، ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا، بے شمار بچوں کو پالنا پوسنا تنہا ان کی ذمہ داری تھی ان کے شوہر مر گئے تھے۔ میں دوسری عورتوں کے بارے میں زیادہ پریشان ہوتی ہوں۔ مجھے اپنا دکھ بڑے تالاب میں ایک قطرے کے برابر لگتا ہے۔ سینکڑوں نوجوان فلسطین عورتیں جن کی شادی کو زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا تھا جیون ساتھیوں سے محروم ہو گئیں اور ہزاروں بچے ہیں جن کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چنانچہ اب مجھے فلسطینی عورتوں اور فلسطین کے مسائل کا زیادہ احساس ہوا ہے۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری عورتیں زندگی گذارنے کے لیے کس قدر تیار ہیں۔ جس طرح میں اور سینکڑوں دوسری عورتیں گھر اور بچے سنبھالتی اور ملازمتیں کرتی ہیں دوسری سماجی ذمہ داریاں پوری کرتی ہیں، کوئی مرد یہ مشکل کام نہیں کر سکتا۔ اس گلی کے موڑ پر ایک فلسطینی عورت رہتی ہے جس کا شوہر بیرون ملک گیا اور آج تک واپس نہیں آیا۔ اس نے دن رات محنت کی' ایک خوبصورت گھر بنایا نوخوبصورت بچے پالے پوسے سب کے سب بڑے زہین، مہذب، ملنسار اور خوش اطوار ہیں۔ فرض کریں اس کا شوہر یہاں ہوتا اور بیوی کو کوئی خطرناک مرض لگ جاتا؟ وہ اسے میکے چھوڑ آتا اور بچے آوارہ ہو جاتے۔ مگر یہ عورت سلیقہ مند تھی کہ اس نے گھر کو سنبھالے رکھا اور بچوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کی انہیں معاشرے کے قابل فرد بنا دیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے برابر ہی نہیں بارہا مردوں سے بھی اعلیٰ تر نکلتی ہیں۔

بلاشبہ، فلسطینیوں کی جدید تاریخ میں انہیں شاتلہ اور صبرہ ایسے بدترین المیے دیکھنے پڑے مگر یہ المناک واقعات عورتوں کی عظمت کے ناقابل تردید ثبوت بھی ہیں۔ شاتلہ کے قتل عام کے ایک سال بعد وہاں کی ایک عورت نے مجھے اپنا قصہ سنایا۔ کہنے لگی کہ اس کہرام کے دوران پانی کی شدید قلت پیدا ہوئی۔ وہ اپنے جاں بلب والد کے لئے پانی تلاش کرنے نکلی۔ کئی گھنٹے کی تلاش اور انتظار کے بعد اس نے اپنا جگ پانی سے بھر لیا۔ مگر گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ٹھوکر کھائی، گری اور پانی ..... انمول پانی فرش پر بہہ گیا جو پہلے ہی لہو سے تر بتر ہو چکا تھا، اس سے بڑی آفت تو اس پر اور کوئی نہیں آسکتی تھی، وہ روتے ہوئے باپ کی طرف دوڑی جو فوراً جان گیا کہ ہوا کیا ہے اور اسی دم دُنیا سے منہ موڑ گیا ..... صدمے سے یا پیاس سے یا دونوں سے اگلے روز اس کا بھائی مارا گیا اور اسے بھی ایک فلسطینی مجاہد نے ملبے میں سے نکالا۔ اس مجاہد سے اسے محبت تھی جو شادی کی صورت پا گئی۔ حاملہ ہوئی باپ بے تابی سے نئے

آنے والے کا انتظار کر رہا تھا مگر بیٹا پیدا ہونے سے کچھ مہینے پہلے ہی اسرائیلی بمباری کی وجہ سے مارا گیا۔ وہ صرف نو ماہ سہاگن رہی اور اس کا خاوند باپ اور بھائی کے مرنے کے چند ماہ بعد جاں بحق ہوا۔ جب یہ تمام عذاب اس پر آئے اس کی عمر صرف پچیس برس تھی صرف دو چیزیں ہیں جنہوں نے اسے زندہ رکھا ہوا ہے ایک اس کا بیٹا دوسرے شادی کے بعد اپنے خاوند کے ساتھ سہانے لمحوں کی کچھ تصویریں۔ وہ ان ہزاروں عورتوں میں سے ایک ہے جو صبرہ اور شاتلہ میں سیاہ پوش ہیولوں کی صورت میں گھومتی رہتی ہیں وہ خاوندوں کے گذارے پر مسرت دنوں کو یاد کرتی ہیں اور اپنے بچوں کی پرورش کیلئے ہر دم کوشاں رہتی ہیں ..... یہی احسن کام وہ کر سکتی ہیں۔''

''یہ بہت مضبوط عورتیں ہیں مگر عموماً عورتوں کو صنف نازک کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہ ان کا دفاع مردوں کے دفاع کے مقابلے میں ایک چوتھائی ہوتا ہے۔ آپ ان دونوں میں مطابقت کیسے پیدا کرتی ہیں؟''

''مجھے خبر نہیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ عورتوں کے کمزور جنس ہونے کا تصور ہمیں ورثے میں ملا ہے اور تصور روایات اور عادات کی اندھی تقلید کی وجہ سے راسخ ہوا۔ ہمیں شروع دن سے پڑھایا گیا کہ مرد آقا ہے اور عورت خواہ مرد سے کتنی بھی بالاتر ہو اس کی محکوم ہے۔ پوری تاریخ خصوصاً تاریخ کے نازک زمانے گواہ ہیں کہ عورتوں نے اپنے آپ کو بڑا مضبوط، مستعد اور قابل اعتماد ثابت کیا ہے۔ اب عورتوں کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ زنانہ تنظیموں کے ذریعے منظم ہوں اور دُنیا سے اپنی قدر و قیمت منوائیں۔''

کبھی میرا خیال تھا کہ مرد عورتوں کو کمتر ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں اور وہ اس لئے کہ وہ عورت کی صلاحیتوں اور جوہر سے خائف ہوتے ہیں۔ یونیسکو نے ایک مضمون شائع کیا ہے اسلام اور عورتوں کے بارے میں اس سے میرے خیال کو تقویت ملتی ہے۔''

''ہاں میں نے بھی ایسی سینکڑوں عورتیں دیکھی ہیں جو اپنے مردوں سے کہیں زیادہ قابل تھیں، مگر انہوں نے بیوی کی حیثیت سے ثانوی پوزیشن قبول کر رکھی ہے اور وہ اس لئے کہ گھر میں ازدواجی تعلقات کو ثابت و سالم رکھیں اور ان کے بچے پرسکون فضا میں پرورش پائیں۔ ان کی شادیاں بھی ان کا مقدر بن گئیں اور اس مقدر کو انہوں نے قبول کر لیا۔ عورتیں اپنے بچوں کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہیں اسلئے وہ کمزور بھی اور غیر موثر بھی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک جنسی مسئلہ کا تعلق

ہے ہم ایک منافق معاشرے میں رہتے ہیں جس میں سرعام کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں مگر نجی طور پر ہر شئے مباح ہے۔ یہاں اکثر لوگ دو دُنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک پرائیویٹ زندگی جس سے وہ بڑے لطف اندوز رہتے ہیں مگر اس کے بارے میں کسی کو خبر نہیں ہونے دی جاتی سماجی یا ظاہر اُ زندگی جس سے وہ لوگوں میں جانے جاتے ہیں مگر یہ ان کی اصلی زندگی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کیلئے یہ زیادہ معنی رکھتی ہے۔ عرب معاشرے میں بعض بڑے تلخ مسائل موجود ہیں، منافقت اور اپنے یا دوسروں کے ساتھ دیانتدار نہ ہونا۔ میرے خیال میں یا تو ہمیں عزت، ننگ و ناموس اور اخلاقیات کے بارے میں بلند بانگ دعویٰ چھوڑ دینے چاہئیں یا ہم انتہائی پاک صاف اور بالاتر ہو کر نیم فرشتے بن جائیں۔ ہمارے قول و فعل میں جس قدر فاصلہ ہے وہ ہمیں نہ صرف جنس کے معاملات میں جبکہ سماجی، اخلاقی، ذہنی اور مذہبی اُمور میں بھی ہذیانی بنا دیتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کی علمبردار خواتین زندگی کو زیادہ پاکیزہ اور دیانت دار بنانے کی طرف گامزن ہیں وہ اپنے نظریات زیادہ راست روی اور وضاحت سے پیش کر رہی ہیں۔ میرے خیال میں اب وہ وقت دور نہیں جب ہر کوئی ان کی بات سمجھنے بھی لگے گا اور کچھ ردعمل بھی ظاہر کرے گا۔

''خاوند کی وفات کے بعد آپ کیلئے سب سے مشکل مسئلہ کون سا تھا؟''

سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی ایسا نہیں جس سے میں بات کر سکوں، ناراض ہو سکوں یا گلہ کر سکوں، ہر چند اس کی زندگی میں بھی زیادہ تر کام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا مگر ایک پیار کرنے والے اور صحیح معنوں میں ساتھ دینے والے رفیق کی موجودگی بھی میرا بڑا سہارا تھی۔ میں دوسری عورتوں کو اپنے مسائل سنا کر ان کا وقت برباد نہیں کرتی۔ مجھے اندازہ ہے کہ میری طرح وہ بھی گھر، بچوں، ملازمتوں اور خاوندوں سے متعلق ذمہ داریاں نبھا رہی ہیں۔ میری جاننے والی اکثر عورتوں کیلئے ان کے خاوند بھی بچے کی طرح ہیں۔ وہ ان کے بارے میں پریشان رہتی ہیں اور پھر ان کے دن بھر کے معاملات میں بھی معاونت کرتی ہیں۔ اس پر بھی وہ شکر گذار ہوتی ہیں کہ ان کا خاوند ہے تو سہی۔

''آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اگر آپ کا شوہر آپ کی جگہ ہوتا تو وہ آپ کیلئے وہ کچھ نہ کرتا جو آپ اس کیلئے کر رہی ہیں یعنی اس کے نام کو بھی زندہ رکھا ہے اور اس کے بچے بھی پال رہی ہیں ..... اس تضاد کے بارے میں سوچ کر آپ پریشان نہیں ہوتیں؟''

''نہیں یہ بات مجھے پریشان نہیں کرتی۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں اس کیلئے کر رہی ہوں

وہ میرے لئے ہرگز نہ کرتا لیکن میں اب بھی اس سے محبت کرتی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہی ہوں اس پر خوش ہوں۔ اسے یاد کر کے اور اس کے بچوں کو پال کر مجھے خوشی ہوتی ہے میں دوسری شادی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ میں اس کی یاد میں مگن رہنے اس کے بارے میں سوچنے کیلئے آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے دل و دماغ میں کوئی دوسرا مرد آ ہی نہیں سکے گا۔ آپ سے سچ کہوں مجھے بالکل پرواہ نہیں کہ مرنے والا میری طرح کبھی زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ سوچنے کا میرا انداز ہے میں اس طرح محسوس کرتی ہوں، میں یہ سب کچھ فرض کے طور پر نہیں کر رہی تو پھر یہ کیوں توقع کروں کہ وہ ہو بہو میری طرح ہوگا؟ اسے میرے مقابلے میں مختلف وطیرہ اختیار کرنے کا حق تھا۔ یہ میرے خیالات، میری اپنی زندگی اور میری اپنی اقدار ہیں۔ یہ اقدار عورتوں کی خاص اقدار ہیں۔ یہ مجھے اس قدر عزیز ہیں کہ میں دُنیا کی بڑی سے بڑی شئے کے عوض بھی انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ حقیقت کہ مرد ان روایات کو سربلند رکھ سکتے ہیں نہ ان کی تکریم کر سکتے ہیں مجھے لمحہ بھر کے لیے پریشان نہیں کرتی۔ میرے سارے مرد کامریڈ میری عزت کرتے ہیں مگر میں پوری طرح اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ اگر میں نے دوسری شادی کا سوچا بھی تو وہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔

''فرض کریں آپ ایک روز اپنے دفتر میں اپنے نئے خاوند کے ساتھ پہنچتی ہیں تو آپ کے ساتھی کیا کہیں گے؟''

''مجھے پتہ نہیں، ممکن ہے مجھے مکمل طور پر رد کر دیں۔ جب تک میں بچوں، اپنے گھر اور قومی نصب العین کے لیے قربانی دینے کو تیار ہوں میرا خیال ہے کہ بطور بیوہ مجھے بڑی تکریم ملتی ہے۔ میں اگر ایک بار ان فرائض کی ادائیگی میں ٹھوکر کھا گئی تو پھر ایک عورت ایک کامریڈ کی حیثیت سے میری قدر و قیمت مشتبہ ہو جائیگی .....جب تک میں تنظیم میں کام کر رہی ہوں، بچے پال رہی ہوں، خاندان قائم رکھا ہوا ہے میں اچھی ہوں مگر کوئی یہ سوچتا ہی نہیں کہ ایک فرد کی حیثیت سے میری بھی کچھ ضرورت ہے۔ عورت کی حیثیت سے مجھ سے توقع کی جاتی ہے کہ دوسروں کیلئے زندہ رہوں میں ایک ایسا نہ ختم ہونے والا سرچشمہ ہوں جسے صرف دینا ہے لینا کچھ بھی نہیں اگر میں اپنی ضروریات کو اپنے بچوں اور اپنے گھر کی ضرورتوں پر ترجیح دوں تو میری طرف سے اسے ایک قسم کی غداری سمجھا جائے گا۔ میرا یقین ہے کہ مردوں نے دیدہ دانستہ ہم عورتوں کا اس طرح کا تصور بنا رکھا ہے کہ ہم بڑی مضبوط، ناقابل شکست، پیار اور ساتھ دینے

والی ہیں، ہمیں بس دینا ہی دینا ہے۔ اس کے صلے میں لینا کچھ نہیں۔ بعض اوقات مجھے اپنے آپ پر بھی افسوس ہوتا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں بھی انسان ہوں، جسے محبت، پیار، ہمدردی اور رحم کی ضرورت ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی خود کو کمزور اور بے بس محسوس کروں اور ارد گرد کوئی ہو جو میری دستگیری کرے مگر عورتیں خصوصاً بیوہ عورتیں مجبور ہیں کہ اس خیال کو پاس نہ آنے دیں۔''

آپ کی یہ ساری داستان سننے کے بعد ایک مغربی عورت کو آپ کیا جواب دیں گی جو آپ سے یہ پوچھے گی کہ آپ اپنی زندگی کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟ آپ فرد کی حیثیت سے کیا سمجھتی ہیں؟ آپ ماں ہیں، پی ایل او کی رکن ہیں کسی کی دوست کسی کی ہمسائی ہیں مگر ہاں سماج اور قوم کے عائد فرائض کے اندر آپ کے اصل وجود کا جو دم گھٹ رہا ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مجھے نہیں علم کہ میں اسے کیا جواب دوں گی۔ مجھے یہی کہنا پڑے گا کہ یہ میرا مقدر ہے یہ میرا معاشرہ ہے جسے نہ میں تبدیلی کر سکتی ہوں نہ تو نظر انداز کر سکتی ہوں مجھے اس کی آزادی کا صرف ایک پہلو قابل رشک نظر آتا ہے کہ وہاں عورت کو کوئی بری نظروں سے نہیں دیکھتا اور نہ ہی اس کے بارے میں سماج میں گپ بازی ہوتی ہے۔

''عرب اور مغربی دونوں عورتیں کہیں فائدے میں ہیں اور کہیں گھاٹے میں۔ مغربی عورت نے زیادہ تر ذاتی، سماجی اور تعلیمی حقوق حاصل کر لئے ہیں، مگر ان حقوق کو بعض اوقات زیادہ پھیلا دیا جاتا ہے کہ وہ گھر ایسے ادارے کی اہمیت کم کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی عورتیں اپنے خاندان کیلئے قربانی دینے کے لیے تیار نہیں۔ بہر طور مغربی عورت عرب عورت کے مقابلے میں بہت بہتر پوزیشن میں ہے۔ جو کچھ مغربی عورت نے حاصل کر لیا ہے۔ ہمیں وہ حاصل کرنے کیلئے ابھی لمبا سفر کرنا ہے۔''

عین اس وقت ایک چھوٹے قد اور کھلے رنگ والا آدمی آیا جس کی توند بڑھی ہوئی تھی۔ میری دوست نے اس کا گرمجوشی سے دوستانہ انداز میں خیر مقدم کیا۔ اس نے بھی مسکراہٹ کے ساتھ اسے مخاطب کر کے کہا ''ہم عورتوں کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں، اور بھلا کیا کریں گی؟''

''اس موضوع پر میرے اپنے ذاتی نظریات ہیں'' اس کی آواز میں زعم تھا میں باز نہ رہ سکی

اور کہا ''اکثر مردوں کے اپنے ہی نظریات ہوتے ہیں لیکن اکثر یہی ہوا کہ عورتیں جس طور سوچتی اور محسوس کرتی ہیں اس سے مردوں کے نظریات لگا نہیں کھاتے۔

اس شخص نے الجزائری عورت کے بارے میں باتیں شروع کر دیں اور ان کے حالات کا مقابلہ فلسطین کی عورتوں کے موجودہ حالات سے کرنا شروع کر دیا۔ وہ بڑی دیر تک خود ہی بولتا چلا گیا اور پھر اس نے میرے ٹیپ ریکارڈ کو ایسے دیکھا جیسے ابھی اس کا نوٹس لے رہا ہو، کہنے لگا کہ میں پوری طرح تیار نہیں ہوں اس لئے ٹیپ ریکارڈ کو بند کر دو۔

میں نے فوراً جواب دیا ''افسوس وہ تو میں نے پہلے ہی بند کر دیا اس لئے کہ میری کتاب تو صرف عورتوں کے خیالات کے لیے وقف ہے، مرد عورتوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، کتاب کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ جو کچھ وہ کہنے کا تہیہ کر چکا تھا کہتا چلا گیا۔ چنانچہ میں نے جانے کی اجازت چاہی مگر دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے مجھے دعوت نامہ دیا دو ایک روز میں ہونے والی عورتوں کی دستکاریوں کی نمائش کے بارے میں۔ کارڈ دیکھتے ہی خاتون نے حیرت زدہ نظروں سے پوچھا۔ ''آپ نے یہ کارڈ کہاں سے لئے؟''

''زیادہ تر تو ہمیں نے تقسیم کئے ہیں'' اس نے نرم مگر مضبوط انداز میں جواب دیا اور میرے چلنے سے پہلے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلا کر چلا گیا۔ بلاشبہ لفظ ''ہمیں'' میں مضبوط، طاقت وار اور ''بہتر صنف'' یعنی مرد ذات کی جھلک تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ معاملہ عورتوں کی دستکاریون کی نمائش کا تھا اور فلسطینی عورتوں کی تنظیم اس کا اہتمام کر رہی تھی جس تنظیم کی مجلس عاملہ کی یہ خاتون رکن بھی ہے اس کے باوجود اس خاتون کو تو ابھی یہ دعوت نامے یا پمفلٹ دیکھنے کو نہیں ملا مگر مرد ہیں کہ وہ انہیں بانٹتے پھرتے ہیں۔ وہ خاتون بھی بڑی خفیف نظر آ رہی تھی اور میں اس سے مشکل سوال کر کے اس کی خفت بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

نمائش دمشق میں فلسطینی مہاجرین کے کیمپ الفحیم کے مرکز میں ہوئی نمائش کے داخلے والی بڑی گلی میں زیادہ تر مرد تھے۔ یقیناً اپنی بیویوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا ''شاید ان دستکاریوں میں ان کی کوئی دلچسپی نہیں مگر جب میں اصل عمارت میں گئی اور دیکھا کہ وہاں بھی عورتیں اکا دکا ہیں اور مرد زیادہ تو مجھے لگا کہ میں نے غلط رائے قائم کی تھی۔ میں نے جن عورتوں سے بات چیت کی تھی یا ملی تھی وہ تو نہیں تھیں مگر ان کے خاوند ضرور تھے۔ ان میں

سے ایک سے میں نے پوچھا'' آپ کی بیگم کہاں ہیں؟'' وہ تو گھر میں ہے عورتوں کی شرکت کی توقع نہیں کر رہا تھا وگرنہ ساتھ لے آتا۔'' اس نے جواب دیا۔

عمارت میں چاروں طرف مرد ہی مرد تھے عورتیں چند ایک ہی تھیں جو مٹھائی، مشروبات اور پوسٹر تقسیم کر رہی تھیں۔ لعنت ہو، میں بڑبڑائی، یہ عورتوں کی نمائش ہے اہتمام بھی عورتوں کی تنظیم نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں کیا ہے اس کے باوجود یہاں پر بھی عورت کو دوسری صف میں رکھا گیا ہے۔ افتتاحی تقریب میں مرد تو ہم ہما کر آئے تھے مگر عورتیں چند ہی وہاں گھس سکیں۔ مردوں نے بھرپور کوشش کی۔ کہ وہ یہاں پر مالک ارض نظر آئیں۔ مگر اس بہت بڑے ہال میں عورتوں کے کئے کام سے صرف ایک بات واضح اور سیدھے انداز میں ثابت تھی کہ اصل خالق عورتیں ہیں۔ یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ جن عورتوں نے اتنے قتل عام، المیے اور مصائب دیکھے ہیں اُنہوں نے ان تجربات کو نفیس کشیدہ کاری کی صورت دے دی ہے۔ فلسطینی عورتوں کے لباس کے اگلے حصے پر جو نقش و نگار بنے ہوتے ہیں وہی انہوں نے شیشے، برتنوں اور سیاسی پوسٹروں پر بھی نقل کر دیئے ہیں۔ عورتوں کے ماہر ہاتھوں نے موت کو پیاری پیاری بلیوں کا روپ دے دیا تھا۔ اور لہو کا رنگ صرف فلسطینی کشنوں پر استعمال ہوا تھا۔ جس تھیلے میں بم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ گلاب کے گلدستے رکھنے اور معشوق کو تحفہ دینے کے کام بھی آ سکتا ہے۔ فلسطین کا ایک بڑا نقشہ تھا جس پر فلسطین میں پیدا ہونے والی فصلیں دکھائی گئی تھیں یہ نقشہ ایک شاہکار نظر آتا تھا۔ فلسطینی کو نباس (کفتان جو مرد لوگ گرمیوں میں پہنتے ہیں) اور فلسطینی لباس بڑے شاندار تھے۔ اوپر کے کمرے میں فلسطینی کھانے تھے فوراً پیک کر کے گھر لے جانے کیلئے عورتوں نے ان کے علاوہ بعض ایسے کھانے بھی تیار کئے تھے جو صحت کو بہتر بنانے کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ دو عورتیں مجھ جیسی کاہل عورتوں کو مغربیہ پکانا سکھا رہی تھیں جو واقعی بڑی لذیذ شئے ہے۔

اس نمائش نے ہر کسی کا ایمان پکا کر دیا کہ فلسطینی عورتوں نے المیوں کو بے مثال مہارت سے خوبصورت فنون میں تبدیل کر دیا ہے، لہو کو موسم گل کے نکھار میں، قوم کی خزاں کو بہار میں اور دلوں میں چھپی آہوں کو خوبصورت خیالات میں بدل دیا گیا تھا۔ نمائش فلسطینی عورتوں کے جذبات کی گہرائی اور ان کے جذبہ تخلیق کی ممکنہ وسعت کی آئینہ دار تھی۔ اس میں شک نہیں کہ نمائش میں مرد ادھر ادھر اچھلتے کودتے پھرتے تھے اس کوشش میں کہ خود کو عورتوں سے برتر ثابت کر سکیں۔ نمائش سے باہر آنے تک نمائش میں مردوں کی غیر معمولی حاضری سے مجھے ان سے

نفرت کی بجائے ان آقاؤں پر ترس آنے لگا جنہیں ایک روز بہر کیف اس مخلوق کو اگر اپنے سے
برتر نہیں تو برابر ضرور تسلیم کرنا پڑے گا جنہیں آج اُنہوں نے اپنے جور و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے۔

MashalBooks.org

الجزائر: شریک جدوجہد

الجزائری خواتین نے ایک سو تیس سال تک الجزائر پر حکومت کرنے والے فرانسیسی استعمار پسندوں کے خلاف جنگ آزادی (62-1954) میں حصے لے کر بڑا نام کمایا اور ان میں شاندار کام کرنے والی ہیروئن کہلائیں۔ اس جنگ آزادی میں ایف ایل این (نیشنل لبریشن فرنٹ) کے اندر اک جگہ سے دوسری جگہ تک پیغام پہنچائے، برقعوں میں چھپا کر اسلحہ پہنچایا اور خود بھی جنگوں میں عملاً مسلح ہو کر لڑیں۔ فرانسیسیوں نے بے شمار الجزائری خواتین پر ظلم و ستم توڑے ان میں سے جمیلہ یوپاشا اور جمیلہ بوہیری کو چار دانگ عالم میں شہرت ملی۔

انقلاب کے بعد کے معاشرے میں خواتین نے اپنا مرتبہ بھی منوایا۔ آج الجزائر کے سکولوں اور یونیورسٹیوں میں نصف تعداد لڑکیوں کی ہے۔ خواتین انجینئر ہیں ڈاکٹر ہیں، پارلیمنٹ کی رکن ہیں اور ایک وزیر بھی ہے۔ مزدوروں اور طلبا کی یونینوں کی طرح عورتوں کی بھی قومی یونین ہے جس پر ایف ایل این سی کا کنٹرول ہے مگر یونین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ قومی سیاسی زندگی میں کردار ادا کرے۔

لیکن عالم عرب کی طرح الجزائر میں بھی کچھ دوسری طاقتیں اس کے برعکس سرگرم ہیں۔ مسلمان بنیاد پرستوں یا کٹھ ملاؤں کے بڑھتے ہوئے اثر کے باعث الجزائر کے کوچہ و بازار اور تعلیمی درس گاہوں میں برقع پھر نظر آنے لگا ہے۔ 1976ء میں اختیار کئے گئے نیشنل چارٹر ڈ کے ذریعے ملک کے سیکولر اور سوشلسٹ اُصولوں کی جگہ اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب بنا دیا گیا اس کے بعد سے خاندانی قوانین میں اصلاح کی رفتار بھی بڑی سست ہو گئی ہے۔ اور بعض رائج شدہ اصلاحات کو ختم کر کے ان کے بالکل برعکس چیزیں وضع کر لی گئی ہیں۔ اور پھر 1976ء میں الجزائر کی پارلیمنٹ نے ایک فتویٰ جاری کیا جس کے ذریعے مرد کے تعداد ازدواج کے حق کو تسلیم کر لیا گیا تاہم پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری قرار دیا گیا۔ جب ہم لندن میں بیٹھ کر عالم عرب کے نقشے پر نظر دوڑاتے تھے تو نگاہیں ہمیشہ اس نو آزاد اور نو عمر ملک الجزائر پر گڑ جاتی تھیں

جس نے اپنی قومی شناخت اور آزادی کے حصول کے لیے طویل جدوجہد کی اور بہت خون دیا۔ ہمیں الجزائر میں کام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہم ان کے انقلاب نو کی تعمیر اور استحکام میں کردار ادا کر سکیں، یہ بات میرا شوہر اور میں اس وقت کیا کرتے تھے جب ہم پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ پھر اس نے لندن سے الجزائر درخواست بھجوائی اور اسے ملازمت مل گئی میں نے ایک سال بعد ڈاکٹریٹ کیا وراس کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

الجزائر تک فضا نے بتایا کہ ہم مشرقی الجزائر پر پرواز کر رہے ہیں اور کھڑکی میں سے شہر کا نسٹیٹبائن کو دیکھا جا سکتا ہے جن چیزوں پر سب سے پہلے نظر پڑی وہ خوبصورت پہاڑیاں گہری وادیاں اور سرسبز جنگلات تھے جنہوں نے شہر کو گھیر رکھا تھا اور جب ہمارا جہاز اترنے لگا مجھے ایسے لگا جیسے شہر کانسٹینٹائن خیالوں میں تراشا ہوا شہر ہے۔ پورا شہر دو بڑی چٹانوں پر آباد ہے جو جگہ جگہ پلوں کے ذریعے ملا ہوا ہے اور ایک بلاستون پل تو ایک گہری پتھریلی وادی سے ملا انتہائی خطرناک نظر آیا حالانکہ جہاز میں سے جب اس پر نظر پڑی تھی تو وہ بہت محفوظ نظر آیا تھا لوگ پھر بھی اس پر سے گذرتے اور اردگرد کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے۔ کہیں کوئی بنجر ٹکڑا نظر نہیں آتا تھا جہاں جنگل یا سبزہ نہیں تھا وہاں الجزائر کی زمین کے کنٹراسٹنگ رنگ نظر آتے تھے۔ جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے گہرے سرخ ٹکڑے کی حد پر سیاہ رنگ کا بارڈر اور اس کے آگے گہرا زرد یا زرد سلیٹی رنگ۔ بعد میں جب الجزائر میں بہت سے علاقے دیکھے اور بڑا سفر کیا تب پتہ چلا کہ زمین کا اس طرح رنگ دار ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ زمین بڑی زرخیز ہے اور خوش ذوق فرانسیسی اسی لئے اس خوبصورت ملک میں ہر قیمت پر آباد ہونا چاہتے تھے۔

میڈم المنو راب اکاون برس کی ہیں اُنہوں نے الجزائر کے انقلاب میں حصہ لیا تھا۔ اب وہ خانہ دار خاتون ہیں چار بچے ہیں۔ دو لڑکیاں دو لڑکے۔ میری بیٹی فریدہ کی عمر اکیس برس ہے شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہے اس کے بچوں کی عمر چھ اور چار سال ہے۔ وہ انگریزی ایم اے کی طالبہ تھی کانسٹینٹائن یونیورسٹی میں پڑھتی تھی جمیلہ اُٹھائیس سال کی ہے۔ اس نے شادی نہیں کی وہ پوسٹ گرایجوایٹ انگریزی کی طالبہ ہے۔

میں نے دن کے تین بجے ان سب سے بیک وقت ملاقات طے کی۔ دروازہ فریدہ نے کھولا اور ایک بڑے اور قیمتی قسم کے ساز و سامان والے کمرے میں لے گئی۔ کمرے کی تین بڑی بڑی کھڑکیاں اور نرم سبز پردے کمرے کو بڑا آرام دہ بنا رہے تھے۔ کانسٹینٹائن یونیورسٹی میں میں

نے جن کو پڑھایا ان سب سے زیادہ ذہین فریدہ نہ صرف میری طالبہ ہے بلکہ میری دوست بھی ہے۔اپنے کام میں بڑی دلچسپی رکھتی ہے پراعتماد ہے اور آگے بڑھنے کا شعور اور جذبہ بھی ہے۔

چائے پیتے وقت فریدہ کی ماں میڈم المنور نے الجزائری انقلاب میں عورتوں کے رول پر بڑا فخر کرتے ہوئے گفتگو کی اور پانچویں دہائی کا مقابلہ آٹھویں دہائی سے کیا۔انہیں اس بات پر بھی بڑا فخر تھا کہ عورتوں نے آزاد الجزائر کا جو خواب دیکھا تھا اس کی انہیں تعبیر بھی مل گئی ثبوت یہ کہ ان کی بیٹی اس یونیورسٹی میں ایم اے کر رہی ہے۔ان کی بیٹی کے خیالات ان سے مختلف تھے۔

فریدہ پھٹ پڑی کہ عورتوں کے لیے کوئی اُمید نہیں ہم آگے کی بجائے پیچھے جا رہے ہیں، پہلے ہم اپنے دوست لڑکوں کو گھر چائے پر بلا لیا کرتے تھے اور ریکارڈ بھی بجاتے تھے مگر اب خصوصاً اخوان المسلمین کے سامنے آنے کے بعد میرے بھائی چھوٹی بہن کو کسی مرد سے بات تک کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ جب سکول میں میرے بچے کو استانی یہ سبق دے کہ اللہ ان عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو گاڑی چلاتی ہیں، سگریٹ پیتی ہیں یا میک اپ کرتی ہیں یہ چھ سالہ بچہ جب سکول سے باہر آتا ہے تو دوست کی کار میں بیٹھ کر گھر آتا ہے کیونکہ اسے اس کے دوست کا باپ چلا رہا ہوتا ہے جبکہ میں خود گاڑی چلاتی ہوں اور دوسری بات یہ کہ میں ''عورت'' ہوں ایسی صورت میں حالات کہاں ٹھیک ہوں گے بچہ ایک بار گھر آتے ہوئے کہے گا ''ماں جب اللہ نے کہا ہے کہ سگریٹ نہ پئیں تو پھر آپ سگریٹ کیوں پیتی ہیں اور جب ہمارا مذہب میک اپ کو پسند نہیں کرتا تو پھر آپ میک اپ کیوں کرتی ہیں۔اندازہ لگائیے کہ میرے بیٹے کی نسل عورتوں کے بارے میں آگے چل کر کیا حکم لگائے گی۔مردوں کے کہنے کے مطابق مانع حمل دواؤں کا ذکر تک کرنا گناہ ہے ان کا استعمال تو دور کی بات ہے۔عورتوں کو یہ ثابت کرنے کے لیے مسلسل بچے جتنے رہنا چاہیے کہ ان کے خاوندوں سے تعلقات بہت اچھے ہیں۔

میں میڈم المنور سے مخاطب ہوئی ''آپ نے الجزائر میں انقلاب برپا کرنے کیلئے کام کیا، جیل میں گئیں مگر آزادی کے بعد واپس ماں اور بیوی کے فرائض سنبھال لئے۔خانہ داری کی طرف توجہ لوٹ جانے پر آپ کیا محسوس کرتی تھیں؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ انقلاب نے آپ کی سماجی اور گھریلو پوزیشن بدل دی ہے یا یہ کہ جہاں سے آپ گھر کا کام چھوڑ کر نکلی تھیں سلسلہ وہیں سے آپ کو جوڑنا پڑا۔

''آزادی کی جدوجہد والا زمانہ تو مختلف زمانہ تھا۔اس کے بعد تو ہم بچھڑتے گئے، اتنا پیچھے

تو نہیں گئے کہ تمام آغاز سے بھی پیچھے جا پہنچتے پھر بھی انقلاب کے باعث کچھ حاصل ہوا ہے۔ ہم پہلے سامراج کے غلام تھے۔ انقلاب کے بعد ہم آزاد قوم ہیں۔ میں نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا حالانکہ اس میدان میں داخل ہوتے وقت یہ خیال واضح نہیں تھا کہ آخر کار ہمیں حاصل کیا ہوگا۔ اُنہوں نے ہمیں جیلوں میں ڈالا ہم پر تشدد کیا مگر ہم پر جتنا جبر ہوتا ہمارا عزم اور پختہ ہوتا جاتا۔ جب میں جوان لڑکی تھی میں صورت حال کی پیچیدگی سے بالکل بے خبر تھی۔ ہمیں تو انقلابات یا فرانسی یا کسی امر کے بارے میں کچھ پڑھایا نہیں گیا تھا۔ تاہم ہم سے فرانسیسی جو سلوک کیا کرتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارے حالات کس قدر خراب ہیں۔''

''جب آپ مجاہدوں سے ملیں تو شادی شدہ تھیں؟''

''فریدہ میری گود میں تھی، دو سال کی۔''

''اس پر آپ کے خاوند کا کیا ردعمل تھا؟''

ہم دونوں تنظیم میں ایک ساتھ شامل ہوئے۔ اُنہوں نے مجھے وہ کچھ کرنے کا حوصلہ دیا جو وہ خود نہیں کر سکتے تھے میں برقعے میں ہتھیار لے کر شوہر کے دوستوں کو پہنچاتی جن سے وہ خود نہیں مل سکتے تھے ان کے پیغامات کا تبادلہ بھی میرے ذریعے ہوتا۔ میں فرانسیسی بڑی اچھی طرح بول لیتی تھی اس لئے فرانسیسی سپاہیوں سے بات بھی کر لیتی اور کسی چیک پوسٹ سے گذرتے ہوئے کوئی مشکل بھی پیدا نہ ہوتی۔ ایک مرحلے پر اُنہوں نے مجھے پکڑا' جیل میں ڈالا اور پھر میرے خاندان کے ہر فرد کو بھی قید کرنا شروع کر دیا۔ جب مجھے خبر ہوئی کہ وہ میرے ہم وطنوں اور میرے وطن کے ساتھ کس قدر برا سلوک کر رہے ہیں تو تب مجھے یہ احساس ہوا کہ جنگ تو شروع ہو چکی ہے۔ اور میدان جنگ سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں نے 1955ء میں تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ایک سال بعد طلباء کی بڑی زبردست ہڑتال ہوئی۔ میں انقلابیوں کی طرف سے طلبا کو پیغام دیا کرتی کہ وہ اپنی ہڑتال جاری رکھیں۔ میں شہروں اور پہاڑوں میں زخمی ہونے والے مجاہدوں کی طبی امداد کا انتظام بھی کرتی ڈاکٹر لاتی اور انہیں دوائیں بھی فراہم کرتی۔ میں مسلح لڑنے والوں کے ساتھ بھی رہتی مجاہد غیر مسلح صورت میں میرے ساتھ چل رہا ہوتا جبکہ میں نے اسلحہ اسے دے دیتی۔ ہم نے اپنے لڑنے والوں کے شناختی کارڈ بھی (سرکار سے) بنوا رکھتے تھے جن کی وجہ سے انہیں چیک پوسٹوں سے گذرنے میں بڑی مدد ملتی۔ گرفتار ہونے والوں پر جب اس قدر تشدد ہوا کہ وہ مرنے لگے تو اُنہوں نے ہمارا نام بتا دیا چنانچہ مجھے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا

گیا۔ سامراجی طاقتوں کو ہم جیسے متحرک اور سرگرم لوگوں کو پکڑنے کا ڈھنگ آتا ہے وہ جس طور تشدد کیا کرتے تھے آج اس کا یقین نہیں آتا حتیٰ کہ جن لوگوں پر تشدد ہوا انہیں بھی یقین نہیں آتا جب ہمیں ظلم وستم یاد آتے ہیں تو ہم اکثر اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں'' کیا سچ ہے کہ فرانسیسیوں نے یہ یہ کچھ ہمارے ساتھ کیا تھا۔'' اُنہوں نے میرے سارے خاندان کو قید میں ڈال دیا اور الگ الگ شہروں، میری دوسالہ لڑکی کو اس کی دادی کے سپرد کر دیا گیا، میں سال بھر جیل میں رہی اور اس سارے عرصے میں مجھے پتہ نہیں تھا کہ آیا میرا شوہر اور دوسرے ساتھی زندہ ہیں کہ مر چکے ہیں؟ اس دوران میں میری چھوٹی بیٹی بھی بڑی مفید ثابت ہوئی جس کی نپی میں بہت ضروری دستاویزات پلاسٹک کے بیگ میں بند کر کے رکھ دیتی تھی۔ اس کے کھلونوں میں بھی دستاویزات پلاسٹک کے بیگ میں بند کر کے رکھ دیتی تھی۔ اس کے کھلونوں میں بھی دستاویزات اور ضروری پروپیگنڈا لٹریچر بھرا ہوتا۔ میرے شوہر بھی دو سال تک جیل میں رہے 1958ء کے بعد میرا گھر کارکنوں اور مجاہدوں کی ملاقاتوں کا مرکز بن گیا۔

''کیا فرانسیسی جیلوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں سے نرم سلوک کیا کرتے تھے؟''

''نہیں وہ سب سے ایک جیسا ہی سلوک کرتے تھے۔ وہ عورتوں کے ساتھ بھی اتنے ہی ظالم تھے جتنے مردوں کے ساتھ۔ اگلے روز میں اپنی ان دنوں کی دو ساتھیوں سے باتیں کر رہی تھی تو ہم نے آپس میں کہا کہ یہ یقین کرنا بھی مشکل ہے کہ ہم نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ہماری اولاد یونیورسٹیوں میں پڑھ رہی ہے۔ فرانسیسیوں نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا تھا اس کے بعد زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم اور ہمارے ساتھی کتنا کچھ کرتے جبکہ کچھ خاندان ایسے بھی تھے جنہوں نے آزادی کیلئے بہت ہی کم کام کیا مگر فرانسیسیوں نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم بے انتہا خوش نصیب ثابت ہوئے۔''

جدوجہد آزادی کے دنوں میں آپ نے خانہ داری اور انقلاب کا کام بیک وقت جاری رکھا؟

''ان دنوں ہم گھریلو ذمہ داریاں بھول گئے تھے۔ بس جب مجاہد اور سپاہی پہاڑوں سے نیچے آتے تو ان کے کپڑے دھوتے تھے اور ان کے لیے کھانا پکاتے تھے تاہم وہ بھی لڑنے والے تھے اور ہم بھی لڑنے والے۔ یہ مجاہد جو پہاڑوں سے اتر کر آتے یہ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اور جو

ہم یہاں تھے تو ہم سے مراد ہے عورتیں اور مرد دونوں ..... انقلاب کے دنوں میں اس کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا کہ کس نے زیادہ کام کیا اور کس نے کم کیا۔ ہم سب اس انقلاب کے سپاہی تھے جسے ہمیں آزاد کرانا اور ہماری شناخت بحال کرانا تھی۔ مرد بھوکے پیاسے، تھکے ہوئے اور میکے کچلیے ہوتے مگر ان کے آنے پر ہم بہت ہی خوش ہوتے ایک انقلابی جذبہ تھا اور اتحاد کا گہرا شعور۔

''ہم نے زیادہ نہیں پڑھا تھا میرا تعلق ایک انقلابی خاندان سے تھا۔ میرے والد فرانسیسیوں کے خلاف نظمیں لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ جدوجہد شروع ہوئی تو میں نے اپنے بچپن کو یاد کرتی تھی اور یہ نظمیں بھی۔ اس طرح مجھے دُشمن کا مقابلہ کرنے میں آسانی رہی۔ جب مجھے فرانسیسیوں کے جور وستم یاد آتے ہیں تو میرا جی کہتا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا اس سے زیادہ کرنا چاہیے تھا میرا جی چاہتا ہے کہ جب ہماری باری آئی تھی تو ہم نے زیادہ مہذب رویہ اختیار کیا حالانکہ ہمیں بھی سخت گیر ہونا چاہیے تھا۔''

آزادی کے بعد آپ واپس خانہ داری میں چلی گئیں' اور بچے پیدا کئے۔ آپ نے اپنی زندگی میں کوئی ڈرامائی تبدیلی محسوس کی تھی؟ آپ کو احساس ہوا کہ ایک عورت کی حیثیت سے آپ کی ذاتی زندگی پر انقلاب نے کوئی اثر ڈالا؟

جدوجہد کے دنوں میں میں نے فیصلہ کیا تھا کہ مزید بچے پیدا نہیں کروں گی وجہ یہ تھی کہ ہم کبھی اندر رہوتے تھے اور کبھی باہر فریدہ کی پیدائش کے بعد جو 1954ء میں دو سال کی تھی میں نے گیارہ برس تک بچہ پیدا نہیں کیا۔ جو عورتیں قصبوں اور شہروں میں تھیں انہیں انقلاب کیلئے زیادہ کام کرنا پڑا ان کے مقابلے میں پہاڑوں اور دیہات والی عورتوں کو کم صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ 1957ء کے بعد انقلاب کے لیڈروں نے لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ وہ شہروں میں ہی رہیں لیکن عورتیں اسلحہ لے کر پہاڑوں پر جاتی رہتی تھیں ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ انقلاب نے میری نجی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ ہماری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تبدیلی یہ تھی کہ اب ہم آزاد ہوگئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میرا شوہر ایک آزاد شہری بن گیا جسے اپنے معاشرے پر فخر ہے میں بھی آزاد عورت ہوگئی تھی گویا سماجی اعتبار سے ہماری زندگیاں تبدیل ہوگئی تھیں مگر ہماری گھریلو زندگی بالکل تبدیل نہیں ہوئی''

یہاں فریدہ نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''سمجھتی ہوں کہ انقلاب کے دوران

الجزائری مردوں نے الجزائری عورتوں کو استعمال کیا ہے۔ مردوں نے آپ کو بھی اسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح وہ اپنے ہتھیاروں کو استعمال کرتے ہیں۔ آپ کو انقلاب سے کچھ نہیں ملا، کچھ بھی تو نہیں ملا۔''

''نہیں'' ماں نے کہا'' مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ اگر ہم نے انقلاب کے لیے جدوجہد نہ کی ہوتی تو ہم یہاں نہ ہوتے اور نہ انگلش میں ایم اے کر رہے ہوتے۔''

''میں مردوں کے رویے کے باوجود ایم اے کر رہی ہوں اور اس کے لئے ان کی شکر گذار نہیں۔'' فریدہ نے کہا۔'' آپ ان مردوں کو دیکھیں جو ہمارے ساتھ پڑھتے ہیں جب ہم کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں یا اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو ہمارے منہ پر کہتے ہیں کہ نہیں یہ تمہارا منصب نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں یہ وہ بدترین ورثہ ہے جو فرانسیسی ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں، میڈم المنور نے کہا'' میرا نہیں خیال کہ دو ایک نسلوں کے بعد یہ صورت حال یونہی رہے گی۔ ایک اوسط آدمی یونیورسٹی یا یونیورسٹی سے باہر الجزائری عورت کو ماں کے روپ میں دیکھتا ہے جو اس کے لیے کھانا پکاتی ہے اور صفائی دھلائی کرتی ہے دوسری طرف وہ ایسی عورت شریک سفر بنانا چاہتا ہے جو اس کے ساتھ ساتھ رہے اور دوستوں اور ساتھیوں سے دوستانہ تعلقات رکھے۔ مرد کا ایک مسئلہ یہ ہے۔ وہ ایک ساتھی اور ایک نوکر میں سے انتخاب کرنے کے اہل نہیں ہے۔ وہ دونوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ الجزائری مرد کو شعور آتے آتے دیر لگے گی کہ اسے ان دو قسم کی عورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔'' فردیدہ نے جواب دیا'' میرا خیال ہے کہ الجزائری مرد آگے کی بجائے پیچھے جا رہا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ میرے والد میرے خاوند سے بہتر ہیں اور میرا شوہر میرے بیٹے سے بہتر، میرے والد نے فرانسیسی زن و مرد کو دیکھا اور اپنے بچوں کیلئے وہی کچھ اختیار کیا جسے فرانسیسی مرد اپنے بیوی بچوں کیلئے اچھا سمجھتے ہیں۔ اس زمانے (فرانسیسیوں کے جانے) سے مرد پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ جو آپ کی والدہ نے کہا ہے وہ ٹھیک بات ہے'' میں نے کہا مردوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ کس قسم کی عورت سے شادی کریں۔ تعلیمی لحاظ سے برابری والی عورت یا ماں ایسی خدمت گذار ..... مگر اب اس عرصے میں عورت اپنے مسائل کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ وہ عورت جو تعلیم ملازمت اور تنخواہ میں اپنے شوہر کے برابر مگر کام سے

فارغ ہو کر اسے گھر جا کر کھانا بھی پکانا ہے صفائی دھلائی بھی کرنا ہے اور بچوں کو بھی توجہ دینی ہے؟ فریدہ تمہیں یہ کچھ کرنا پڑتا ہے یا تمہارا شوہر معاملہ فہم ہے؟ اگر وہ گھر آئے اور اسے اس وقت کھانا تیار نہ ملے تو کیا کل کل کرے گا؟

کرے گا، فریدہ نے کہا بہت بڑا فضیحہ ہوگا میرا شوہر اپنے گھر میں اکلوتا لڑکا تھا۔ ایک ماں اور دو بہنیں ہر وقت اس کی خدمت کیا کرتیں۔ اگر وہ دیکھے کہ اس کا لنچ تیار نہیں ہے تو وہ جھگڑ پڑے گا اور اگر وہ ایسی قمیص پہننا چاہے جو استری نہیں ہوئی تو یہ ایک اور جھگڑا ہوگا۔ آپ جانتی ہو یہ بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ دوسرا ہاتھ ہرگز نہیں بٹاتا۔ آج آپ نے دیکھا وہ باہر چلا جاتا ہے۔ اور دو بچوں کی دیکھ بھال میرے ذمے ہوتی ہے۔ نو بجے سے بچوں کے سونے تک میری یہی مصروفیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں تھوڑا سا پڑھتی ہوں لیکچر تیار کرتی ہوں اس پر وہ مجھے کہہ گا کہ میں بیٹھوں نہ پڑھوں اور نہ اسے تنہا چھوڑوں۔ وہ کہتا ہے کہ جب وہ سو جائے اس کے بعد میں اپنا کام کروں۔ یعنی میرا اصل کام یہ ہے کہ میں اس کی مدد کروں اور یونیورسٹی کا کام اس کے بعد کا ہے۔ الجزائری مردوں کی نظر میں عورتیں محض ایک شئے ایک وجود ہیں اور یہی ان کی حقیقت ہے۔

''مگر تم ایسے شخص کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہو جو تمہیں بس ایک شئے ایک وجود سمجھتا ہو؟''

''اگر بچے نہ ہوتے تو میں اس شخص کے ساتھ کبھی بھی نہ رہتی' فریدہ نے کہا'' اس نے مجھے بے شمار کام کرنے سے روک دیا۔ بی اے ہونے کے باوجود میں آٹھ برس تک یونیورسٹی میں پڑھاتی رہی۔ اگر میں شادی شدہ نہ ہوتی (اس ضمن میں میرے بچے میرے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتے) تو میں بہت عرصہ پہلے ہی ایم اے، اور ڈاکٹریٹ کرنے انگلینڈ چلی گئی ہوتی۔ میری بعض ہم جماعتوں نے تو ڈاکٹریٹ کر لی اور ایک میں ہوں جو یہاں ایم اے کرنے کیلئے ٹکریں مار رہی ہوں''

آپ کی حکومت میں صرف ایک ہی وزیر ہے میڈم ظہور ونسیی کیا وہ واقعی الجزائری خواتین کی صحیح نمائندہ ہے؟

''ہرگز نہیں'' فرید نے کہا'' ہمارے منہ بند کرنے کیلئے اسے وزارت دی گئی ہے حکومت کہتی ہے یہ خاتون تم میں سے ہے اسے وزارت دے دی ہے تم اور کیا چاہتی ہو؟ پھر ہماری خواتین کی تنظیم ہے یونیفا ..... ملک میں خواتین کی واحد تنظیم جو عورتوں کیلئے کچھ

بھی نہیں کرتی۔اس نے یہ بات بھی قبول کر لی ہے کہ مرد چار بیویاں رکھ سکتے ہیں۔یونیفا سرکاری تنظیم ہے۔اس لئے یہ کوئی ایسا کام کرنے کیلئے تیار نہیں جو حکومت کو پسند نہیں اور حکومت تو مردوں کی ہے۔مرد ہمارے حقوق کیلئے نہیں لڑیں گے۔ہمیں خود اپنے لئے لڑنا پڑے گا۔''

''تمہارے خیال میں الجزائری عورتوں کے مسائل کا حل کیا ہے؟''

''حل یہ ہے کہ یونیفا میں ایسی پڑھی لکھی عورتیں گھس جائیں جو صحیح معنوں میں عورت کی آزادی کی قائل ہیں۔عورتوں کے حقوق کیلئے کام کرنے والی کچھ خواتین یونیفا میں شامل ہوئی تھیں مگر ایک سال کے عرصہ میں انہیں معلوم ہوا کہ وہ عورتوں کیلئے کچھ نہیں کر سکتیں چنانچہ وہ مستعفی ہوگئیں۔میڈم المنو ربولیں ''عورتیں اپنے حقوق کیلئے ہماری طرح لڑیں فرانسیسیوں کے خلاف اور ہم نے آخر آزادی حاصل کر لی۔ میں ہمیشہ نوجوان خواتین سے کہتی ہوں کہ وہ اپنی جنگ اس طرح لڑیں جیسے ہم نے لڑی تھی۔اور یہ کوئی شرمانے والی بات نہیں۔یہی وہ جنگ ہے جو آپ کو زور یا بدیر لڑنی ہے''

فریدہ نے مداخلت کی'' آپ نے ایک دُشمن فرانس کے خلاف جنگ لڑی، وہ آسان لڑائی تھی، آپ اپنی حکومت کے خلاف کیسے لڑ سکتی ہیں؟ اور پھر ایک لڑکی اپنے باپ، بھائی یا خاوند کے خلاف کیسے لڑ سکتی ہے؟

میڈم المنو رنے جواب دیا'' وقت مدد کرے گا۔مگر اتنا وقت نہیں ہے۔اس کا جواب تعلیم ہے صرف تعلیم کے ذریعے ہی عورت اپنی بے خبری سے آزاد ہوتی ہے مگر یہ اسے سماجی زنجیروں سے آزاد نہیں کرتی۔ جب میں اکیلی ہوتی ہوں تو آزاد ہوتی ہوں مگر جب خاوند کے ساتھ ہوتی ہوں تو آزاد نہیں ہوتی، اور میں معاشرے میں بھی آزاد نہیں ہوں جب میں رات گئے کتاب پڑھ رہی ہوتی ہوں تو آزاد ہوتی ہوں میں جو سوچنا چاہتی ہوں اور جو پڑھنا چاہتی ہوں پڑھتی ہوں مگر یہ آزادی بڑی محدود اور ذاتی ہے یا یوں کہئے کہ یہ اندر کی آزادی ہے۔اس لئے کہ جو میں چاہتی ہوں وہ تو نہیں کر سکتی حتیٰ کہ جو کہنا چاہتی ہوں وہ بھی نہیں کہہ سکتی۔

''حل کیا ہے؟ ابھی تم نے کہا ہے کہ تم نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کر لیا ہوتا مجھے یقین ہے تم نے یہ کچھ کر ہی لیا ہوتا مگر الجزائر میں صرف ایک ہی عورت تو نہیں ہو جو سوچتی ہو کہ تم بہتر کام کر لئے ہوتے۔ یہ بتاؤ کہ تم جیسی تمام عورتوں کے لیے کیا حل ہے؟''

''ہاں۔ یقیناً۔ میرے خیال میں ان معاملوں کو اکٹھا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ میرا

مطلب ہے الجزائری عورت کیلئے یہ بڑا مشکل کام ہے۔ میری بہت سی ایسی دوستوں نے جن کی اچھی ملازمتیں ہیں اپنی خاندانی زندگی قربان کردی ہے۔ انہیں طلاق مل گئی۔''

تو کیا تمہارے نزدیک یہ اس قسم کا فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل کام ہے؟

''ہاں بہت مشکل ہے خاص طور پر اس وقت جب آپ کے بچے بھی ہوں۔ مرد تو بدلا جا سکتا ہے۔ مگر بچے .....! پھر جمیلہ ایک ایسے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے جسے وہ چاہتی بھی نہیں ہے نہ کوئی کام کرتا ہے نہ اس کا فلیٹ ہے نہ کوئی اور شئے وہ اسے پاس بلانے کیلئے کرایہ بھی دیتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

کیا شادی کرنے کیلئے عورت پر سماجی دباؤ ہوتا ہے؟

''ہاں'' جمیلہ نے کہا اسی لئے تو میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے خفت کا سامان بنتی جارہی ہوں جب کبھی ہمسائیاں یا ملنے والے ہمارے گھر آتے ہیں میری ماں کے کان میں کہتے ہیں'' بے چاری جمیلہ، اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا کامیاب رہی مگر شوہر کے بارے میں خوش قسمت نہیں نکلی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میرے تعلیمی اور پیشہ ورانہ کارنامے اپنی جگہ پر لیکن اگر میں شادی نہیں کرتی تو مجھ پر ہمیشہ رحم کھایا جائے گا۔ یہ شخص ایک عمر سے میرے گرد چکر کاٹتا چلا آرہا ہے اور لگتا ہے کہ میرے والدین بھی اس سے خوش ہیں تو پھر اسی سے شادی سہی۔ اب کیا تردد کروں کہ کیا وہ صحیح آدمی بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے شاید کبھی بھی صحیح آدمی کا انتخاب کرنے یا اس آدمی کیلئے انتظار کرنے کی آزادی ملے گی۔ میں الجزائر میں نہ آزاد ہوں یا نہ ہی اپنی تکمیل کرسکتی ہوں، مجھے صرف اس قدر آزادی حاصل ہے کہ زندہ رہوں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کہ میں کس آدمی کے ساتھ زندہ ہوں۔ حساب برابر ہے۔ میری یہ حسرت ہے کہ کاش میں الجزائر کی بجائے دُنیا میں کہیں بھی پیدا ہوگئی ہوتی۔''

''تمہارا مطلب ہے عورت کی حیثیت سے؟''

ہاں عورت کی حیثیت میں؟

گویا تمہارے نزدیک الجزائر عورتوں کے لیے اچھی جگہ نہیں ہے۔

''ہرگز نہیں۔ اس مقام سے بہت دور ہے۔ شام، عراق کسی بھی اور عرب ملک کی مثال لے لو تمہارے ہاں کچھ روایات اور اقدار ہیں۔ اور انہیں تو ان ممالک کے عوام جانتے ہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارا واحد عرب ملک ہے جو سربسر دو مختلف ثقافتوں میں برباد ہوگیا ہے۔ ہم

پر فرانسیسی ثقافت اور تاریخ کے گہرے اثرات ہیں۔اس سے کبھی کبھی واہمہ ہوتا ہے کہ ہم فرانسیسی عورتوں کی طرح آزاد ہوسکتی ہیں۔دوسری طرف الجزائر میں عرب اور اسلامی ثقافت کے احیا کا سلسلہ چل رہا ہے اور بہت دور تک پہنچ گیا ہے حالانکہ گذشتہ دو صدیوں میں یہ قصہ عرب ممالک میں بھی فرسودہ ہو چلا ہے۔اس طرح نہ ہم عرب ہیں نہ یورپین یعنی نہ یہاں نہ وہاں۔''

''تم دونوں ٹیچر بھی ہو اور ایم اے کی طالبات بھی پھر بھی لگتا ہے تم بھٹک گئی ہو۔ایک ناخواندہ عام عورت اس قسم کے حالات میں پھنس جائے تو وہ کیا کرے گی؟''

فریدہ نے جواب دیا''میرے نزدیک ان کا طرز زندگی ہی مختلف ہے۔ان کے وہ مسائل نہیں جو ہمارے ہیں جب میں ماں کے ساتھ بیسکارا جاتی ہوں اور شادی شدہ عورتوں کو دیکھتی ہوں جن کے پاس پیسے بھی بہت ہوتے ہیں اور زیورات بھی تو وہ مجھے اپنی زندگی سے بڑی مطمئن لگتی ہیں۔میرا چچا ہر روز آدھی رات کے بعد گھر لوٹتا ہے مگر چچی بڑی مطمئن ہیں۔اس کا گھر بڑا خوبصورت ہے، جدید ترین فیشن کے کپڑے لینے کیلئے سال میں دو بار پیرس جاتی ہے اور اس کے پاس اتنا روپیہ ہے جتنا وہ چاہتی ہے اور اسے یہ طرز زندگی پسند ہے۔اسے جو حاصل ہے وہ اس کی قدر کرتی ہے مگر مجھے اچھا نہیں لگتا۔جیسا آپ کہتی ہیں کہ میں کس طرح خوش رہ سکتی ہوں؟ اس بات کا انحصار تو متعلقہ لوگوں پر ہے بعض لوگ مادی چیزوں سے خوش ہو جاتے ہیں۔لیکن آپ اگر اس بات کی نشان دہی چاہتی ہیں تو یہ مشکل کام ہے۔بعض نسبتاً کم خوش نصیب عورتیں ڈھیروں بچے جننے پر بھی مطمئن ہو جاتی ہیں۔میری ایسی عورتوں سے بات چیت ہوئی ہے جو اصلاً اس بات پر ایمان رکھتی ہیں کہ ان کی زندگی کا مطلب ہی خاوندوں کی تابعداری اور بچوں کی پرورش ہے۔اگر آپ اس قدر عام سی عورت ہیں تو اندھیرے اور بے خبری میں خوش رہ سکتی ہیں لیکن جب آپ اپنی ذات اور شناخت سے باخبر ہو جاتی ہیں تو پھر اس سستے سودے پر سمجھوتہ کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔کچھ عرصہ ہوا میں نے ایک ملازمت پیشہ خاتون سے بات کی تو کہنے لگی'' ہمیں اپنے بچوں کی خاطر قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔یہ وہ جنگ ہے جو ہم آنے والی نسلوں کیلئے لڑ رہی ہیں تاکہ ہمیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہماری بچیوں کو ان مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔تم اس بات سے متفق ہو؟''

''نہیں میرا خیال نہیں۔میری چھوٹی بہن کی نسل کے مقابلے میں ہماری نسل بہتر حالات میں رہ رہی ہے۔میرے دوست لڑکے بھی ہوتے تھے جنہیں میں گھر پر بلاتی، ہم چائے پیا

کرتے اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتے مگر اب میرا بھائی میری بہن کو اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ وہ راستے میں رک کر لڑکے سے بات کرے۔ میرا نہیں خیال کہ ہم آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ انتہا درجے کے خوش فہم ہیں۔

میڈم المنور درمیان میں بول پڑیں۔ ''ہمیں کچھ دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔ یہاں ہر کوئی مالی دباؤ میں ہے اس لئے ایک شوہر چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کام کرے اور پیسے کمائے اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی بیوی گھر کا سارا کام کاج بھی کرے۔ یہ دونوں کام زیادہ دیر تک کرنا ناممکن ہے۔ مرد کو سمجھنا پڑے گا کہ وقت تبدیل ہو گیا ہے اور اسے وقت کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تبدل کرنا ہے۔ ہمیں یہ معرکہ درپیش ہے کہ ہم ان کو نئے حالات کے بارے میں سمجھائیں اور اس میں تبدیلی پیدا کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگلی نسل ملازمت پیشہ ماں سے یہ توقع نہیں کرے گی کہ وہ بڑی خانساماں بھی ہو دھلائی بھی کرے، صفائی ستھرائی بھی اور استری بھی۔ مرد کو بھی ان میں سے کچھ کام کرنے پڑیں گے۔ آنے والی نسل اس کو عام روزمرہ کی بات سمجھ کر قبول کر لے گی۔ فریدہ، تمہارے بچے جب شادیاں کر لیں گے تو اس وقت وہ میرے شادی شدہ بچوں کی طرح نہیں ہوں گے۔

فریدہ نے ٹوک دیا ''نہیں وہ ہم سے بھی بدتر ہوں گے جب میں چھٹیوں میں بچوں کو ساتھ لے کر تیونس یا فرانس جاتی ہوں ہم سب کافی شاپ پر جاتے ہیں اور لیمونیڈ پیتے ہیں۔ لیکن یہاں میں ان کے ساتھ کافی شاپ پر نہیں جا سکتی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہماری ماں تیونس یا فرانس میں تو ہمیں کافی شاپ تک لے جا سکتی ہے مگر یہاں اپنے شہر کانسٹیشائن میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔ انہیں متضاد رویوں اور اقدار کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

میڈم المنور پھر بولیں ''وہ وقت جلد ہی آئے گا جب الجزائری عورتوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہو جائیں گے جو مراکش یا تیونس کی خواتین کو حاصل ہیں۔''

نہیں۔ ''فریدہ نے کہا'' وہ وقت نہیں آئے گا۔ میرے بچے سکولوں میں جس قسم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں میں اس سے بھی ناخوش ہوں۔ آپ اس نظام سے کیا توقع کر سکتی ہیں جس میں استاد بچوں کو یہ بتائیں کہ عورتوں کو کار نہیں چلانی چاہیے اور مسلمان عورت کو نہ سگریٹ پینا چاہیے نہ میک اپ کرنا چاہیے؟ مجھے تو اس تعلیمی نظام، معاشرہ اور اپنے خاوند سے لڑنا ہے۔ اور حیرت اس بات پر کہ میں اس جنگ میں کیا تیر مار لوں گی؟ مستقبل سے مجھے کوئی اُمید نہیں ہے۔

فریدہ نے عربی کی ایک نصابی کتاب پیش کرتے ہوئے کہا ''اگر سکول میں پہلا سبق ہی یہ پڑھایا جائے تو میرے بچوں والی نسل عورتوں کے بارے میں کیسے روشن خیال ہوگی۔''

ماں باروچی خانے میں ہے۔

باپ کھیت پر ہے۔

ماں خریداری کیلئے جارہی ہے

باپ پودوں کو پانی دے رہا ہے۔

یہ پڑھا کر ہم کہاں پہنچیں گے؟ مجھ کچھ پتہ نہیں چلتا'

اس مقام پر میں نے ٹوکا ''میری کچھ الجزائری عورتیں دوست بھی ہیں جو اپنی مرضی سے انگلینڈ گئیں، وہاں ایم اے کیا مگر جب وہ واپس اپنے باپ کے گھر آئیں تو انہیں اپنی سہیلیوں کے لئے ہاں جانے یا ان کے گھر میں آکر ملنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ میں ان کی بڑی اچھی دوست تھی وہ مجھے باقاعدگی سے ملتی رہیں مگر میں ان کے گھروں میں کبھی داخل تک نہ ہوسکی مجھے اُنہوں نے کبھی بلایا ہی نہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں ہرگز نہیں آتی کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو تعلیم حاصل کرنے کیلئے تن تنہا یورپ جانے کی اجازت تو دے دیتا ہے مگر واپس آنے پر اپنے گھر میں اپنی سہیلیوں سے ملاقات بھی کرنے نہیں دیتا۔ یہ بات ناقابل یقین ہے۔ آپ اس کی وضاحت کرسکیں گی؟''

''ہمارے کوئی مستقل معیار نہیں ہیں۔'' فریدہ نے حسب معمول زوردار انداز میں کہا ''ایک طرف تو باپ یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی تعلیم میں اس مقام پر پہنچے جس پر وہ (باپ) معاشرے میں فخر کرسکے۔ نہیں جانتا کہ اس کی بیٹی نے یورپ میں کیا کیا اور نہ ہی اس کے ہمسائیوں اور جاننے والوں کو اس کا علم ہوتا ہے لیکن جب لڑکی واپس آتی ہے تو پھر سبھی جان پہچان والوں اور ہمسایوں کو یہ بھی دکھانا ضروری ہے کہ (یہ یورپ سے واپس آنے والی لڑکی کا) خاندان اچھا اور پکا مسلمان بھی ..... الجزائر خصوصاً کانسٹیٹنائن میں ہم صرف معاشرے کیلئے زندہ رہتے ہیں یہاں آپ کو کوئی ایسا خاندان نہیں ملے گا جو اپنی من مرضی کی زندگی گذار رہا ہو۔

آپ میری مثال لیجئے میڈم المنور کہنے لگیں میں نانی ہوگئی ہوں مگر میں رات زیادہ دیر تک باہر نہیں رہ سکتی۔ بعض اوقات آج ہی کی طرح میں عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ ٹھہر جاؤں اور شام کو سات یا آٹھ بجے واپس آؤں تو پھر میرے شوہر کہتے ہیں ''تمہیں پتہ ہے میں تم پر اعتماد کرتا

ہوں، مجھے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ تم کہاں تھیں مگر ایسی عورت کے بارے میں ہمسائے کیا کہیں گے جو شام آٹھ بجے گھر آتی ہے جبکہ اس کا شوہر اس سے پہلے گھر پہنچ چکا ہوتا ہے۔'' ہم تو دوسرے لوگوں کیلئے سوسائٹی کیلئے زندگی گذارتے ہیں نہ کہ اپنے آپ کیلئے۔

میری مثالیں لیں، فریدہ پھر بول پڑی ''جب میں جینز پہنتی ہوں تو میرا شوہر کہتا ہے ہمسائے کہیں گے دو بچوں کی ماں ہوگئی ہے مگر خود کو لڑکا سمجھتی ہے اسی لئے ہر وقت جینز پہنے رکھتی ہے۔''

''کیا اس کا مطلب ہے کہ عورتوں کو معاشرتی تبدیلی لانے کیلئے بھی لڑنا پڑے گا؟''

میڈم المنور بولیں ''ذاتی طور پر میں سمجھتی ہوں کہ اگر میں ان نوجوان خواتین کی طرح پڑھی لکھی ہوتی تو میں معاشرہ میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے لڑتی لیکن ہم نے ایک دوسری جنگ لڑی ہے۔ ہم بوڑھے بھی ہوگئے ہیں اور تھک بھی گئے ہیں۔ یہ تو ان نوجوان عورتوں کا مسئلہ ہے کہ جدوجہد ہر صورت جاری رکھیں۔ ماضی میں الجزائر کی عورتوں نے جنگ لڑی ہے اور جنگ جیتی بھی ہے انہیں آج بھی جدوجہد کرنی چاہیے۔ تعلیم یافتہ عورتوں کو یونیفا میں شامل ہونا چاہیے اور اس کے ذریعے وہ کچھ کریں، جو وہ کرنا چاہتی ہیں یہ آسان بات نہیں ہے، آسان بات تو کوئی بھی نہیں؟''

فریدہ پھر بولی ''یونیفا میں شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ملک کی واحد سیاسی جماعت ایف ایل این سے بھی نتھی ہو جائیں گے۔ میں سیاسی عورت نہیں ہوں لیکن میں عورت کی آزادی کیلئے لڑنا چاہوں گی لیکن میں ایسا کر نہیں سکتی۔ مجھے پہلے پارٹی میں جانا پڑے گا اس کے بعد یونیفا میں جانے کی اجازت ہوگی اور جیسے ہی آپ پارٹی میں شامل ہوئے تو پھر آپ کو پارٹی کی تابعداری کرنی ہوگی، وہ کچھ کہنا پڑے گا جو وہ کہلوانا چاہتے ہیں حتیٰ کہ عورتوں کے بارے میں بھی انہی کا فرمودہ کہنے پڑے گا تو پھر یونیفا میں کیوں شامل ہوں؟ میرا مقصد یہ ہے ہی نہیں''

''تمہارا خیال ہے کہ یورپی عورت آزاد ہے؟ میں نے پوچھا''

''ہم سے بہت زیادہ، اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے وہ معاشرے یا ممنوعات یا عقائد کی پروا کئے بغیر جہاں چاہے جا سکتی ہے جو چاہے کر سکتی ہے۔ میں لندن یا پیرس جاتی ہوں تو میں کسی خوف کے بغیر کافی شاپ جا کر کافی پیتی ہوں، میں باہر سیر کیلئے ڈرامہ یا فلم دیکھنے بھی بغیر مرد کی ہمراہی کے جا سکتی ہوں۔ یہ بڑی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر یہ زندگی آسان بناتی ہیں۔ مکمل طور پر

ڈر ہونے کی بجائے تھوڑی بہت آزادی ہو تو بہتر ہوتا ہے۔

''تم چاہو گی کہ جس طور فرانسیسی عورت آزاد ہے اسی قدر الجزائر کی عورت بھی آزاد ہو؟''

اسی طرح نہیں بے شمار فرانسیسی عورتیں ہیں جو آزادی کا غلط استعمال کرتی ہیں ۔ یہاں الجزائر میں ہمارے ہاں پہلے تو فرانس اور عرب کے منفی پہلو ہی پڑے ہوئے ہیں ان کے مثبت پہلو کہیں نہیں۔عورت کو جو عزت شام یا لبنان میں حاصل ہے یہاں الجزائر میں نہیں۔الجزائر میں عورت کو صرف ایک جنسی شئے سمجھا جاتا ہے۔جس طور مرد لوگ یونیورسٹی میں آپ سے بات کرتے ہیں آپ کو دیکھتے ہیں اس پر بالکل اچھنبا ہوتا ہے۔

''تم چاہو گی کہ گھر بیٹھی رہو اور اس طرز زندگی کے جو اچھے پہلو ہیں ان سے لطف لیتی رہو؟''

''نہیں'' فریدہ نے جواب دیا ''لیکن جب میں گھروں پر رہنے والی خواتین سے بات کرتی ہوں تو وہ مجھے اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش لگتی ہیں۔انہیں صبح چھ بجے اُٹھنا نہیں پڑتا۔ کھانا پکانے کیلئے بڑا وقت ہوتا ہے اور پچھلے پہرا اردگرد کی عورتوں سے میل ملاپ کے لیے بھی وافر وقت ہوتا ہے۔''

''لیکن وہ ہیں کیا؟''

''وہ کچھ بھی نہیں ہیں'' فریدہ نے کہا ''مگر وہ خوش ہیں۔وہ ایسے دباؤ میں نہیں ہیں جس میں ہم ہیں۔ان کے وہ مسائل بھی نہیں۔میں نہیں سمجھتی کہ جس طور پر وہ زندگی گذار رہی ہیں وہ مسلئے کا حل ہے۔میرا خاوند کہتا رہتا ہے کہ اگر مجھے یہ زندگی مشکل نظر آتی ہے تو پھر مجھے گھر پر رہنا چاہیے یونیورسٹی کیوں جاتی ہو؟ ایک ملازمت پیشہ خاتون گھر پر رہنے والی خواتین کے طرز زندگی پر رشک بھی کرتی ہے۔اس کے باوجود میں نہیں سمجھتی کہ عورت کو ملازمت چھوڑ کر گھر داری کر لینی چاہیے۔اگر وہ گھر کا انتخاب کر بھی لیتی ہے تو اسے پتہ چلے گا کہ اس کے فرائض بھی دوگنا ہو گئے ہیں اور اس کے حقوق کو تو مانا ہی نہیں جا رہا۔میں اس اثر میں آئی عورتوں سے جو ملازمت یا کام چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ جائیں نفرت کرتی ہوں۔

میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا میرا خیال ہے کہ تمہارے اور تمہاری بقا کیلئے ضروری ہے کہ تم گھر چھوڑ کر باہر کی سرگرمیوں میں حصہ لو۔مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب میں زچگی کی تین ماہ کی چھٹیاں گذارنے کے بعد یونیورسٹی گئی تھی۔مجھے یوں لگا جیسے مجھے جیل سے رہائی ملی ہے۔میں

آج بھی یہی محسوس کرتی ہوں کہ میں جو کام باہر کرتی ہوں وہ میری چھوٹی بچی اور خاوند سے تعلقات بہتر بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں جو مایوسیاں اور کشیدگی پائی جاتی ہیں، میری یونیورسٹی میں مصروفیت، مجھے ان سے رہائی دلواتی ہے۔

فریدہ بیچ میں بول پڑی ''میں بھی بالکل اسی طرح محسوس کرتی ہوں، ہر جمعرات اور جمعے (الجزائر میں چھٹی والے دو دن) کو لگتا ہے میں جیل میں ہوں۔ اگر میری ملازمت میرے اوقات کار میں دوگنا اضافہ بھی کردے میں تب بھی خوش رہتی ہوں۔

اس مرحلہ پر فریدہ کا بڑا بیٹا میڈم المنور کو اپنی کتاب کے وہ صفحے دکھا رہا تھا جس پر فریدہ تنقید کر رہی تھی۔ میڈم المنور اچانک سیخ پا ہوگئیں اور کہنے لگیں۔ ''تمہیں اس کے خلاف بغاوت کر دینی چاہیے۔ اس کام کے لیے بھی اسی طرح انقلاب لانا پڑے گا جیسے انقلاب فرانسیسیوں کو نکالنے کے لیے برپا کیا گیا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے۔ کہ فرانسیسی لوگ بھی اپنی عورتوں کو ملازم پیشہ، پڑھی لکھی اور آزاد بتایا کرتے تھے جبکہ الجزائر کی عورت کو کھانا پکانے، سلائی بنائی اور صفائی ستھرائی میں مصروف دکھایا کرتے تھے۔ انقلاب کے زمانے میں ہم نے ہر شعبہ میں مردوں کے برابر رہیں تو پھر وہ سارا کوڑا کرکٹ ہم پر ڈالنے کی جرات کیسے کرتے ہیں؟ میری بیٹیو! تمہیں لڑنا پڑے گا۔ یہ لڑائی لڑنی اور جیتنی ہوگی''

میڈم حمدی (عمر 62 سال) کے چار اپنے بچے ہیں اور پانچ اُنہوں نے پال رکھے ہیں۔ یہ پانچویں بھی بہن بھائی ہیں۔ الجزائر کے انقلاب کے دوران ان کا باپ تیونس کی سرحد پر مارا گیا تھا اور ماں پہاڑوں میں مرگئی تھی۔ جب انہیں گود لیا گیا بڑے کی عمر آٹھ اور چھوٹے کی ایک برس تھی۔

میڈم رشید کی عمر ستاون برس ہے اور بچے تین ہیں انقلاب سے پہلے وہ استانی تھی۔ انقلاب کے دوران اس کا شوہر جنگ لڑنے کے لئے پہاڑوں میں چلا گیا جبکہ یہ بچوں کو لے کر بیٹھی رہی۔ جب اس کا خاوند بھی مرگیا تو وہ بچوں کو چھوڑ کر اپنے خاوند کی جگہ لڑنے کی خاطر پہاڑوں پر چلی گئی۔ وہ دوسرے مجاہدوں کے بچوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ میری ایک دوست لیلیٰ ہے اس کے گھر ہم ملا کرتے تھے، اس نے ان دو عورتوں سے رابطہ کیا اور مجھے لگا کہ اس نے ان عورتوں کو بتایا دیا تھا کہ میں کس طرح کے سوال کروں گی۔ چنانچہ اس بات کی تصدیق یوں بھی ہوئی کہ جیسے ہی میں نے ٹیپ ریکارڈ چلایا۔ میڈم رشید نے بولنا شروع کر دیا۔

MashalBooks.org

''جدوجہد آزادی سے پہلے ہم لوگ تعلیمی اصلاحات کیلئے کام کررہے تھے۔ ہمارے لئے تو انقلاب کا آغاز 1954ء سے نہیں ہوا بلکہ 1930ء سے ہوا۔ ہمارے خاندان عورتوں کے بارے میں خاصے ترقی پسند تھے اسی لئے تو ہم انقلاب کے شروع ہونے سے پہلے ہی پڑھنے لگی تھیں۔ ہم نے اپنے من مرضی کے مردوں سے شادیاں کیں اور عورت کی حیثیت سے ہم سے کوئی تعصب یا امتیاز بھی نہیں روا رکھا گیا۔ ہم اسلامی عربی کلچر کے مطابق نئی نسلوں کو تعلیم دے رہی تھیں۔ 1930ء میں فرانس نے الجزائر پر اپنے دور حکومت کا سو سالہ جشن منایا مصر کے معروف مصلح محمد عبدہ یہاں آئے ہوئے تھے جب وہ واپس مصر گئے اور ان سے الجزائر والوں کے بارے میں پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا ''الجزائر فرانسیسی ملک ہے۔'' تب ہم نے اپنا یہ قومی ترانہ بنایا تھا۔

الجزائر کے عوام مسلمان ہیں
وہ عرب حیا کے حامی ہیں
جو کوئی یہ کہتا ہے کہ الجزائر والے اپنا اصل بھول گئے ہیں
وہ جھوٹ بولتا ہے۔

1936ء میں سیاستدانوں اور تعلیمی ماہرین کی کمیٹی بنائی گئی۔ 1946ء میں تعلیمی اصلاحیات صحیح معنوں میں شروع ہوئیں اور 1954ء میں ہم نے ہتھیار اُٹھا لئے۔ ہم نے شہروں دیہات اور کوہساروں میں جنگ کی اور مردوں کے شانہ بشانہ ہر کاروائی میں شریک تھے۔

میڈم حمدی نے کہا کہ میں نے شہر میں جدوجہد کی، ہتھیار اُٹھائے، میں کپڑوں کے نیچے ہتھیار چھپا کر ایک علاقے کے مجاہدوں سے دوسرے علاقے والوں کو پہنچاتی۔ 1955ء میں میں اُمید سے تھی کہ پاؤں میں گولی لگ گئی۔ اس وقت میں ایک ہسپتال کے آپریشن روم میں تھی کہ فرانسیسی حکام کو یہ تصدیق اطلاع دی گئی کہ میں خود جنگ آزادی کی سپاہی ہوں۔ مجھے آپریشن روم سے سیدھا جیل لے جایا گیا جہاں سے بعد میں ضمانت پر رہا کر دیا کیا گیا۔ باہر آنے کے باوجود مجھے ہر روز تھانے میں حاضری لگانی پڑتی۔ جب میں باہر آئی تو پتہ چلا کہ ہمارے کامریڈوں نے مجھے شہر سے پہاڑوں کی طرف بھیجنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ اس زمانے میں میرا شوہر بھی میرے ساتھ تھا مگر وہ ایک طرف گیا اور میں اس کے بالکل الٹ دوسری سمت

..... ہم جنگ لڑنے کے لیے نکلے۔ اکٹھے نہیں لڑے۔ ہم بھی دوسرے خاندانوں کی طرح اکٹھے نہ رہ سکے، دوسرے سب خاندان جنگ آزادی کے سبب ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ پورے چار برس جنگ کی کاروائی کے منصوبے بناتے ہیں اوران پر عملدرآمد کرتے۔ ہم اگر ایک طرف بچوں کو دودھ پلاتی تھیں تو دوسری طرف پل اڑا رہی تھیں۔ جب ہم مصروف جنگ ہوتے تو مجھے اسلحہ جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ لے جانا ہوتا۔ وہاں پر کوئی مرد یا میں خود یہ اسلحہ چلاتی اور پھر اسلحے سمیت واپس آجاتی۔ اس دوران دوسری بار میرے پاؤں میں گولی لگی ہمیں ایک غدار کو گولی مارنا تھی، میں اور میرا ایک مرد ساتھی اس آپریشن کے مختلف مرحلوں کی ریہرسل کر رہے تھے تو میرے ساتھی کو یہ خیال ہی نہ رہا کہ بندوق بھری ہوئی ہے اس نے گھوڑا دبا دیا۔ اور گولی میرے پاؤں میں آن لگی۔ یہ حادثہ تھا۔ وہ مجھے ہسپتال میں لے آئے جہاں ایک فرانسیسی ڈاکٹر تھا وہ ہمارے انقلاب سے ہمدردی رکھتا تھا اس ڈاکٹر نے میرا علاج کیا (درحقیقت بہت سے فرانسیسی الجزائر کی انقلابی فوج میں شامل ہو کر الجزائریوں کے شانہ بشانہ فرانسیسیوں کے خلاف لڑ رہے تھے) ڈاکٹر نے پاؤں کا آپریشن کیا اس کے دس دن بعد مجاہدوں کے ایک گروپ کا سراغ لگا لیا گیا جو مجھے بھی جانتے تھے مجھے فوراً ہسپتال چھوڑ کر چھپ جانا تھا۔ میرے ڈاکٹر نے کہا کہ اگر آپریشن کے اتنے تھوڑے عرصے بعد میں نے چلنے کی کوشش کی تو میری ٹانگ پھر کبھی سیدھی نہیں ہو سکے گی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرا پلستر اتار دے ..... کوئی راستہ نہیں بچا تھا سوائے اس کے کہ میں ہسپتال سے نکلوں اگلے قصبے تک پہنچوں اور پھر چھپنے کی کوئی جگہ ڈھونڈوں ۔ میں تین ماہ کے حمل سے تھی اور اس حالت میں مجھے کانسٹینائن سے بالجنہ تک پیدل سفر کرنا پڑا (دونوں مقامات میں فاصلہ بس کا دو گھنٹے کا سفر بنتا ہے) اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں سیدھا نہیں چل سکتی۔ ڈاکٹر سچ کہتا تھا مگر میں نے اپنے آپ کو بچا لیا۔

''بہت سی عورتوں نے قید خانوں میں بچے جنے۔ جب انہیں دردِ زہ اُٹھتا انہیں ہسپتال پہنچایا دیا جاتا جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا انہیں واپس قید خانوں میں پہنچا دیا جاتا۔''

''کیا آپ نے منصوبہ بندی اور آپریشن میں بھی حصہ لیا یا صرف مردوں کے حکم بجالاتی رہیں؟''

''مرد ہمارے احکام بجالایا کرتے تھے'' میڈم رشید نے کہا ''صرف ہم ہی آپریشن کے پروگرام بنایا کرتی تھیں مردوں کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ جس قسم کا وہ لباس پہنا کرتے تھے ان میں ان

کی کارکردگی بڑی نہیں ہوتی تھی۔ فدائی (مرد سپاہی) تو سرف کسی کو مارنے کا ذریعہ تھا۔ ہماری گاڑی تو مرد چلاتا تھا مگر کاروائی عورتیں کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک عورت کو فرانسیسی سپاہی نے پہچان لیا اسے کار میں سے کود کر بھاگنا پڑا اور اس کے جوتے کار کے اندر رہ گئے۔ فرانسیسی حکام نے کانسٹیٹائن کی ساری عورتوں کو ایک چوک میں اکٹھا کیا اور باری باری یہ جوتا پہننے کیلئے کہا تاکہ جوتے کی مالک سپاہی خاتون کو پکڑا جا سکے۔''

عورتیں فرانسیسی فوج کی مت مارنے انہیں زچ کرنے کیلئے اپنے دماغ میں نئے نئے طریقے سوچتیں۔ ہم یہ بہانہ کر کے کسی کو ہسپتال لے جاتے تھے۔ کہ وہ (عورت یا مرد) بیمار ہے جب انہیں داخل کر لیا جاتا تو پھر ان کے کپڑے تبدیل کئے جاتے، بالوں کو دوسرا رنگ دے دیا جاتا اور وہ اسلحہ لے کر دوسری سمت ایک نئے وجود میں ڈھل کر کاروائی کے لیے تیار ہوتا۔ شہر چھ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مثلاً میڈم بوزین ایک طرف سے آئے گی، برقعے میں کالے جوتے پہنے ہوئے آئے گی، میٹنگ کرے گی، آپریشن کا منصوبہ بنائے گی، اور پھر اپنے کپڑے اور جوتے میٹنگ میں شریک ایک مرد کے سپرد کرے گی پھر میچنگ جوتوں کے ساتھ بلاؤز اور سکرٹ پہن کر اسی رنگ کا بیگ لئے کھلے بالوں کے ساتھ دوسری سمت سے نکل جائے گی اگر آتے وقت اس کے بال کالے تھے تو جاتے وقت سرخ ہوں گے ہم مردوں کے لباس بار بار تبدیل کرواتیں ان کے اور اپنے بال رنگتی رہتی تھیں یعنی حتیٰ الامکان یہ کوشش ہوتی تھی کہ دُشمن ہمیں پکڑ نہ سکے۔ یہ سب کچھ عورتوں نے ہی سوچا اور اُنہوں نے ہی عمل کیا۔ اسطور روپ تبدیل کرنے اور فرانسیسی حکام کو زچ دینے کے طریقے مرد کم اور عورتیں زیادہ سوچ سکتی تھیں۔

انقلاب میں شاندار حصہ لینے کے بعد انقلاب نے عورت کی حیثیت میں آپ کے لیے کیا کچھ کیا؟

الجزائر کو آزادی ملی، میڈم حمدی نے جواب دیا۔ جب الجزائری عورت نے وطن کے لئے ہتھیار اُٹھائے۔ وہ بچے چھوڑ گئی یا ساتھ لے گئی وہ وطن کی خاطر پہاڑوں کی بلندیوں پر جا کر لڑی۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ کسی نے اس سے یہ کرنے کیلئے کہا نہیں تھا۔ وہ الجزائر کو آزاد دیکھنا چاہتی تھی اور یہی کچھ اس نے کیا۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہتی ہے؟ کیا وہ چاہتی ہے کہ اسے ان خدمات کا معاوضہ دیا جائے؟ ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ ہم زندہ گھروں کو پلٹ آئیں گی۔ ہم اپنے مستقبل کیلئے برسرِ پیکار تھیں۔ الجزائر کے مستقبل کیلئے ..... ہمارا

ایک آدرش تھا انقلاب اور یہ عوامی انقلاب تھا۔ یہ بہت بڑا معرکہ تھا اور ہمارا عزم اور ارادہ بھی بڑا بلند تھا۔ ایک عورت تھی اس کا بیٹا پہاڑوں پر چلا گیا۔ ایک روز ایک فرانسیسی سپاہی نے اس کے دروازے پر دستک دی اور کہا ''ہم تمہارا بیٹا لے کے آئے ہیں باہر آؤ اور اسے دیکھو..... وہ باہر گئی بیٹا مرا پڑا تھا۔ اس نے گھٹنے زمین پر ٹکائے اور جھک کر اسے چومتے ہوئے کہا..... ''اب مجھے پتہ چلا کہ تم مرد ہو! اگر تم زندہ واپس آجاتے تو میں تمہیں بزدل سمجھتی اور تمہیں اپنا بیٹا کہتے مجھے شرم آتی۔ ..... ''فرانسیسی سپاہی نے اپنی چھڑی اس کی جھکی ہوئی گردن پر ماری۔ اس کا شوہر اور چار لڑکے آزادی کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ وہ آج کل خود فاقوں مر رہی ہے لیکن نہ تو وہ تلخ نوا ہوگئی ہے نہ ہی وہ ناراض ہے۔ وہ کہتی ہے ہم نے ایک نصب العین کے لیے جدوجہد کی ہم جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ میں الجزائر کو آزاد دیکھنے کے لیے بے تاب تھی۔ اس لئے مجھے کوئی حصہ نہیں چاہیے۔''

اگر یہ انقلاب نہ آیا ہوتا تو تم ''اس نے لیلیٰ کی طرف منہ موڑ کر کہا'' تم اس وقت یونیورسٹی میں نہ ہوتیں۔

''ہاں یہ سچ ہے'' لیلیٰ نے کہا ''کسی حد تک ..... مگر یہ کافی نہیں ہے''

''ہمیں آزاد ہوئے صرف بیس سال ہوئے ہیں'' مادام حمدی نے کہا

ٹھیک ہے، میں نے کہا ''مگر اگلے روز یونان کی ویمنز یونین کی طرف سے ایک وفد الجزائر آیا اس کا استقبال کرنے والے زیادہ تر مرد تھے۔ یونیفا کی سربراہ کا ذرائع ابلاغ میں اس طرح ذکر ہوا جیسے وہ بھی میٹنگ میں شرکت کرنے والوں میں شامل تھیں، یعنی ذکر وغیرہ وغیرہ میں تھا۔'' سوال یہ ہے کہ الجزائر کی جس عورت نے انقلاب کی جنگ لڑی اور کامیاب ہوئی اس نے اپنے ساتھ ایسا ہتک آمیز سلوک کیسے قبول کرلیا؟ وہ اپنی تنظیم خود کیوں نہیں چلاتیں؟

''ہم ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں اور ہماری ضرورت ہے کہ پارٹی ہمارے معاملات بھی طے کرے میڈم رشید نے جواب دیا عورتوں کی تنظیم سٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور ورکرز آرگنائزیشن کے مقابلہ میں زیادہ آزاد نہیں اور یہ تنظیمیں بھی پارٹی کے ساتھ اپنی سیاسی وابستگی سے انکاری نہیں۔ جن عورتوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا بدقسمتی سے اب ان کی عمر پچاس سے زائد ہے اور یہاں کہ مرد بھی جہان بھر کے مردوں کی طرح پچیس برس سے کم عمر کی عورتیں چاہتے ہیں۔ سچ بات ہے انہیں ہماری ضرورت نہیں۔''

MashalBooks.org

''مجھے افسوس ہے میں اب بھی نہیں سمجھی؟ میں نے کہا''

لواب میں لگی لپٹی کے بغیر بات کرتی ہوں میڈم رشید نے کہا'' آزادی کے بعد بن بیلہ نے ہم سے کہا کہ الجزائری عورتوں کیلئے قانون تیار کریں۔ ہم نے جو کچھ دیکھا ہمیں اچھا نہیں لگا اور ہم نے سوچا کہ یہ عارضی مرحلہ ہے زیادہ طویل نہیں ہوگا۔ ہماری عورتیں آزادی کیلئے بڑی دیر سے منتظر تھیں مگر اُنہوں نے خود ہی معاملات کو الجھا کر رکھ دیا۔

1960ء میں جب بومدین نے تختہ الٹا تو ہمیں پھر بھی الجیر بلایا گیا۔ ہم نے اجلاس کیا مگر وہاں پر چند مرد موجود تھے جنہوں نے کہا کہ جس طرح وہ کہیں گے ہم بھی اسی طرح کہیں۔ 1968ء میں اُنہوں نے ہمیں پھر الجیر بلایا اور ہماری طرف سے دوسرے ملکوں کو تار بھجوائے گئے۔ ہم الجزائر کی عورتوں کے لیے قانون سازی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے قانون سازی کر لی مگر مردوں نے کہا کہ ہمیں ان میں تبدیلی کرنا پڑے گی۔ ہم نے خواتین کیلئے جو قوانین بنائے تھے الجزائر کے اٹھارہ اضلاع کی عورتوں کی اکثریت نے ان کی منظوری دے دی تھی۔ سو ہم نے وزیراعظم سے کہا'' ہم ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے کیونکہ ہم نے اپنی عورتوں سے بھی وعدہ کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اگر آپ قانون تبدیل کر دیں تو آپ کو بنگلے کاریں اور پارلیمنٹ میں نشستیں دی جائیں گی لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ پارلیمنٹ میں دو کی بجائے تین سیٹیں کر دیتے ہیں۔ لیکن ہم نے ایک لفظ تک تبدیل کرنے سے ٹکا سا جواب دے دیا۔

مردوں کو آپ کے بنائے قوانین میں تبدیلی کی اتنی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی؟

''اس لئے کہ عورتیں جو قوانین چاہتی تھیں وہ مردوں کے مفادات پر پورا نہیں اترتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عورتیں ان کے ہاتھوں میں کھلونا بنی رہیں۔ انہیں ایسے قانون پسند نہ تھے جن سے عورتوں کی اہلیت اور جوہر کی حوصلہ افزائی ہو۔''

''وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ لڑتی رہی ہیں؟''

''بالکل جانتے تھے، بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اس ضمن میں خرابی پیدا کرنے کی ذمہ دار چند عورتیں بھی تھیں۔ کچھ بنگلے اور کاریں چاہتی تھیں۔ اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں ان کے جوتے کو بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

MashalBooks.org

''تو آپ کو افسوس ہے کہ الجزائری عورتوں کو انقلاب کے بعد جو کچھ حاصل کر لینا چاہیے تھا۔ وہ حاصل نہ کر سکیں؟۔'' ہمیں افسوس ہے'' ہم نے پھر کام کرنا چاہا مگر جب ہم نے دیکھا کہ یہ کار بیکار ہے تو ہم نے چھوڑ دیا۔ ہم اپنے بچے اور گھر چھوڑ کر جلسوں میں جاتیں جہاں باتیں ہی باتیں ہوتیں اور پھر ہمیں بعد میں احساس ہوا کہ مرد آخر میں وہ کچھ کر لیتے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ہماری دلچسپی ختم ہوگئی اور یہ سرگرمیاں بھی ترک کر دیں۔ میرے خیال میں صرف الجزائر میں ہی نہیں سارے جہاں میں عورتیں اپنے ملک کے لیے مردوں کے برابر لڑتی اور کام کرتی ہیں مگر ان کو اس میں حاصل بہت ہی کم ہوتا ہے۔ مرد ایسی آزاد عورتوں کو پسند نہیں کرتے جن کی اپنی رائے بھی ہوتی ہے ہم نے اپنے وزیر اعظم سے کہا'' آپ کہتے ہیں یہ سفید ہے ہم کہتی ہیں یہ کالا ہے اس مسئلہ پر یا تو آپ کو ہمیں قائل کرنا پڑے گا یا ہم آپ کو قائل کریں گی۔'' مرد اس قسم کی عورت کو پسند نہیں کرتے وہ ایسی عورتیں چاہتے ہیں جو ان کے ڈر سے کانپتی ہوں اور ان کے حکم کی مکمل تابع۔''

''یہ معاملہ تو سیاسی سطح کا ہے، سماجی سطح پر کیا صورت ہے۔ آپ کے خیال میں انقلاب کے بعد عورت کی سماجی حیثیت بہتر ہوگئی ہے۔''

''ہاں ہاں اب بہت بہتر ہے، میڈم رشید بولیں'' انقلاب سے پہلے عورتوں کی شناخت، وقار، آزادی کچھ بھی تو نہیں تھا۔ جہاں تک تعلیم کا معاملہ ہے اس میں لاجواب ترقی ہوئی ہے والدین بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کیلئے دن رات کام کرنے پر تیار ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ الجزائر میں کوئی ایسا باپ ہے جو اپنی بیٹی کو سکول بھیجنے سے انکاری ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ واحد افسوس اس بات کا ہے کہ ہم نے انقلاب کے دوران جو مردوں کے ساتھ برابری حاصل کر لی تھی وہ چلی گئی ہے اس اعتبار سے لگتا ہے کہ ہم آگے جانے کی بجائے پیچھے چلے گئے ہیں۔

میڈم حمدی، نے کہا'' کیا انقلاب کے باعث آپ کے اپنے میاں سے تعلقات میں کوئی فرق آیا؟''

''ہاں، ڈرامائی فرق'' جواب تھا'' میرا شوہر پہاڑوں سے نیچے اتر آیا ایک اور عورت سے شادی رچالی آخری بار اسے وہیں دیکھا تھا۔ بچے میرے پاس رہے۔ اس کے اس بیوی سے چھ بچے ہیں۔ زندگی بڑی مشکل تھی، وہ عورت اس کے ساتھ تھی اور بڑا لمبا عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ چار

برس تک مجھ سے نہیں ملا۔ کئی جہتوں سے تو میں سمجھتی ہوں کہ میں انقلاب گذیدہ ہوں لیکن ایک میں ہی تو نہیں ۔ بے شمار مرد سپاہی بن کر پانچ برس تک پہاڑوں میں مسلسل لڑتے رہے انہیں اپنے گھر اور بیویوں سے حمایت اور امداد حاصل تھی آزادی کے بعد وہی بہتر سماجی اور سیاسی پوزیشن حاصل کر سکے۔لیکن اُنہوں نے بیویوں کو طلاق دے دی ایسی نوجوان اور طرفدار لڑکیوں سے شادی رچائی جو مجلس محفلیں اور استقبالیہ پارٹیوں میں جاسکتی تھی اور ان کے ساتھ فرانس بھی جانے کے اہل تھیں۔''

''آپ چند انفرادی معاملات کا ذکر کر رہی ہیں؟''

''نہیں، یہ تو عام بات تھی، دراصل یہ تو معمول بن گیا تھا۔ بے شمار مرد تھے جنہوں نے پہاڑوں میں اپنے ساتھ لڑنے والی کامریڈوں سے شادیاں کر لیں۔ بہر طور جب وہ نیچے شہروں میں آئے اچھے عہدے اور اچھے کام ملے تو پہاڑ والی بیویوں کو طلاق دے کر نوجوان خوبرو کم عمر عورتوں سے شادیاں کرتے رہے۔ دیکھا آپ نے ہر صورت میں عورت کو ہی قیمت ادا کرنا پڑی۔ اگر یہ مرد اپنی پہلی عورتوں کو زیادہ مہذب اور باادب بنانا چاہتے تو یہ کام صرف ایک سال میں ہوسکتا تھا لیکن ایسا کرنے کی بجائے اُنہوں نے ایک اور شادی کر لی۔عورت کی حیثیت میں ہم نے ہر طرح بڑی قیمت ادا کی اور اب وہ ہمیں اپنے قوانین بنانے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ میں اس بات کی قائل ہوں کہ مرد یہ جانتے ہیں کہ عورتیں ان کے مقابلے میں معاملات کو زیادہ بہتر طریق سے سمجھتی ہیں۔اسی لئے وہ اپنے آپ کو ہم سے کم تر جانتے ہیں اور وہ ہم سے روبرو ہونے کی بجائے ہمیں نچلی سطح پر رکھنا چاہتے ہیں۔ہمیں ان کی مت مارنے میں کتنا وقت اور لگے گا۔ان کی مت بھی ایسے ہی ماری جائے گی جیسی فرانسیسی فوج کی مت ماری تھی۔خبر نہیں کب ..... لیکن اُمید ہے زیادہ دیر نہیں لگے گی؟''

میں یونیورسٹی میں آرٹس بلڈنگ کے لمبے کاریڈو کے ساتھ چل رہی تھی جہاں میری ملاقات رضیہ سے ہوئی جن کا تعارف یہ تھا کہ وہ حال ہی میں غیر ملکی زبانوں کے انسٹی چیوٹ کی سربراہ منتخب ہوئی ہیں۔ میں نے اپنی بعض دوستوں سے سنا تھا کہ میڈم رضیہ نے گذشتہ چالیس برس میں ساری جنگیں لڑی ہیں جو الجزائری عورتوں کو لڑنی پڑیں اگرچہ وہ اپنے آپ کو عورتوں کے حقوق کی کارکن تو نہیں کہتیں لیکن وہ بڑی سیانی اور آزاد عورت رہی ہیں۔علیک سلیک کے بعد میں نے کہا کہ اگر وہ موقع دیں تو میں ان کے ساتھ دلجمعی سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

''پوسٹ گریجوایٹس کے بارے میں؟''

''نہیں''، میں نے کہا''عرب عورتیں اور جن مشکلات کا انہیں سامنا ہے؟ اگر آپ کی اس موضوع میں دلچسپی ہو''

''ہاں ہاں مجھے دلچسپی ہے'' اُنہوں نے جواب دیا اور پھر ان کی نرم دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر پھیل گئی جس میں اداسی جھلک رہی تھی۔ آنے والے اتوار دس بجے ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔

عین دس بجے میں میڈم رضیہ کے دفتر پہنچ گئی۔ وہ ایک فرانسیسی استاد کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں جسے حال ہی میں بطنہ یونیورسٹی سے تبدیل کیا گیا تھا۔ رضیہ نے معذرت کی اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کے لیے کہا۔

کلاک نے گیارہ بجائے اور مجھے اپنی ایک سالہ بیٹی کے بارے میں پریشانی لگ گئی۔ میں نے سوچا تھوڑی دیر میں اسے بھوک لگ جائے گی۔ میں اپنے خاوند سے یہ کہنا بھی بھول گئی تھی کہ اسے پانی پلا دینا۔ میں حیران تھی کہ شاید اسے یہ بات سوجھے گی بھی کہ نہیں۔ پھر یہ بھی پریشانی تھی کہ کیا وہ اس کے لیے لنچ تیار کے لیے لنچ تیار کر لے گا یا مجھ سے جھگڑے گا''.....اس لئے کہ مجھے تو دیر ہو ہی گئی ہے۔ بچی کیلئے بھی اور خاوند کیلئے بھی۔ ان پریشان کن خیالات میں میں نے اچانک اپنے آپ سے سوال کیا''ہم ہمیشہ خوف میں کیوں رہتے ہیں؟ یہ کیوں نہیں ہوتا کہ ہم کبھی اپنے گھر، خاوند، اور بچوں کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اس پر پوری توجہ دیں؟''

خوش قسمتی سے میڈم رضیہ نے مجھے میری اپنی پریشانیوں سے یہ کہہ کے بچالیا''لو میں آ گئی ، بتائیں کہاں سے شروع کریں۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سمیٹا اپنے نوٹس پر نظر ڈالی'' میں آپ سے آپ کی ان تمام جنگوں کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں جو آپ کو خاندان اور سوسائٹی دونوں کے خلاف لڑنا پڑیں اور ان میں وہ کیا کیا واقعات تھے جو آپ کی نظر میں آپ پر محض اس لئے گذرے کہ آپ عورت تھیں'' میڈم نے کہنا شروع کیا۔''

''میں دور افتادہ گاؤں میں رہنے والی سات لڑکیوں میں سے تھی جنہوں نے باقاعدہ تعلیم کیلئے بڑی سخت جنگ ہوئی۔ میں اس زمانے میں سکول گئی جب کسی سڑک پر کسی لڑکی کو نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جہاں تک میرے خاندان کا تعلق ہے میرے والد نے پہلے ہی میری دو بڑی بہنوں کو

سکول سے اُٹھا لیا تھا، انہیں برقع پہنا دیا تھا مگر بعد میں وہ اس پر پشیمان بھی لگتے تھے اور اُنہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میرے ساتھ وہ کچھ نہیں کریں گے۔ جو بڑی بہنوں کے ساتھ کیا تھا۔ گویا ایک طرح سے بڑی بہنوں نے میرے لئے قیمت چکائی پھر بھی میں ہمیشہ اسی ڈر میں رہتی کہ جو کچھ ان پر گذری ہے وہ مجھ پر گذرنے والی ہے۔ یہ پانچویں دہائی کی شروع کی بات ہے ان دنوں الجزائر پر فرانسیسیوں کا قبضہ تھا یہ زمانہ بڑا مشکل تھا مگر عورتوں کیلئے زیادہ ہی مشکل تھا۔ دس سال کی عمر میں پردہ کرا دیا جاتا اس لئے مجھے دو لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ایک پردے کے خلاف اور دوسری جہالت کے خلاف تعلیم حاصل کرنے کی۔

جب میں سکول میں تھی تو الجزائر کے نیشنل فرنٹ فار لبریشن نے طلبا کو ہڑتال کرنے کیلئے کہا میرے سمیت ہمارے سکول کی اکثر طالبات نے لبیک کہا یہ ہڑتال دو سال جاری رہی اس کے بعد میں واپس سکول نہ جا سکی کیونکہ فرانسیسی حکام نے تمام سکولوں کو میرے نام سے باخبر کرتے ہوئے داخلے کی ممانعت کر دی تھی۔ چنانچہ مجھے پھر پرائیویٹ طور پر L Ecole Universelle میں پڑھنا پڑا اور بی اے کرنے تک مجھے اپنی کفالت بھی کرنا پڑی۔

اسی زمانے میں میرے والد کو جیل کے اندر تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور وہ انتقال کر گئے۔ میرا بھائی قابض فرانسیسیوں کے خلاف لڑنے کی خاطر الجزائری مجاہدوں کے ساتھ پہاڑوں میں چلا گیا۔ والد کی وفات کے بعد ہمیں ایک نئی قسم کی جنگ کرنا پڑی یعنی مردانہ غلبہ والے معاشرے میں عورتوں کو مردوں والے کام کرنا پڑے۔ اب ہم عورتیں رہ گئی تھی، میری ماں اور بہنیں۔ ہمیں جنگ کا آغاز یہاں سے کرنا پڑا پورے خاندان (الجزائر میں خاندان میں صرف والدین اور اولاد ہی شامل نہیں ہوتی، چچے چچیاں، دادا دادی، بھی شامل ہوتے) کے خلاف کھڑا ہونا پڑا۔ میرے کام کرنے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ ماں اور چھوٹی بہنوں کی کفالت کے لئے مجھے فرانسیسی حکام سے اجازت لے کر استانی بننا پڑا۔ ہمارے سماجی حلقے میں اس طرح نوکری کرنے کے بارے میں کسی نے سنا تک نہ تھا لیکن میں نے یہ کام بھی کیا۔ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ ان دونوں عورتیں عملاً گھروں میں مقید ہوتی تھیں۔ شہر و بازار اور گلی کوچے میں صرف مرد نظر آیا کرتے تھے۔ سر عام مرد ہی کام کاج کرتے نظر آتے تھے۔ اور یہ مرد گھر کے اندر بزرگ و برتر آقا کی حیثیت رکھتا تھا۔ عورتیں اپنے خاوند یا باپ کے سامنے کھانا تک نہیں کھاتی تھیں۔ عورتیں نہ تو گلیوں سڑکوں میں نظر آتیں اور نہ ہی گھروں میں ..... ان کا کوئی وجود تھا ہی نہیں۔

جب انقلاب کا آغاز ہوا تو میرے لئے بھی اور باقی لوگوں کی طرح کچھ آسانیاں پیدا ہوئیں عورتیں محاذ جنگ پہ گئیں اور مردوں کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر لڑیں۔ ہم نے پردہ فوراً ترک کیا اور گھروں کے تالے توڑ کر باہر نکل آئیں۔ ہم ایک ارفع قومی مقصد کیلئے لڑ رہی تھیں۔ عورتوں کو یہ خوف نہیں رہا تھا کہ مذہب یا روایات کی بنا پر ان کی پکڑ ہوگی۔ یہ سب کچھ پہاڑوں اور دیہات میں شروع ہوا جہاں پہلے بھی عورتیں ہمیشہ مردوں ایسے کام کرتی تھیں اور اب بھی وہیں سپاہی بن کر آگے آئیں۔ ان دیہات میں عورتیں کھیتوں میں کام کیا کرتی تھیں، گھوڑوں پر سواری کرتی تھیں اور ہتھیار بھی رکھتی تھیں۔ اس طرح دیہی علاقوں میں ایک خاص حد تک عورت اور مرد کے درمیان برابری قائم تھی۔ یوں الجزائری عورتیں جنگ آزادی کی سپاہی بنیں۔ اُنہوں نے دور دراز دیہات اور پہاڑوں میں قدم آگے بڑھایا اور باقی سارے ملک میں اس کی تقلید کی گئی۔ عورتوں نے شہروں میں بھی لڑائی شروع کی اور ہم پہاڑوں میں برسر پیکار مجاہدوں کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ موثر طریق سے امداد پہنچاتی رہیں۔ فرانسیسی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ عورتیں یہ کچھ کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ہم جو کچھ کر رہی تھیں انہیں اس کا شبہ ہم عورتوں پر نہیں ہوتا تھا۔ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑے آزادانہ انداز میں آتی جاتی تھیں جبکہ مردوں کو قدم قدم پر روکا ٹوکا جاتا تھا۔ یوں الجزائری عورتیں الجزائری انقلاب کی اٹوٹ ساتھی بن گئیں۔

فرانس کے خلاف جدوجہد آزادی کے دوران عورتوں اور مردوں میں جو برابری اتنی تیزی سے پیدا ہوگئی کیا آپ کے خیال میں اسے انقلاب کے بعد بھی برقرار رکھا گیا یا عورتوں کے حقوق اور مقام کے بارے میں ماقبل انقلاب کی ذہنیت لوٹ آئی؟

اس سوال کا واضح جواب ہو نہیں سکتا۔ انقلاب نے عورتوں کے بارے میں بہت سے خیالات تبدیل کر دیئے جدوجہد کے دوران عورت مرد کے برابر آ گئی تھی۔ اس نے ہتھیار بھی اُٹھائے تھے اور لڑائی بھی کی تھی۔ آزادی کے بعد اس نے زیادہ تر اپنے اس حاصل کو برقرار رکھا جو جدوجہد کے درمیان میں میسر ہوا تھا۔ مثلاً انقلاب کے بعد عورتوں کے برقع کے بغیر سکول، یونیورسٹی، ملازمت یا کام پر جانے پر کوئی پابندی نہ رہی۔ انقلاب کے پہلے کے حالات سے مقابلہ کیا جائے تو یہ بہت بڑا حاصل تھا۔ اس حاصل حصول کو قانونی تحفظ دینے کا معاملہ حکومت کے زیر غور ہے۔ الجزائری معاشرہ میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی اور فکر وخیال میں بڑی تیز تبدیلیاں آئیں۔ اس سے پیشتر خیالات یا سوچ روائتی قسم کی تھی۔ فرانسیسیوں نے بھی ہمیں

پس ماندہ اور جاہل رکھنے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اگر چہ آج بھی ایسے پس ماندہ گروپ ہیں یا بعض خاندانوں میں پس ماندہ لوگ ہیں مگر اب ایسے لوگ بھی ہیں جو سماجی اور ثقافتی اعتبار سے بہت روشن خیال ہیں ایک بالکل ہی نیا طبقہ بھی ابھرا ہے۔ جو چاہتا ہے کہ عورتیں پڑھائی بھی کریں اور نوکری بھی مگر برقعے کی پابندی بھی ہو۔ آج آپ الجزائر میں مسلم عورت کے پردے کی مذہبی حیثیت بھی ہے اور سماجی بھی ..... جہاں تک برقعے کے رنگوں کا تعلق ہے۔ سب نقاب اولاً سفید تھے مگر بعد میں علاقائی نسبت سے ان کے رنگ بدلتے گئے۔ مثلاً یہاں مسلمان گورنر صالح بے کو فرانسیسیوں نے قتل کر دیا تو یہاں کی عورتوں نے اس کے سوگ میں پردے کو کالا رنگ دے دیا اور گذشتہ دو سو سال سے کالا نقاب ہی ڈالتی ہیں۔

''چلئے آپ کی طرف آئیں آپ نے شادی اپنی مرضی سے کی یا خاندان کے فیصلے کے مطابق؟''

جب میری شادی ہوئی تھی ان دنوں لڑکی سے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ اس کا باپ فیصلہ کرتا۔ مگر امیرا باپ تھا نہ بھائی مجھے اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی آزادی تھی میں نے شادی سے پہلے اپنے شوہر کو دیکھا ضرور تھا لیکن کبھی لمبی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی شادی سے پہلے اس کے ساتھ کہیں آئی گئی تھی۔ دراصل اس نے کئی سال تک شادی کرنے کی بات چلائے رکھی اس لئے میں نے بھی ہاں کر دی۔

''آپ کے شوہر عورت کو مرد کے برابر سمجھتے ہیں؟''

''نہیں، نہیں، نہیں۔ الجزائر میں کوئی مرد نہیں مانتا کہ کبھی عورت مرد کے برابر ہو سکتی ہے۔''

آپ نے اتنی جنگیں لڑیں جیتیں اور پھر آپ اس مقام پر پہنچیں تو کیا اس کی روشنی میں آپ سمجھتی ہیں یا آپ کا شوہر یہ سمجھتا ہے کہ وہ آپ کے مقابلے میں بہتر کارکردگی دکھا سکتا تھا؟

وہ حقیقت کو تو جانتا ہے مگر ماننے سے انکاری ہے آج تک اس نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ الجزائر کے تمام مرد سمجھتے ہیں کہ وہ عورت کے مقابلے میں برتر ہیں۔ آخر کار اس کی ذمہ دار خود خواتین ہیں جنہیں بچوں کو سکھانا چاہیے کہ عورت اور مرد برابر ہوتے ہیں البتہ الجزائری مرد بیٹے کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مرد ہے، عورتوں سے بہتر اور طاقت اور عورتوں سے بہتر اور طاقت ور اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ لڑکوں کی مردانگی اور فخر کو اجاگر کرنے کیلئے انہیں عورتوں سے بلند تر جاننا ضروری ہے۔

MashalBooks.org

میں نے آپ کی اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ کے شوہر گھر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرتے اور آپ کو ملازمت کے ساتھ ساتھ کھانا پکانا، صفائی ستھرائی، دھلائی اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی ہے۔

''ہاں، میں ہی کرتی ہوں میرا شوہر سمجھتا ہے کہ گھر کے سارے کام کرنا میرا فرض ہے اور یہ بھی میرا اپنی مرضی پر ہے کہ میں انسٹی چیوٹ میں نوکری کروں یا اسے ترک کر دوں۔ میں یہ سارے کام بہت مشکل محسوس کرتی ہوں مگر کر بھی کیا سکتی ہوں؟ میں محسوس کرتی ہوں کہ بچوں کی خاطر میں اپنی ازدواجی زندگی کو پکا اور محفوظ رکھوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچوں پر ایک اجڑے ہوئے گھر کے اثرات مرتب ہوں اسی لیے میں شادی کو پکا رکھنے کا جتن کرتی ہوں لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے ساتھ کتنی بڑی بے انصافی ہے؟ میری واحد توقع ہے کہ میری بیٹی کو وہی جنگ نہیں لڑنا پڑے گی اور نہ ہی اسے ان مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم کام بھی کرتی جاتی ہیں اور اس میں ہونے والی بے انصافیوں کے خلاف لڑ بھی رہی ہیں اور پر اُمید ہے کی اگلی نسل کے آنے تک جنگ جیتنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ آج سارے عالم عرب کی عورتوں کا یہی مسئلہ ہے وہ کام یا ملازمت بھی کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ گھر اور بچوں کی ساری ذمہ داریاں بھی پوری کرتی ہیں وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح باخبر ہیں کہ مردان سے کیا سلوک کر رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ہماری نسل ان حالات کو اتنی جلدی تبدیل نہیں کر سکے گی کہ ہم بھی ان تبدیلیوں سے مستفید ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہماری اگلی نسل، ہماری جدوجہد کا پھل کھائے گی۔ یہی وہ اُمید ہے جس کے سہارے ہم اپنا کام کئے جا رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ ہم روز بروز جو جنگ لڑ رہے ہیں دراصل اس کے ذریعے ایک اچھے مستقبل کی بنیاد اُٹھا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر گذشتہ چند سالوں میں میرے شوہر کے رویوں میں بھی ایک تبدیلی آئی ہے وہ یہ بات تسلیم تو کرتا ہے کہ میں تھک گئی ہوں، میں بہت زیادہ کام کرتی ہوں اور مجھے آرامی کی ضرورت ہے۔ بہت ہی کم مگر کبھی کبھار وہ میرا ہاتھ بھی بٹا دیتا ہے۔ اور میں یہ بخوبی جانتی ہوں کہ وہ ہماری خاطر کبھی بھی کھانا تیار نہیں کرے گا۔ یہاں شعبہ میں کام کرنے کے بعد گھر جا کر رات تک برتن دھونے، صفائی اور کھانے پکانے کا کام کرنا اور پھر ہفتہ وار چھٹیوں میں بھی یہی کچھ، میرے لیے کتنا کٹھن ہے۔

آپ کا خیال ہے کہ جو عورتیں باہر کام نہیں کرتیں، گھر میں رہ کر خانہ داری اور بچوں کی دیکھ

بھال کرتی ہیں وہ کارکن عورتوں کے مقابلے میں فائدے میں ہیں، ان کے پاس کم از کم آرام کرنے اور سونے کے لیے وقت تو کافی ہوتا ہے۔

''نہیں، یہ صحیح ہے ..... الجزائر میں وہ تمام عورتیں جو بظاہر گھروں میں خانہ داری اور بچوں کی دیکھ بھال کا کام کرتی ہیں اصلاً اور بھی بہت سے کام کرتی ہیں۔ الجزائر میں ایک نادر صورت یہ ہے کہ یہاں کی اسی فیصد آبادی بیس سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے۔ ہر گھر میں اوسطاً آٹھ بچے ہوتے ہیں چنانچہ عورتیں گھروں میں سوئی سلائی اور بنائی یا اسی قسم کے کام کرتی ہیں جن سے آمدنی بھی ہوتی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں مناسب جائزے لیں تو پتہ چلے گا کہ نوے فی صد عورتیں خانہ داری کے اُمور کے علاوہ کچھ اور کام بھی کرتی ہیں۔ جس بلڈنگ میں رہتی ہوں اس میں رہنے والی تقریباً ساری عورتیں معاوضے پر کام کرتی ہیں یا بزنس میں شوہروں کو مدد دیتی ہیں جو بہرطور پر پڑھی لکھی عورتیں ہیں۔ ایک بہت ہی امیر کبیر طبقہ ہے جس کی عورتوں کو کوئی بھی کام نہیں کرنا پڑتا مگر یہ طبقہ معاشرے کا بہت ہی چھوٹا سا حصہ ہے۔ ثابت ہوا کہ الجزائر میں عورتوں کی اکثریت پیسے کمانے والے کام کرتی ہے مگر گھر کے کام کاج میں انہیں خاوندوں کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ اور مرد صرف اپنے روزگار اور کاموں کے بارے میں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم عورتیں اب بھی اس کے لیے اہم لڑائی لڑ رہی ہیں کہ مختلف شعبوں، پیشوں، ملازمتوں میں عورتوں کو برابر کے مواقع دیئے جائیں۔ میرا ایمان ہے کہ اگر عورتیں اپنے اپنے پیشے پر اتنا ہی وقت دے سکیں جتنا وقت مرد دیتے ہیں تو ان کی کارکردگی مردوں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوگی۔ ایک اور بات بھی ہے اور ممکن ہے میں اس ضمن میں مردوں سے زیادتی بھی کر جاؤں جب زندگی کے کسی بھی شعبے میں کوئی تبدیل آنے والی ہوتی ہے عورت مرد کے مقابلے میں اس کا ادراک پہلے کر لیتی ہے۔ وہ زیادہ فراخ دل و دماغ رکھتی ہے تبدیلیاں اور زندہ رہنے کے نئے نئے ڈھنگ قبول کرنے کیلئے تیار ہوتی ہے مگر مرد اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ جب الجزائر بہت پس ماندہ تھا عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی پھر جب انقلاب شروع ہوا تو وہی عورتیں سپاہی بھی بن گئیں اور اس جدوجہد میں بھی اُنہوں نے اہم مقام حاصل کر لیا۔ آزادی کے بعد الجزائر کی عورت نے تیزی سے ترقی کی۔ عورت ہر دو تین برس بعد کچھ تبدیل ہوتی ہے مگر مرد اسے پسند نہیں کرتے وہ یہ سوچنے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں کہ عورتیں معاملات کو سمجھنے کی بہتر صلاحیت رکھتی ہیں اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ ان کا توڑ بھی کرنا

جانتی ہیں۔

مرد عورت کی صلاحیت اور جوہر کے خوف کے باعث بھی اسے مطیع رکھنا چاہتے ہیں یعنی مردانہ غلبہ قائم رکھنے کا ایک سبب یہ خوف ہے آپ کا کیا خیال ہے؟''

میرا اس پر مکمل یقین ہے۔ مرد تو اس بات پر ہی گھبرا جاتے ہیں کہ عورت ترقی اور تبدیلی کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔ چنانچہ ان پر یہ خوف مسلط ہو جاتا ہے کہ اس رفتار سے تو عورتیں ان سے بہت آگے نکل جائیں گی اور یوں وہ عورتوں کی ترقی کی رفتار کو سست رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرد عورتوں کو اس لئے بھی کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ کہ عورتیں تجربے، تفہیم، احساس کی جس منزل پر ہیں پہلے وہاں پہنچیں اور خود تجربہ کریں۔

''مرد خائف ہیں کہ اگر عورتیں معاشرے کا کنٹرول سنبھال لیں تو پھر وہ ایک بڑی سماجی تبدیلی لے آئیں گی، آپ کا خیال ہے؟''

ہر چند میں عورتوں کی آزادی کی حامی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ ہم عورتیں پہلے یہ طے کر لیں کہ ہم کس قسم کا معاشرہ بنانا چاہتی ہیں۔ اگر عورتوں کی آزادی کا یہ مطلب ہے کہ ہم یورپی عورتوں کی نقالی کریں تو میں اس کے خلاف ہوں۔ میں اس راستے پر نہیں جانا چاہتی جس پر یورپی عورت چل رہی ہے۔ میں نے جو مغرب میں دیکھا میں اس کے خلاف ہوں۔

''یورپی عورتوں سے آپ کو کیا شکایت ہے''

یورپی عورتوں نے اپنی تعلیم اور ملازمتوں کے لیے جدوجہد کی۔ ہم نے بھی وہی کچھ کیا۔ عورتوں نے یہ اہم معرکے مارے ہیں۔ مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ بعض اوقات یورپی عورت معاشرے میں مرد کے کنٹرول کو رد کرنے کے عمل کو شادی رد کرنے کے مترادف قرار دیتی ہیں۔ مغرب میں عورت اور مرد کو اپنا جیون ساتھی منتخب کرنے کی مکمل آزادی ہے مگر معمولی سی بات پر وہ طلاق لے لیتے ہیں اور اپنی من مرضی کا شکار بچوں کو بنا دیتی ہیں۔ میں اس کے خلاف ہوں۔ عورت کی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی مامتا کی شدت کو بھی کم کر دے اور بچوں پر بھی توجہ کم دے۔ دونوں عورت اور مرد کو مقدور بھر کوشش کر کے خاندان کو ایک اکائی کی صورت اکٹھا رکھنا چاہیے۔ مغرب میں خاندان کی اکائی پر جو زوال آیا ہے میں اس کے خلاف ہوں۔ طلاق کا آخر مطلب کیا ہے؟ مرد اور عورت دونوں آزاد ہو گئے ..... مگر بچوں کا کیا بنا؟ مغرب میں دولخت گھرانوں کی اولاد کی ایک پوری نسل ہے۔ یہ بچے کس قسم کی خاندانی زندگی اختیار کریں

گے؟ شاید ہر معاشرہ ہی منفرد ہوتا ہے۔ شاید مغربی معاشرہ اپنے بہترین مفاد کے مطابق خاندانی زندگی کو منضبط کرنے کا طریقہ ڈھونڈھ لے مگر ایک عرب اور ایک مسلمان عورت کی حیثیت سے میں اس بات کے خلاف ہوں کہ مرد کے کنٹرول کو رد کرنے کے لیے وہ شادی نہ کریں یا معمولی سی بات پر طلاق لے لیں۔ ہمارا معاشرہ ترقی پذیر ہے اور ہمارے معاشرے کو مغربی معاشرہ کے متذکرہ بالا معاملات ہرگز راس نہیں۔ ہمیں اپنے طریقے ڈھونڈنے ہوں گے، اور اس لئے ہمیں قربانیاں دینا ہوں گی۔

کیا آپ کی نظر میں ہمارے معاشرے میں اکثر اوقات صرف عورتیں ہی ہیں جو اپنے بچوں کو پرسکون اور پرامن زندگی کے لیے قربانیاں دیتی ہیں؟ مرد عورتوں کی قربانی کے اس جذبہ کو پوری طرح اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں وہ اپنے خاندان یا بچوں کے لیے کبھی قربانی نہیں دیتے۔ اور صورت یوں ہے کہ عورت بیچاری پھر سب سے نچلی سیڑھی پر کھڑی نظر آتی ہے۔

''مجھے آپ سے اتفاق ہے'' ہمارے مرد ہمیں استعمال کرتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بچوں کی خاطر قربانی دینے کے ہمارے جذبے کو وہ استعمال کرتے ہیں۔ مگر ہم اور کیا کر سکتی ہیں؟ یہ تو وہ جنگ ہے جو ہم لڑ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ جنگ خاندانی ڈھانچے کے اندر رہ کر لڑنی چاہیے نہ کہ اس سے باہر نکل کر۔ مغربی معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کیلئے میں وہاں کو ہی سربسر ذمہ دار قرار نہیں دیتی، مرد بھی قصوروار ہیں مگر جس طرح ہم الجزائر میں کہتے ہیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی پھر بھی میں عورت کی حیثیت سے عورتوں سے کہوں گی کہ وہ شہری کی حیثیت سے معاشرہ اور خاندان کی ترقی میں بڑا کردار ادا کریں گی۔ ظاہر ہے کہ مردوں کو بھی اپنا حصہ ڈالنا چاہیے مگر میرا معاملہ تو عورتوں تک ہے میں عورت اور مرد کو برابر کی سطح پر پیار بھرے بندھن میں بندھا دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ عورتیں آزادی یا ساری نفرت کا رخ مردوں کی طرف موڑنے کی خاطر ماں بننے کے جذبے اور صلاحیت کو ترک کریں اور اپنے آپ کو ایک بہت ہی عظیم اور شاندار احساس مسرت سے محروم بھی رکھیں۔ گذشتہ دنوں ایک فرانسیسی خاتون سے میری ملاقات ہوئی جس نے کہا کہ نہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے نہ بچے پیدا کرنے کی خواہش رکھتی ہے وجہ یہ کہ وہ ملازم ہے، بہت سیر و تفریح کر چکی ہے اور بھی جو کچھ کرنا چاہتی تھی کر چکی ہے۔ اب اسے خاوند یا بچوں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سچ ہے کہ عورت کو بھی ایک حد تک خودغرض ہونا چاہیے مگر اس طرح نہیں۔ یہ وہ خودغرضی ہے جو ہمیں معدوم کر دے گی۔

MashalBooks.org

میرے خیال میں الجزائر میں تو نسل انسانی معدوم ہونے والی نہیں جس کی شرح پیدائش دُنیا میں سب سے زیادہ ہے مانع حمل اشیاء کے استعمال اور پیدائش پر کنٹرول کے ضمن میں عورتوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔آپ کا کیا خیال ہے؟

''ہمارے معاشرے میں عورت کو برتھ کنٹرول کی کوششیں کرنی چاہیے اور صرف دو سے چار تک بچے پیدا کرنے چاہئیں۔اس طرح جو نیا معاشرہ پیدا ہوگا اس میں مرد کو گھر کے اندر اور گھر کے باہر عورت کے ساتھ ساتھ کام کرنا ہوگا۔لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے بھی سماجی سیاسی اور قانونی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔حکومت مردوں اور معاشرے سب کو عورتوں کی مدد کرنی چاہیئے تاکہ وہ اچھی مائیں اور اچھی شہری بنیں۔ایک غیر شادی شدہ عورت کے اوقات کار مقررہ اوقات کار کے برابر ہونے چاہئیں۔لیکن جب اس کی شادی ہوجائے تو پھر اس کے اوقات کار آدھے یعنی چار گھنٹے کر دیئے جائیں۔مرد گھر میں کچھ کام کاج کرے۔حکومت کارکن خواتین کے بچوں کے لیے اچھی اور سستی نرسریاں بنائے اس نئے معاشرے میں عورت کو اپنا روزگار بچانے کی خاطر راتیں آنکھوں میں کاٹنے کی بجائے یہ موقع دیا جائے کہ وہ زیادہ تخلیق صلاحیت حاصل کرے، خاندان اور بچوں کو زیادہ وقت دے کر خوش وخرم رہے۔اب بارہ بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔میڈم رضیہ کا خاوند اس سے پوچھ رہا تھا۔''تم کہاں ہو۔'' وہ ٹیلی فون پر شور مچا رہا تھا اور ادھر میں بھی اسے سن سکتی تھی۔

''میں عورتوں کے معاملات پر میڈم شعبان سے باتیں کر رہی ہوں'' رضیہ نے فرانسیسی میں جواب دیا اور ..... عورتوں کے بارے میں ..... ''اب آجاؤ، میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا! بس بات پانچ منٹ میں ختم کر رہے ہیں'' اس نے کہا اور ریسیور نیچے رکھ دیا۔

''مجھے بہت ہی افسوس ہے'' میں نے کہا ''مگر میری خواہش اور آرزو ہے کہ بجائے اس کے آپ ایک طرح سے مجرم ضمیر محسوس کرتی ہوئی گھر کی طرف بھاگیں، انہیں خود ہی لنچ تیار کر لینا چاہئے تھا''

''میں بھی بھلا کیا کر سکتی ہوں'' بڑی نرم مسکراہٹ کے ساتھ میڈم رضیہ نے کہا، میں تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ بھی ہماری جنگ کا حصہ ہے۔''

جب وہ اپنے دفتر کو تالا لگا رہی تھی میں نے کہا ''یہ بتائیں وہ آپ کا انتظار کیوں کر رہے ہیں؟ آپ گاڑی نہیں چلاتیں میں آپ کو گھر چھوڑ سکتی ہوں۔''

MashalBooks.org

''میں ڈرائیو کرتی ہوں اس نے کہا'' مگر وہ مجھے گاڑی نہیں چلانے دیتا، کہتا ہے کہ یہ بات ہمارے معاشرے میں قابل قبول نہیں ہے۔

''واہیات'' میں نے کہا ''صرف کانسٹیٹائن میں بے شمار عورتیں کاریں لئے پھرتی ہیں۔''

اوہو میں کیا کر سکتی ہوں، میں تنگ آ گئی ہوں اس نے کہا جب میں اور وہ لمبے کاریڈور سے ہوتے ہوئے باہر آ رہی تھیں میڈم رضیہ نے مجھے انٹرویو کرنے کی کوشش کی۔ مجھ سے پوچھا کہ میں نے جو جولڑائی لڑی ہے اس کا میں بتاؤں میں نے سوچا کہ گذشتہ دو گھنٹے میں میڈم رضیہ نے اپنا دل چیر کر میرے سامنے رکھ دیا تھا تو پھر وہ بجا طور پر مجھ سے توقع رکھتی ہیں کہ میں بھی اپنا کچھ حال بیان کرو اور چند قیمتی لمحے بچے ہیں ان میں جس قدر بھی ممکن ہے اپنا احوال سنا دوں۔ اچانک عمارت کے باہر سے تیز ہارن کی آواز آئی، ہارن کی آواز سن کر میڈم رضیہ نے میرا بازو کھینچا اور کہنے لگیں'' ہائے اللہ آؤ دوڑ کر چلیں۔ ہم دوڑنے لگے جیسے ہی ہم بلڈنگ سے باہر آئے اس نے اپنے خاوند کی کار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پاگل سا ہو کر کار پارک میں چکر کاٹ رہا تھا جیسے اسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ مجھے میڈم رضیہ پر ترس آیا میں نے کہا ''میں دیر ہونے پر آپ کے شوہر سے معذرت کر لوں گی، اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ہمیں دیکھنے پر میاں نے گاڑی روک لی۔ میں نے سلام کیا اور کہا'' معافی چاہتی ہوں آپ کو بڑی بھوک لگی ہے اور میڈم رضیہ کو میری وجہ سے دیر ہو گئی ہے، ہم عورتوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے، ..... ''اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر سر ہلایا۔ جیسے اس معذرت کے جواب میں اس سے کسی مروتانہ لفظ کی توقع نہ رکھی جائے میرے خیال میں اس کے ذہن میں دور دور بھی یہ خیال نہیں ہو گا کہ اس کی ہم سے ناراضگی کی بجائے ہمارے اس سے ناراض ہونے کی وجوہات زیادہ وزنی تھیں۔

میں نے یونیورسٹی میں ایک ممتاز اسسٹنٹ مسز بخانن سے انٹرویو کیا۔ اس کی عمر بتیس برس ہے۔ دو بیٹے ہیں جن کی عمر سات اور پانچ برس ہے۔ آٹھ سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہ کیا:

''عورت کی حیثیت سے کن کن باتوں پر آپ کو غصہ آتا ہے۔''

پہلا غصہ تو شادی شدہ ہونے پر آتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں میں جو چاہوں وہ کرنے میں آزاد نہیں۔ فرض کریں میں سیر کے لیے باہر جانا چاہتی ہوں مگر نہیں جا سکتی۔ مجھے خاوند سے کہنا پڑے گا اس کی اجازت لینے کیلئے۔ مجھے بیان کرنا پڑے گا کہ میں کہاں اور کیوں جانا چاہتی

ہوں۔ وہ اکثر مان جاتا ہے مگر مجھے ہر بار پوچھنا پڑتا ہے۔ اور اسے اتفاق کرنا ہوتا ہے۔ میں اپنے طور پر کسی بھی بات کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں۔ اس بات پر غصہ آتا ہے اس کی مرضی معلوم کرنے کیلئے اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات وہ ارادہ کو ترک کر دیتی ہوں۔ شادی سے پہلے ایسے مسئلے نہیں تھے۔ جب میں کنواری تھی میں جہاں چاہتی جا سکتی تھی مجھے والدین سے بھی اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج کل میری ماں بیمار ہیں میں ان کے پاس جانا چاہتی ہوں لیکن اگر میرا خاوند اجازت نہ دے تو میں وہاں نہیں جا سکتی۔ مگر میں اسے بتائے بغیر کوئی کام کرلوں تو اس پر جھگڑا ہوتا ہے۔

''کیا اس پر بھی اس کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ جب وہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو آپ سے اجازت لیتا ہے؟''

''میں نے اسے کبھی کہا ہی نہیں کہ وہ یہ یا وہ کیوں کر رہا ہے جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو اس کی مرضی کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتی حتیٰ کہ آپ سے ملنے بھی نہیں آ سکتی۔ مشکل تو یہ ہے کہ فرض کریں میں گھر پر ہوتی ہوں۔ آپ ٹیلی فون کرتیں اور بلاتیں کہ چائے پی جاؤ لیکن میں نہیں آ سکتی مجھے اس کا انتظار کرنا ہوتا ہے۔ اس سے اجازت لینا ہوتی ہے۔ مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے۔

آپ اس لئے ناراض ہوتی ہیں کہ اس طرح مرد اور عورت میں فرق نمایاں ہو کر ابھرتا ہے؟

''جی ہاں، میں نے یہ بات اس سے کبھی کہی ہے، گو وہ کہتا ہے تم میری بیوی ہو تم عورت ہو تم میرے بغیر معاملات کا فیصلہ نہیں کر سکتیں'' وہ اپنے گھر میں بڑا بیٹا تھا، اس کی ماں نے اس سے بے پناہ پیار کر کے اسے بہت بگاڑ دیا ہے اب اس کیلئے یہ ناممکن ہے کہ مجھے برابری کی سطح پر قبول کرے۔

میں اس بات سے پریشان ہوں کہ میں نے جتنی عورتوں سے گفتگو کی ہے ان کی اکثریت نے دوسری عورتوں (ان کی ماؤں یا بہنوں) کو خاوند کے رویے کا ذمہ دار قرار دیا ہے کیا آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خود ہمارا کردار بدلنے میں بھی صرف اور صرف مائیں ہی تو ذمہ دار نہیں ہوتیں؟

''میں اپنی ساس کو قصوروار نہیں ٹھہراتی کیونکہ اُنہوں نے بچوں کی تربیت اسی طور کی جس طور ان کی اپنی تربیت ہوئی تھی۔ اور وہ بالکل ہی ان پڑھ تھیں۔ اس زمانے میں لڑکوں کی تربیت

اسی طرح ہوا کرتی تھی۔ اب وہ محسوس کرتی ہیں کہ اُنہوں نے لڑکیوں کی تعلیم روک کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ بڑی لڑکی ہر چند بہت ذہین تھی مگر اس کو سکول سے اٹھوالیا گیا اب وہ اس وجہ سے بڑی ناخوش ہے کہ اگر اسے پڑھنے دیا جاتا تو وہ زندگی کا بہتر مصرف کر سکتی تھی۔ اسے زیادہ غصہ اس پر آتا ہے کہ اس سے سکول اس کے والد نے نہیں اس کے چچا نے چھڑوایا تھا وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو سکول بھیجنے پر رضامند نہ تھا اس لئے اس نے بھتیجی کو بھی سکول جانے سے روک دیا تا کہ اس کی بیٹی سکول نہ جانے کے بارے میں شور نہ مچائے۔

آپ کے خاندان میں بھی کوئی ایسا مرد تھا جو آپ کی تعلیم کے درمیان حائل ہو گیا ہو؟

نہیں یقیناً نہیں، میں پی ایچ ڈی کرنے انگلستان گئی مگر وہاں کا موسم اچھا نہیں لگا۔ شادی کے بعد میرے خاوند کو بہت شوق تھا کہ میں تعلیم جاری رکھوں اس نے مجھے ایم اے کرنے کیلئے زبردستی فرانس بھیجا۔ وہ جو جو باتیں اہم سمجھتا ہے ان کے بارے میں بڑا روشن خیال ہے مگر یہ سند نہیں کرتا کہ کسی معاملے میں میں اس کے بغیر فیصلہ کر سکوں۔''

''مگر یہ کیا بات ہے کہ تن تنہا فرانس جانے کے موقع پر وہ آپ پر اعتماد کر لیتا ہے مگر سیر کے لئے جانے یا سہیلی سے ملنے کے معاملے میں آپ پر اعتماد نہیں کرتا۔

''مجھے نہیں پتہ، نہ مجھے اس کی سمجھ آتی ہے، فرض کریں میں یونیورسٹی میں ہوتی ایک دوست مجھے چائے پلانے کے لیے بلاتی ہے۔ اگر میرا شوہر موجود نہیں ہے تو میں چائے پینے نہیں جا سکتی۔

آپ کا خیال ہے کہ اس کا یہ رویہ اس گمان پر ہے کہ آپ عورت کی حیثیت سے صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتیں؟

''نہیں میرا خاوند اس معاشرے کے اثر میں آ کر یہ کچھ کرتا ہے۔ وہ اکثر کہتا ہے کہ اگر ہم یورپ میں یا اسی قسم کے کسی اور علاقے میں رہ رہے ہوتے تو وہ اپنا رویہ مکمل طور پر تبدیل کر لیتا، مجھے اس کی بات پر یقین بھی ہے جب ہم چھٹیاں منانے جاتے ہیں تو اس کا رویہ وہی ہوتا ہے۔ جو میں چاہتی ہوں۔ یعنی برابر کا سلوک ..... اس کا سبب یہ ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ ہم سیر و تفریح پر ہیں اور یہاں ہمیں جاننے والا کوئی نہیں۔ جب کبھی ہم اس کے والدین سے ملنے جاتے ہیں تو اس کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے والدین کو دکھا رہا ہو کہ وہ ''مرد'' ہے۔ اب میں یہ معاملہ سمجھ گئی ہوں۔ میں حرف پوشیدہ بھی جان گئی ہوں اسی بنا پر کچھ احمات بھی دیتی ہوں تاہم اس

رویے کے باعث میرے دل میں اس کی عزت نہیں ہے ..... وہ دیانتدار نہیں ہے''

''میں نے دوسری الجزائری خواتین سے بھی یہی کہانی سنی ہے کہتی ہیں جب ہم الجزائر سے باہر نکل جائیں ہمارے شوہروں کا رویہ سراسر بدل جاتا ہے۔ وہ انہیں تن تنہا سینما دیکھنے یا سیر کے لیے جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ تو اصل میں یہ الجزائری معاشرہ ہے۔ جو عورتوں کی آزادی کی راہ کی دیوار بن گیا ہے۔''

''ہاں، بہرطور جو کچھ آپ اپنے گھر پر نہیں کرسکتیں وہ چھٹیوں کے دوران بیرون ملک کرسکتی ہیں۔ یہ میرا ملک ہے لوگ مجھے اور میرے خاندان کو جانتے ہیں مگر جب میں ایک دوسرے ملک میں ہوتی ہوں تو پھر مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ میں جو کرنا چاہوں کرتی ہوں اور یہی بات باقی سب پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ میرا شوہر ایک تحقیقی مرکز میں کام کرتا ہے۔ اس کے دوست بڑے رجعت پسند ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے ایسا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے تاکہ میں ان کے لیے قابل قبول رہوں وہ اس کے دوست ہیں اور مجھے ان کے جذبات کا خیال کرنا پڑتا ہے۔

''تو فی نفسہ یہ معاشرہ ہے جو آپ کی آزادیوں کے امکانات کم کردیتا ہے یا آپ یہ سب کچھ اپنے خاوند کے دفاع میں کہہ رہی ہیں؟''

''ہاں، میرا خیال ہے کہ ہم یہ سب کچھ اپنے شوہروں کے دفاع میں کہتی ہیں۔ میری مثال لیں، میرے والدین، مجھے وہ کچھ کرنے دیتے تھے جن سے میرا شوہر منع کرتا ہے۔ حالانکہ ہم اسی معاشرے میں سانس لے رہے ہیں۔ ہمارے ہمسائے ہوا کرتے تھے جو میرے بارے میں بری بری باتیں کیا کرتے تھے میرے والدین نے ان کی کبھی پروا نہیں کی تو پھر کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں اس کی پرواہ میرا شوہر کیوں کرے؟ آخرکار ہمارے ہمسائے بھی سمجھ گئے کہ میں کوئی برا کام نہیں کررہی اس لئے بالآخر وہ بھی خاموش ہوگئے۔ میرا خیال ہے کہ میں جو کچھ مختلف انداز میں کیا کرتی تھی اب وہ انہیں بھی پسند آنے لگا تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر ہم جو کچھ کریں دوسروں سے مختلف انداز میں کریں تو دوسرے بھی آخرکار ہماری تقلید کرنے لگیں گے۔ ممکن ہے پہلے بری بھلی باتیں کریں مگر آخرکار چپ ہو جائیں گے اور سیدھی طرح سوچنا شروع کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جب لوگ پڑھی لکھی آزاد عورت کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کے مطابق معاملات طے کرتی ہے اور اس طرح اچھی مثال قائم کرتی ہے تو لوگ ہر صورت میں اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لیے ہمت بھی چاہئے اور یہ کہنے کیلئے بھی حوصلہ چاہیے کہ

مجھے اپنے آپ پر پورا اعتماد ہے اور میں جیسے چاہوں گی ویسے ہی کروں گی''

عورتوں کی آزادی کے سوال پر آپ کو اپنے باپ اور شوہر میں کیا فرق نظر آتا ہے؟''جی میری ماں کیلئے میرے والد کو یہ بتانا ضروری نہیں تھا کہ وہ باہر واک کیلئے جا رہی ہے کئی معاملات میں وہ مقابلے میں زیادہ آزاد تھیں۔ میرے والد والدہ سے کہا کرتے تھے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہیں کر لیا کریں چنانچہ میری والدہ کو میرے والد سے بار بار اجازت نہیں لینا پڑتی تھی، جب میں یہ بات اپنے شوہر سے کہتی ہوں تو اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ اس کا طریقہ اس کا اپنا ہے اور یہ کہ وہ میرے والد کے طریق کار کو نہیں اپنا سکتا۔''

''آپ اس بات کی وضاحت کس طور پر کریں گی کہ آپ کے والد عمر میں بڑے بھی ہیں آپ کے شوہر کے مقابلے میں کم تعلیم یافتہ بھی مگر ان کا عورتوں کے بارے میں رویہ زیادہ لچک دار اور آزادانہ ہے؟''

میرا شوہر لبرل ہے مگر میرے والد جتنا لبرل نہیں۔ میرے شوہر کے عزیز پڑھے لکھے ہیں۔ میرے خیال میں اس کا سبب دونوں کی تربیت کا فرق ہے۔

''آپ اپنے بچوں میں عورتوں کے بارے میں صحت مند رویہ رکھنے کیلئے کیا کوشش کر رہی ہیں؟''

''وہ گھر میں دیکھتے ہیں کہ میرا شوہر میرا ہاتھ بٹا رہا ہے ان کیلئے ایک مرد کو باورچی خانے میں ہنڈیا پکاتے یا کچن کو ٹھیک کرتے دیکھنا ایک فطری سی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ سیکھ رہے ہیں کہ عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میرا شوہر گھر میں میرے ساتھ خاصا کام کرتا ہے اگر ریفریجیٹر میں لنچ نہیں ملتا تو وہ کوئی شکایت نہیں کرتا جب ہم یونیورسٹی سے واپس آتے ہیں تو ہم اکٹھے ہی کھانا پکانا شروع کرتے ہیں۔ اگر کپڑے استری نہیں ہوئے تو وہ بیٹھ جائے گا اور استری کرنا شروع کر دے گا۔ میرا گھر اور دفتر یا کام اسی انداز میں چل رہا ہے اس لیے میں نہیں سمجھتی کہ مجھے بیک وقت گھر کا پورا کام اور دفتر کا بھی پورا کام کرنے کی جنگ لڑنا پڑ رہی ہے۔ میرا واحد مشکل مسئلہ بچے ہیں۔ ہم جب دونوں کام کر رہے ہوں تو اس وقت ان کو کون دیکھے گا؟

گویا آپ ایک مراعات یافتہ الجزائری خاتون ہیں؟

''اگر میں اپنا مقابلہ دوسری عورتوں سے کروں تو یقیناً برتر مقام پر ہوں۔ میری بہن کی مثالیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہے مگر اس کا شوہر تعلیم یافتہ نہیں۔ اس کا خاوند بیوی کی کمائی نہیں چاہتا تھا

اس لئے میری بہن سے کہا کام چھوڑ دو، جب اس کے ہاں بچہ ہوا اس نے ایک سال کیلئے کام چھوڑ دیا، پھر دوسرا سال آ گیا ..... جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اس کا واپس کام پر جانا اور مشکل ہوتا گیا۔ اب وہ اس بنا پر ناخوش ہے کہ اس کے خیال میں اس کی زندگی میں ایک خلا آ گیا ہے۔ اس کے اندر کام کرنے کی خواہشیں اور جذبہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر وہ واپس اپنے کام پر جانا بھی چاہے تو نہیں جا سکے گی اس کے سسرال خاصے امیر نہیں وہ ہر روز تین سالن پکاتے اور کھاتے ہیں اور گھر اتنا صاف ستھرا کہ کوئی داغ تک نظر نہیں آتا۔ اس کے تین بچے ہیں اور وہ سارے کام اور بچوں کی دیکھ بھال کی وجہ سے تھک جاتی ہے۔ اس سے ایک نوکرانی والا سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو مدت کی چھوڑ چکی ہوتی۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ شروع سے ایک موقف اختیار کر لیتی تو وہ معاملات میں تبدیلیاں لا سکتی تھی لیکن وہ جتنی فرماں بردار بنتی گئی اس کا خاوند اتنا ہی فرماں روا ہوتا گیا۔ وہ ہر برس بڑے بڑے فیصلے کرتے ہیں مگر تبدیلی کوئی نہیں آتی۔ اگرچہ وہ تعطیل منانے بیرون ملک بھی جاتے ہیں، سماجی تقریبات پر اکٹھے نظر بھی آتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں لگتے، وہ خوش بھی نہیں ہیں۔

''آپ اپنی بہن کو قصوروار سمجھتی ہیں اور ایسی ہی صورت حال میں دوسری عورتوں کو بھی ملزم جانتی ہیں یا آپ ذمہ داری معاشرے پر ڈالتی ہیں؟''

میں دونوں کو قصوروار سمجھتی ہوں۔ انفرادی طور پر عورتوں کو اور اس معاشرے کو جس میں وہ رہتی ہیں۔ جس طریقے سے عورتوں کو غلام بنا کر رکھا گیا ہے عورتوں کو اس کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے۔ انہیں چیخنا چاہیے شور مچانا چاہیے اور جھگڑا کرنا چاہیے اور اپنے خیالات کو بالکل صاف اور واضح بنانا چاہیے۔ مثال کے طور پر میری بہن نے یہ بات قبول کر لی کہ اس سے نوکروں والا سلوک ہو، اب یہ بات حمتی ہے کہ اس کا مستقل رول متعین کر دیا گیا ہے اور اسے اس کے خلاف کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتی، میں نے بغاوت کر دی ہوتی اور ہر کسی کو اچھی طرح یہ بات سمجھا دیتی کہ مجھے کوئی یہ بتانے کی جرات نہ کرے کہ زندگی کس طرح گزارنی چاہیے۔

''مگر اگلے روز میں ایک پروفیشنل عورت سے باتیں کر رہی تھی تو اس نے بتایا کہ اس کا خاوند اس کی چھوٹی سی مدد بھی نہیں کرتا اسے سارے گھر کا کام اور بچوں کی دیکھ بھال خود کو کرنی پڑتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نوکری بھی ..... جب میں نے پوچھا کہ آپ اس کا کچھ علاج کیوں نہیں کرتیں کہنے لگی، بچوں کی خاطر، میں نہیں چاہتی کہ انہیں دولخت گھرانے کا عذاب سہنا

پڑے۔'' ..... آپ کا کیا خیال ہے؟

میرے خیال میں ایسی ماں جو آواز اُٹھانے سے ڈرتی ہے وہ بچوں کی اچھی ماں نہیں ہے کیونکہ ایسی ماؤں کے بارے میں مرد یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ کب خوفزدہ یا ناخوش ہوتی ہیں۔ اگر وہ یہ محسوس کریں کہ آپ خطرہ محسوس کرتی ہیں یا انتہائی ناخوش ہیں تو پھر وہ خود بھی خوش نہیں رہ سکتے۔ میرا خیال ہے کہ اب عورت کو بہانے تراشنے کی عادت چھوڑ دینی چاہیے اور وہ جس انداز میں رہنا چاہتی ہیں اس کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانا چاہئیں۔ عورتوں کو آغاز کار گھروں سے کرنا چاہیے پھر چھوٹے گروپ بنانے چاہئیں اور اپنے نامناسب حالات کے خلاف اجتماعی طور پر مہم چلانی چاہیے۔ یونیورسٹی میں میری ایک ساتھی ہیں ان کے پانچ بچے ہیں اپنے حالات کے بارے میں یوں بات کرتی ہیں گویا یہی ان کی قسمت تھی۔ ان کی ایک شکایت یہ ہے کہ ان کے بچے پانچ ہیں۔ لیکن یہ تو ان کی اپنی مرضی تھی کہ اتنے بچے نہ پیدا کرتیں۔ وہ مانع حمل چیزوں کے بارے میں باخبر بھی ہیں۔ تو اگر صرف دو بچے چاہتی ہیں تو پانچ بچے کیوں ہو گئے۔ وہ اپنے بچوں کے بارے میں اس طرح باتیں کرتی ہیں جیسے ہماری ان پڑھ مائیں کیا کرتی تھیں۔ ہماری انہی ماؤں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ زیادہ بچے پیدا نہ کریں۔ وہ اس بات پر زور دیا کرتی تھیں کہ زیادہ بچے ماں کی صحت کے لئے بھی ٹھیک نہیں اور بچوں کی پرمسرت زندگی کے لیے بھی نفع رساں نہیں۔ چنانچہ میرے لیے ایسی خواتین سے ہمدردی تک کرنا مشکل ہو جاتا ہے جو خود کو حالات کی ستم رسیدہ سمجھتی ہیں اور لگتا ہے کہ اپنے حالات پر رحم طلب کر کے خوش بھی ہوتی ہیں۔

آپ نے کہا کہ عورتیں کچھ کام اجتماعی سطح پر کریں۔ تو کیا وہ اس ملک میں عورتوں کی تنظیم یونیفا کے ذریعے کچھ کر سکتی ہیں؟

''نہیں، بالکل نہیں۔ یونیفا میں تو پڑھی لکھی عورتیں ہی ہیں؟ اس کی اکثر رکن وہ عورتیں ہیں جو دفتروں میں کام کرتی ہیں اور وہ لوگوں کو یہ بتانے اور دکھانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ عورتیں بھی وہ کام کر سکتی ہیں جو مرد کر رہے ہیں۔ چونکہ ہمارے ہاں عورتیں پہلے گھروں سے باہر کام نہیں کیا کرتی تھیں۔ اس لئے ان کا پہلا مقصد تو یہی دکھانا ہے کہ عورتیں مردوں والا کام مردوں کے برابر ہی کر سکتی ہیں۔ اُنہوں نے کوشش کی اور کسی حد تک مردوں سے یہ منوانے میں کامیاب بھی ہوئیں کہ جہاں جہاں عورت مرد کے برابر کام کر سکتی ہیں وہاں وہاں وہ برابر ہیں۔ لیکن دوسرے شعبوں مثلاً معاشرتی اعتبار سے وہ کوئی بھی تبدیلی نہیں لا سکیں۔ وہ کہتی ہیں کہ رسوم

ورواج اور روایات کی وجہ سے وہ معاشرے میں کوئی بھی تبدیلی نہیں لاسکتیں۔لیکن میرا خیال ہے کہ روایت اور رسم ورواج کا بیک وقت احترام بھی کیا جاسکتا ہے اور انہیں تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے۔اب یہ مانع حمل اشیاء کی مثال لے لیں یہ بڑا ہی اہم مسئلہ ہے مگر ان عورتوں نے تو ابھی تک اس پر لب کشائی بھی نہیں کی۔انہیں عورتوں کو یہ بتانا ہے کہ زیادہ بچے کیوں اچھے نہیں ہوتے۔ انہیں ماؤں کو بتانا ہوگا کہ وہ کس طرح کم بچے پیدا کرسکتی تھیں کہ ہم اتنے بچوں کو اچھے طریق سے پڑھانا تو دور مناسب طریقے سے پال بھی نہیں سکتے۔آپ جانتی ہیں دُنیا میں سب سے زیادہ شرح پیدائش الجزائر میں ہے۔اور ملک کی اسی فی صد آبادی بیس سال سے کم عمر کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل قریب میں ملک کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔جن عورتوں کے زیادہ بچے ہیں یا تو ان میں قوت ارادی ہی کمزور ہوتی ہے یا وہ زیادہ بچوں کی قائل ہیں۔ ہمارے ہاں عورتیں آپ سے تعریف وتوصیف حاصل کرنے کی بجائے غیر شعوری طور پر رحم کی توقع کرتی ہیں۔وہ چاہتی ہیں آپ ان سے کہیں ہائے ہائے بیچاریو تم اتنے سارے بچوں کو کیسے پالتی ہو؟ اگر تمہارے اتنے ڈھیروں بچے نہ ہوتے تو آپ بڑی ذہین کیریرسٹ ہوتیں، وغیرہ وغیرہ بعض عورتیں جنہوں نے اپنا نصیب قبول کرلیا ہے کہتی ہیں کہ اب اس مرحلہ پر وہ اگر کچھ کر بھی سکتی ہیں تو بہت ہی معمولی سا لیکن ہم توقع کرتی ہیں کہ ہم پر جو گذری ہے وہ ہماری بیٹیوں پر نہیں گذرے گی۔کیا یہ بات آپ قبول کرتی ہیں؟

نہیں، میری بھانجی کی مثال لیجئے وہ کہتی ہے کہ وہ ماں کے نقش قدم پر چلے گی۔وہ دیکھ سکتی ہے کہ مرد کیا سلوک کرتے ہیں اور عورتوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔میرا خیال ہے کہ وہ انہی مشاہدوں کے ساتھ جوان ہوگی۔وہ وقتاً فوقتاً میرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کیلئے آتی ہے تو اسے میرے شوہر یا بچوں کو باروچی خانے میں میرا ہاتھ بٹاتے دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے۔بعض اوقات وہ ان پر ہنستی بھی ہے۔ہم اسے بتاتے ہیں کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن وہ کہتی ہے میرے باپ تو باروچی خانہ میں آکر کبھی میری ماں کی مدد نہیں کرتے ہم اسے بتاتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کتنی ہی عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں جو کچھ نہیں کرتی مگر وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ جب وہ بڑی ہوگی تو اس کا رویہ اپنی ماں سے مختلف نہیں ہوگا بشرطیکہ ان کا طرز بود وباش یہی رہا جیسا کہ ان دنوں ہے۔اس لئے عورتوں کو اگلی نسل کا انتظار کئے بغیر جنگ آج سے ہی شروع کردینی چاہیے اور اُمید کرنی چاہیے کہ ان کی بچیاں ان

مسائل سے بچ جائیں گی۔ ہمیں خود مثالیں قائم کر کے اپنے بچوں کو سبق سکھانی چاہئیں۔ اگر آپ اپنے بچوں کو کوئی خاص کام کرنے سے منع کرتے ہیں لیکن وہ آپ کو وہی کام کرتے دیکھتے ہیں تو وہ بھی وہی کام کریں گے۔ اگر میں اپنے بچوں سے کہوں کہ وہ دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک کراس نہ کریں مگر میں خود بغیر دیکھے سڑک کراس کر جاؤں تو وہ کہیں گے ''ہماری ماں کہتی ہے کہ ہم دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک کراس نہ کریں مگر وہ خود بغیر دیکھے سڑک کراس کر جاتی ہیں۔ شاید وہ ہمیں کوئی غلط بات بتاتی ہیں یا ایسی بات جو صرف بچوں کے لیے ہوتی ہے تو وہ ہم نہیں کریں گے۔ اگر میں چاہتی ہوں کہ میرے بچے منفرد انداز سے زندگی گزاریں تو پھر مجھے بھی منفرد ہی ہونا پڑے گا۔''

''آپ نے کہا کہ خواتین کی تنظیم عورتوں کے لیے کچھ زیادہ کام نہیں کر رہی اور آپ یہ بھی چاہتی ہیں کہ عورتوں کو اپنے حالات بہتر بنانے کیلئے کام شروع کر دینا چاہیے آپ کا کیا خیال ہے آپ یہ کام کس طور کریں گی؟''

''میں اس لئے ہمیشہ ناراض رہتی ہوں کہ ہم لوگ کرتے کچھ نہیں۔ میرے خیال میں پڑھی لکھی عورتوں اور عورتوں کے حقوق کیلئے سرگرم خواتین کو عورتوں کی تنظیم پر یلغار کر کے اسے تبدیل کر دینا چاہئے۔ جو عورتیں اس وقت تنظیم میں ہیں وہ کارکن خواتین ہیں اور یہی بات مردوں سے برابری کیلئے کافی سمجھتی ہیں لیکن خود ان کا یہ حال ہے کہ وہ ملازمت بھی کرتی ہیں اور گھریلو کام بھی اسی طرح کرتی ہیں جیسے ملازمائیں کرتی ہیں۔ اور اس صورت حال کو چیلنج کرنے کی جرات نہیں کرتیں۔ میں اس بات پر بھی زور دینا چاہوں گی کہ خواتین کو انفرادی اور نجی سطح پر بھی یہ جنگ کرنی چاہیے کیونکہ سارا کام تنظیمیں نہیں کر سکتیں۔ ہر عورت کو اپنی زندگی کے بارے میں اپنے طور پر کچھ نہ کچھ پہل قدمی کر دینی چاہیے۔

''آپ کے خیال میں یورپی عورتیں آزاد ہیں یا آپ کو ان کی آزادی کے بارے میں کچھ اعتراضات ہیں؟''

''میں نے ایسی بے شمار یورپی خواتین کو دیکھا ہے جو ایسے ہی حالات میں رہتی ہیں جن حالات میں الجزائر کی عورتیں رہتی ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ ان کی سوسائٹی زیادہ سخت گیر اور نکتہ چیں نہیں وہ آزادانہ کچھ سکتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خوش ہیں۔ ان کے بھی معمول کے مسائل ہیں۔ ایک کارکن خاتون کو یورپ میں بھی گھر سنبھالنا پڑتا ہے اور بچوں کی

دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔فرق اتنا ہے کہ ہمارے خاوندوں کے مقابلے میں ان کے خاوند گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔اگر ہمارے شوہر کبھی ہمارا ہاتھ بٹائیں بھی تو ایسے جیسے ہم پر احسان کر رہے ہیں۔''

آپ چاہیں گی کہ عرب عورت یورپی عورت کے نقش قدم پر چلے۔یا آپ کے نزدیک عورتوں کی آزادی سے متعلق مسائل کا حل کوئی دوسرا ہے؟

''یورپی تقلید کے بارے میں میرے کچھ خیالات ناقدانہ ہیں۔ہمارے ہاں روایات ہیں جن پر سوفی صد عمل کرنا ضروری نہیں پھر بھی ان کا احترام کیا جانا چاہیے۔میں یہ بات زور دے کر کہوں گی کہ روائت کا احترام کرنے کا مطلب تنگ نظری نہیں ہے۔ہم اپنے خیالات بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ روایت کا احترام بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔کسی بھی تحریک آزادی کی اندھا دھند تقلید ہمارے لئے آخر کار نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔مثلاً میں چند ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جو سمجھتی ہیں کہ سگریٹ پینے سے بھی آزادی کا حصول آسان ہوگا، یہ عورتیں صرف چند یورپی خواتین کو جانتی ہیں جو سگریٹ پیتی ہیں۔میں ان سے اس لئے متفق نہیں کہ میں خود سگریٹ نہیں پیتی اس لئے کہ میں ان کی سگریٹ نوشی کے خلاف ہوں۔لیکن یہ رویہ کہ یورپی عورتیں جو کچھ کرتی ہیں اس لئے وہی کچھ یہاں کیا جائے اس کو غلط سمجھتی ہوں۔ہمیں دوسروں کی نقل مارنے کی بجائے اپنے انداز میں کام کرنا چاہیے۔عربوں کی حیثیت سے ہمیں خود کو اپنی ہی روایات سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔''

میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی دو ساتھیوں فاطمہ اور زہرا (دونوں شعبہ قانون میں کام کرتی ہیں) کے ساتھ مزید دو دن کانسٹینٹائن یونیورسٹی کی لائبریری میں کام کروں گی۔پہلے دن جب ہم وہاں پہنچے تو زہرا نے دیکھا وہ اپنا لائبریری کا کارڈ تو گھر بھول آئی ہے۔دربان نے حماقت کی اور اسے اندر نہیں جانے دیا۔دونوں میں تکرار شروع ہوگئی دریں اثنا میں نے دربان کو زہرا پر اتنی زوردار آواز میں گرجتے سنا جس کو لائبریری میں موجود ہر شخص نے سنا ہوگا۔''یہ تمہاری جگہ نہیں ہے،بہتر ہے گھر میں بیٹھو اور خاوند کے لیے کھانے پکایا کرو۔''

''میرا خاوند تمہاری طرح متعصب مرد ہے جو اس بات کا مستحق نہیں کہ میرے جیسی عورت اس کے لیے کھانا پکائے۔اس نے بھی اتنی ہی اونچی آواز میں جواب دیا۔اور اپنی عزت نفس اور اپنے فخر کا احساس دلانے کے لیے زور لفظ ''میرے جیسی'' پر دیا اور مجھے یہ انداز بڑا اچھا لگا،لیکن

میں اس سے الجھ پڑی کہ اسے درمیان میں خاوند نہیں لانا چاہیے تھا۔''

''مگر تم مجھ سے کیوں الجھ گئی تھیں؟'' جب میں آرٹس بلڈنگ میں کافی پیتے وقت تھوڑی سی ستائی تو اس نے سوال کر دیا۔ ''وہ سب ایک سے ہیں ..... خاوند ہو یا دربان اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سب مجھ سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں اور مجھے ان سب سے نفرت ہے۔'' میں نے اسے خاموش اور ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو بھڑاس نکالنے کیلئے بھری بیٹھی تھی اور اسے چپ کرانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی میرا خاوند معمولی تعلیم یافتہ ہے اور اس کا میرا اور دوسری عورتوں کے ساتھ رویہ اس دربان کیلئے رویے سے بہتر نہیں ہے۔ مجھے اس کیلئے کھانا پکانا پڑتا ہے اس کی قمیض دھونا اور استری کرنا پڑتی ہیں، اس کے گھر کی صفائی کرنا پڑتی ہے، اس کے بچوں کو پالنا پوسنا پڑتا ہے اور جب وہ بات کرنا چاہے اس وقت مجھے لکھنا یا پڑھنا بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ خاندانی تقریبات میں مجھے اس کے کمزور اور غلام سے رفیق کا رول ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں یونیورسٹی میں ہم پڑھاتے ہیں، مقدمات لڑتے ہیں۔ عورتیں سکولوں، ہسپتالوں، انجینئرنگ اور طبی شعبوں میں بھری پڑی ہیں اس کے باوجود ہمارے باپوں، شوہروں حتیٰ کہ دربانوں تک کی نظر میں ہم بے معنی حقیر سی انسانی مخلوق ہیں۔''

زہرا کا سانس بہت چڑھ گیا تھا۔ فاطمہ نے لقمہ دیا۔ ''اس ساری صورت کا بڑا سبب یہ ہے کہ تمام عرب معاشروں میں شادی کو عورت کی آخری منزل سمجھا جاتا ہے۔ عرب مردوں کی اکثریت اور عرب عورتوں کی بہت بڑی تعداد یقین رکھتی ہے کہ شادی اور بچوں سے باہر عورت کوئی وجود رکھتی ہی نہیں۔ قانوناً کسی عرب ملک کی رائے شماری یا مردم شماری میں عورت کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔ عرب ممالک کے تمام شہری صرف مرد ہیں اور ان کی بیویاں اور بیٹیاں ان کی ذاتی جائداد ہیں۔ جب ایک عرب شادی کرتا ہے تو اس کا اندراج اس کے باپ سے الگ فرد کی حیثیت سے ہوتا ہے جبکہ اس کی بیوی کا نام باپ کے نام سے علیحدہ کر کے اس کے نام کے ساتھ درج کر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ طلاق حاصل کرے اسے طلاق دے دی جائے اس کا نام دوبارہ والد کے نام کے ساتھ درج ہو جاتا ہے جبکہ اس کے بچوں کا نام ان کے باپ کے ساتھ نتھی رہتا ہے جو عورتیں غیر ملکیوں سے شادی کر لیتی ہیں انہیں کتاب وطن سے ہی خارج کر دیا جاتا ہے۔ ان کے بچوں کی قومیت ان پر نہیں ان کے باپ والی شمار ہوتی ہے۔ یہ بات مجھے اگلے روز ہی پتہ چلی کہ ایسی عورتیں اپنے ملک میں پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے کا بھی حق نہیں رکھتیں کیونکہ جونہی ان کی

غیر ملکیوں سے شادی ہو جاتی ہے ان کا نام ان کے والد والے حلقے سے کاٹ دیا جاتا ہے رہے خاوند وہ تو ہیں ہی غیر ملکی۔ اب زہرا نے ایک لمبا سانس لیا، ہاتھ میں کافی کا کپ مضبوطی سے پکڑا وہ یہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ چند منٹ پہلے جوش میں تھی مگر اب جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور وہ پرسکون ہو گئی تھی کہنے لگی ..... ''بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ جو رویہ قانون میں جھلکتا ہے دراصل وہی رویہ سوسائٹی کا ہے۔ ایک کنواری یا طلاق یافتہ عورت کے تن تنہا رہنے کو آج بھی قبول نہیں کیا جاتا جس کا واضح مطلب ہے کہ عورتوں پر ایک طرف ان کے والد کو اختیار ہے اور دوسری طرف شوہر کو۔ یہ بڑی وجہ ہے کہ یورپ کے مقابلے میں عرب ممالک میں طلاقیں بہت کم ہوتی ہیں اور اس کی یہ وجہ نہیں کہ شادی یہاں بڑی پرمسرت زندگی لے کر آتی ہے اور ہمارے مذہبی لوگ ہمیں شادی کی پرمسرت زندگی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عورتوں کے پاس متبادل صورتیں ہی بہت کم ہیں۔ اکثر کیلئے تو صرف ایک ہی صورت انتخاب رہ جاتی ہے کہ یا تو ظالم شوہر کو قبول کریں یا بدبخت باپ کو کیا ہمیں اس لئے مراعات یافتہ یا بہتر پوزیشن میں سمجھ لیا جائے کہ ہمارے پاس قانون کی ڈگری ہے؟ ہر عورت کی طرح ہمارے پاس چوائس کوئی نہیں ہماری کسی بات کا وزن ہے اور نہ ہی معاشرتی پوزیشن۔''

''تم نے جو کچھ کہا مجھے اس سے اتفاق ہے'' فاطمہ درمیان میں بولی ''لیکن مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہمارے بھی اسی قسم کے مسائل ہیں جیسے ان پڑھ یا عام عورتوں کے ہوتے ہیں۔ اپنے یا میرے کسی بھی موکل کا معاملہ لے لو۔ کیا تم دیانتداری سے کہہ سکتی ہو کہ اگر تم سعدیہ کی پوزیشن میں ہوتیں تو کیا محسوس کرتیں؟ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ زبردستی تمہاری شادی کر دی جاتی ہے اور پھر ایسی وجوہات کی بنا پر زبردستی طلاق بھی حاصل کر لی جاتی ہے جن وجوہات کا ایک فرد کی حیثیت سے تمہاری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ شینہ صحیح کہتی ہیں، انہیں اور بھی عام سی عورتوں سے ملاقات کرنی چاہیے میں انہیں سعدیہ ملاؤں گی''

ستم ظریفی ہے کہ سعدیہ کا عربی میں مفہوم خوش بخت عورت ہے۔ ہم جب سعدیہ سے ملنے گئے تو ایک بیڈ روم کے فلیٹ کے کمرے میں چٹائی پر سوئی پڑی تھی۔ فلیٹ اس کی ہم مکتب فاطمہ نے اسے کرائے پر لے کر دیا تھا وہ بڑی تھکی ہوئی ہے، فاطمہ نے سرگوشی کی ''گذشتہ ہفتے ڈیڑھ ہفتے سے اس کے سر میں شدید درد ہے۔ ہم بالکل خاموش بیٹھ گئے تاکہ وہ جاگ نہ پڑے۔ میں صرف اس کے کالے گھنگھریالے بال اور پرسکون براؤن چہرے کو دیکھ سکتی تھی۔ فاطمہ نے

منمناتے ہوئے کہا ''جب وہ سوتی ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کیونکہ صرف ایک وقت ہے جس میں وہ سب کچھ بھول جاتی ہے۔''

جب ہم آئے تھے تو ہمیں اس کے بچے کی موجودگی کا علم نہیں تھا مگر اب اس وقت پتہ چلا جب بچے نے چادر کے اندر ماں کے پستان چھوئے اور رونے لگا۔ سعدیہ بھڑک اُٹھی۔ پوری طرح بیدار ہو کر آنکھیں پوری طرح کھولنے سے پہلے کہنے لگی۔ ''خوش آمدید، مجھے پتہ تھا کہ آپ آ رہی ہیں خبر نہیں آنکھ کیسے لگ گئی۔ یقیناً بہت ہی تھکن ہوگئی'' وہ باہر چلی گئی غالباً منہ دھونے کے لیے اور پھر الجزائر کے مقامی انداز کے مطابق ہمیں خوش آمدید کہنے کیلئے واپس آئی ..... خوش آمدید کا انداز یہ ہے کہ رخساروں پر چار بوسے لئے جاتے ہیں۔ اس نے خوش آمدید کے کلمات پھر دہرائے، پھر خاموش ہوگئی اور کچھ سوچنے لگی پھر پوچھا ''آپ میری کہانی کیوں سننا چاہتی ہیں؟'' میں اس کے سوال پر پریشان سی ہوگئی ''دوسری عورتوں کو سنانے کیلئے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی اس کہانی کو سچ سمجھے گا تو آپ یوں کریں انہیں کوئی اور قصہ سنائیں جس پر وہ آسانی سے یقین بھی لے آئیں۔ آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ جو کچھ بیتے وہ سنتی ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچتیں کہ یہ سب کچھ آپ پر بھی بیت سکتا ہے تا آنکہ آپ عین اس واردات کے بھنور میں پھنسی ہوتی ہیں۔ میں دن میں کوئی ایک درجن بار اپنی داستاں اپنے ذہن میں دہراتی ہوں مگر یقین نہیں آتا کہ واقعی یہ سب کچھ مجھ پر ہی بیتا ہے۔

جب میں سولہ سال کی تھی میری ماں آئیں اور کہنے لگیں میں تمہاری شادی تمہاری بھابی کے بھائی سے کر رہی ہوں میں نے کہا کہ ابھی میں چھوٹی ہوں شادی نہیں کرنا چاہتی، میں نے دلیل بازی کی، کہا کہ میں تو اس شخص کو جانتی بھی نہیں جس سے آپ شادی کرنا چاہتے ہیں مگر میری باتوں کا کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا۔ میرے والد نے مجھے سمجھایا کہ میری اس شخص سے شادی کا فائدہ میرے بھائی کو ہوگا جس کی بیوی اس کیلئے مشکلیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ تمہاری شادی اس کے بھائی سے ہو جائے ''میرے والد زور دے کر کہتے رہے'' تو پھر اسے تمہارے بھائی سے زیادتی کرنے سے ہاتھ روکنا پڑے گا اور اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو پھر تمہیں اس کے بھائی کو ستانا ہوگا ..... نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے قطع نظر کی میں نے کیا کچھ کہا اور کیا محسوس کیا میری شادی اس شخص سے کر دی گئی۔ میری تمام پیش از وقت آرا کے خلاف میرا خاوند بے انتہا نفیس آدمی نکلا اور مجھے پسند آنے لگا۔ میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ ہم نے ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کر دی۔

ایک سال کے اندر لڑکا پیدا ہوا اور تین افراد پر مشتمل یہ خوش قسمت کنبہ بن گیا عین اس زمانے میں میرے بھائی اور بھابھی کے درمیان طلاق ہوگئی۔ توقع کے عین مطابق میرے خاندان والوں نے مجھے کہا کہ میں فوراً جوابی کاروائی کروں۔ دوسری طرف میرے خاوند پر بھی اس کے خاندان والوں نے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کو طلاق نہیں دیں گے لیکن آخر میں میرے خاندان نے مجھے عملاً اغوا کر لیا اور مجھے اپنے ساتھ اپنا پانچ ماہ کا بچہ بھی نہیں لانے دیا۔ ہم نے دیوانہ وار کوشش کی کہ ہم پھر اکٹھے ہو جائیں مگر ہماری ایک نہ چلی اور آخر کار ہماری علیحدگی ایک ایسی حقیقت بن گئی جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ شادی سے پہلے میں بڑی اچھی ڈریس میکر اور کشیدہ کار تھی میں نے یہ کام شروع کر دیئے اور والدین اور بھائی کی مالی مدد شروع کر دی جن کے ہاتھوں میرا گھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

''چند ماہ میں میرے والد نے میرے لئے ایک اور شخص ڈھونڈ لیا جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب قانوناً میری طلاق نہیں ہوئی تھی۔ اس صورت نے تو مجھے پاگل کر کے رکھ دیا۔ میں نے والد کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ روئی پیٹی اور خودکشی کی بھی ناکام کوشش کی مگر سب بے سود۔ آخر کار میرے والد مجھ مردے کو لے کر اس شخص کے گھر پر پہنچ گئے، شادی کر دی اور میں یہ کہوں گی کہ اس نے زبردستی میری عصمت دری کی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس شخص نے اس لالچ میں مجھ سے شادی کی تھی کہ ڈریس میکنگ اور کشیدہ کاری سے میں نے خاصا روپیہ کمایا اور سونا خرید رکھا ہے۔ جب اسے خبر ہوئی کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں اور میری شادی تک میرے والدین نے مجھے مکمل طور پر نچوڑ لیا ہے تو اس نے مجھے مارنا شروع کیا۔ دو دو تین تین دن گھر میں مقفل رکھتا اور روٹی پانی بھی نہ دیتا۔ مگر میں جا بھی کہاں سکتی تھی؟ میرے والدین نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ مجھے نہ زندہ قبول کریں گے اور نہ ہی مردہ وجہ یہ کہ یہ بات ان کے لئے معاشرے میں سخت بے عزتی کا باعث بنتی ہے کہ ان کی بیٹی ہر سال طلاق لیتی اور شادی کرتی پھرتی ہے۔ اب مجھے حمل ٹھہرے سات ماہ گذر چکے تھے میری زندگی جہنم بن گئی تھی۔ میرے پہلے شوہر نے میرے خلاف عدالت میں مقدمہ کر دیا کہ میں نے ایک شوہر کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کر لی ہے۔ محاورہ ہے اول تو کبھی برسے ناں اور برسے تو آسمان پھاڑ کر برسے۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ ہر جہنمی بلا نے میرے گھر کا رخ کر لیا ہے۔ ان مصائب کے ساتھ

ساتھ خاوند کی حرص زر کی تشفی کی خاطر میں نے کشیدہ کاری کا سخت کام دن رات شروع کر دیا تھا مگر عذاب یہ ٹوٹا کہ میرے دائیں بازو پر فالج گر پڑا۔ اب میری ضرورت کسی کو بھی نہیں تھی۔ ان سب نے منہ پھیر لیا اور الزام مجھی پر آیا کہ قصوروار میں تھی۔ میں ان سب کیلئے بوجھ بھی تھی اور سماجی خفت بھی۔ چنانچہ میں نے اپنی بچی کو اُٹھایا۔ دل میں شدید تلخی لئے زندہ رہنے کی خاطر اور شادی کی منڈی سے دور اپنی پرانی دوست کے پاس چلی آئی۔ قانوناً میری شادی میرے پہلے شوہر کے ساتھ ہے جبکہ میرے والد اور میرے دوسرے شوہر کے درمیان ہونے والے معاہدے کے مطابق میری شرعی شادی دوسرے خاوند کے ساتھ ہوئی۔ فاطمہ عدالت میں میرا مقدمہ پیش کر رہی ہے اور میں منتظر ہوں کہ عدالت میری زندگی کے بارے میں کیا فیصلہ سناتی ہے۔ لیکن میں ابھی سے یہ دیکھ رہی ہوں کہ میرا خاندان، میرے دونوں شوہر، معاشرہ اور قانون مجھے مجرم فریق قرار دینے والے کیونکہ میں عورت ہوں۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے وہ خاندان کے دباؤ کے تحت میرے فعل (دوسرا نکاح) کو جائز قرار نہیں دیتا کیونکہ قانون یہ کہتا ہے کہ مجھے شوہر کا انتخاب کرنے کی قانونی آزادی ہے۔

دسمبر 1986ء میں مجھے ایک بار پھر کانسٹینٹائن یونیورسٹی میں ایک مقالہ پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ کانفرنس کے اختتام پر الجزائری ادیبوں کی یونین کے صدر العربی نے تمام مہمانوں سے پوچھا کہ وہ الجزائر کا کون سا علاقہ دیکھنا چاہیں گے۔ میں نے فوراً کہا کہ میں جنوبی صحارا جانا چاہوں گی، مجھے یہ خیال تھا کہ اپنے مختصر سے نوٹس پر اتنی دور کے سفر کا بندوبست کرنا مشکل ہوگا۔ میرے ساتھیوں نے جو سب مرد تھے اس پریشانی کا اظہار کیا کہ اتنے لمبے چوڑے ریگستان میں میری حفاظت کی ضمانت ممکن نہیں۔ اُنہوں نے مجھے خاص طور بتایا کہ وہاں کے اکثر قبیلے تو عربی بولتے ہی نہیں اور جو عربی بولتے ہیں ان کا لہجہ اتنا مختلف ہے کہ میں سمجھ ہی نہیں سکوں گی یوں ان سے میری بات چیت نہیں ہو سکے گی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ اگر میں طیارے کے ذریعے بڑے شہر تمنراسیت (Tamnrassett) پہنچ بھی جاؤں تو مجھے صحارا کے اندر ان قبائل تک پہنچنے کیلئے تویل سفر کرنا پڑے گا، ایک کار اور ایک مترجم کی بروقت ضرورت ہوگی۔ صرف العربی نے کہا کہ نہیں یہ سفر آسان ہی رہے گا وہاں روزانہ پرواز جاتی ہے اور آگے کے سفر کا میں انتظام کر دوں گا۔

اس نے کہا کہ وہاں ایک اچھا ہوٹل ہے جس میں میں ٹھہر سکتی ہوں۔ اس ہوٹل میں چونکہ

سارا کنٹرول عورتوں کے پاس ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ میں واپس آنا ہی پسند نہ کروں۔ میں خوفزدہ بھی تھی اور اس سفر میں کشش بھی بہت محسوس کرتی تھی۔ رات کھانے کی دعوت کے خاتمے سے قبل میں نے صحارا کے سفر کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں اگلے روز تمام ڈر خوف قیافے اور ہچکچاہٹیں پیچھے چھوڑ کر تمنراسیت جانے والے طیارے میں سوار تھی اور پہلی بار صحارا میں فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ وسیع وعریض اور نوع بنوع مناظر والے صحارا کے اوپر دو گھنٹے کی پرواز کے دوران میں نے محسوس کیا کہ میرا دماغ سن سا ہوگیا۔ اچانک مجھے معلوم ہوا کہ میں توریت کا ایک بہت بڑا ٹیلہ دیکھ رہی تھی جو دراصل ایک بہت بڑے دماغ کی شکل کا ہے جس میں بڑی خوشی اسلوبی کے ساتھ رگیں لکیری گئی ہیں۔ میں ان نوع بنوع کے خوشنما ٹیلوں کی دلچسپ شکلوں اور سرخ پنسل سے کھینچیں دلچسپ رگوں کی تصویر شاید کبھی نہ بنا سکوں گی۔

اس صبح کانسٹینٹائن کے ہوائی اڈے پر نے عورتوں کو سیاہ چادروں میں ملبوس چھوڑا تھا۔ اور ان کے چہرے (آنکھیں چھوڑ) مثلث نما سفید کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے اور شام کو میں اسی الجزائر کے شہر تمنراست میں عورتوں کی بجائے مردوں کو نقاب پہنے دیکھ رہی تھی۔ یہ نہ تو پراسرار جنوب سے متعلق کوئی پوسٹر تھا نہ ہی پرانے وقتوں کی کوئی پینٹنگ بلکہ گوشت پوست کا مرد تھا میری طرف آرہا تھا اس نے بال اور چہرہ ایک بڑے موٹے گول کپڑے سے ڈھانپ رکھے تھے صرف آنکھیں باہر تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے بے پردہ چہرے والی عورت تھی، خنک تر و تازہ کرنے والی ہوا چل رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی سورج غروب ہونے کا بے مثال منظر تھا۔ شلیفہ Shaliefa دراصل میری مترجم تھی اور محمود اس کا شوہر تھا۔ ان سے پہلی ملاقات ہی انکشاف کا درجہ رکھتی تھی مگر اس ملاقات کے بعد بے شمار اور انکشافات میرے منتظر تھے۔ جو الطّوارق Al Tawariqu قبائل کی تاریخی سرزمین الہوغر سلسلہ کوہ کے مختصر سے مگر انتہائی قیمتی دورہ کے دوران پیش آئے۔

شلیفہ اور محمود مجھے تحت Tahat ہوٹل لے گئے۔ ایک منزلہ عمارت میں لمبے لمبے موڑ کاٹتے کاریڈوں میں الگ الگ کمرے تھے۔ ریسپشنسٹ نے مجھے ڈبل روم دیا جس میں ریفریجریٹر، ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون تھا مگر ان میں سے کوئی بھی چیز کام نہیں کرتی تھی۔ کمرہ بڑا تھا، بے حد ٹھنڈا اور اس لمبے سفر کے بعد نہانے کے لیے گرم پانی نہیں تھا۔ مجھے بھوک بھی لگی تھی سردی بھی اور میں ناصاف بھی بہت تھی۔ ان تینوں کیفیتوں کے مکروہ ملغوبے کا ایسا تجربہ زندگی میں

مجھے اس شام ہوا۔ کمرے میں ٹیلی فون نہیں تھا اور کمرے کے دو دروازے صحرا میں کھلتے تھے اس لئے میں بڑی خوفزدہ بھی تھی۔ لیکن لوگ انتہائی مہربان تھے اُنہوں نے میرے لئے پانی کا گھڑا گرم کیا جس سے میں نے نیم غسل کیا، ایک بہت ہی گرم پیالہ چائے اور دو موٹے موٹے کمبل۔ میں بڑے سکون سے سوئی رہی تا آنکہ صبح صحارا کی شوخ دھوپ میرے گرم اور خوشگوار کمرے میں آنے لگی۔

ایک بڑی اچھی ریسپشنسٹ جلدی ہی میرے لئے ناشتہ لے آئی اور پوچھا کہ کیا میں تار توئی قبیلہ کی اس عورت سے ملنا چاہوں گی جو ہوٹل میں ہی کام کرتی ہے۔ ''بڑے شوق سے'' میں نے جواب دیا، اس نے کہا کہ جب وہ ٹرے لینے آئے گی تو اسے ساتھ لیتی آئے گی۔ نو بجے کے قریب بھورے چہرے والی دبلی پتلی عورت میرے کمرے میں شرمیلے انداز میں فرش پر نظریں گاڑی بیٹھی تھی۔ گالوں کی نمایاں اونچی ہڈی، گہری سیاہ آنکھوں اور کنڈل بنے سختی سے بندھے بالوں سے وہ الجزائری لگتی تھی۔

میں بے تابی سے سوال کرنا چاہ رہی تھی ایک ایسی عورت سے جس کی چال ڈھال لب ولہجہ اور طرز زندگی مختلف تھی۔ مجھے عورتوں سے اس قسم کے سوالات براہ راست کرنا اچھا نہیں لگتا مگر میں اسی قسم کا سوال کر رہی تھی۔ وہ انجینئر ہوں، ڈاکٹر حتیٰ کہ وزیر بھی ہوں انکو ان کے ازدواجی مرتبہ سے جانا جاتا ہے۔ شادی شدہ یا کنواری ..... ماں یا ماں نہیں بنی ..... اور میں تھی کہ بالارادہ ایک تعصّبانہ انداز اختیار کئے ہوئے اور شاید اس لئے بھی کہ میں بہر طور وہی سوال تو کرنے والی تھی چنانچہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تیتا Tita صرف چھبیس برس کی ہے میں نے کہا ''تم شادہ شدہ ہو''

''نہیں ابھی نہیں'' اس نے سیدھے سادھے انداز میں جواب دیا، ''لیکن چار مرتبہ میری شادی ہو چکی ہے۔ اس کے جواب کے ساتھ تمسخر اڑاتی ہوئی مسکراہٹ اور لہجہ لاپرواہی والا تھا، میں، میں تو جواب سن کر کرسی سے تقریباً گر ہی پڑی تھی۔ اس خیال پر میرا بلڈ پریشر کبھی اوپر جاتا کبھی نیچے آتا کہ چار شادیاں اور چار شادیاں اور چار طلاقیں کتنے عذاب لے کر آتی ہیں اور یہ نوجوان عورت ان سب عذابوں سے گذری ہوگی۔ اس نے میری طرف ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا جیسے جانتی ہو کہ میرے دماغ میں کیا کیا منظر چل رہے ہیں۔ الطّوارق قبیلے میں عورتیں پانچ یا چھ شادیاں کرتی ہیں، اس نے کہا'' اس میں ہمارے لئے تعجب کی کوئی بات نہیں،

پھر وہ ذرا آسودہ ہوئی اور زندگی کی کہانی سنانے لگی جس کی میں نے بعد میں تصدیق اور توثیق بھی کی اور مجھے پتہ چلا کہ الطّوارق قبائل کی ہر عورت کی یہی کہانی ہے۔

''جب میں نو سال کی تھی تو میری ماں ایک اور مرد کے ساتھ چلی گئی جسے وہ میرے باپ کے مقابلے میں زیادہ چاہتی تھی، میں اور میری دو چھوٹی بہنیں اپنے باپ کے پاس رہ گئیں۔ ہماری ماں ہم سے باقاعدگی سے ملنے آیا کرتی تھی مگر ہم اس کی غیر موجودگی کو بہت محسوس کیا کرتے۔ میرے والد کو ماں کا جانا بہت برا لگا مگر اس کو جانے سے روک بھی نہ سکا ماں کے بغیر اس کی حالت بھی خراب تھی۔ ماں نے سیدھے انداز میں ہمارے باپ سے کہا کہ اب مجھے تم سے محبت نہیں رہی میں فلاں مرد کے ساتھ محبت کرتی ہوں اور پھر ایک خوفناک سوال کر دیا،'' کیا ان حالات میں وہ چاہے گا کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔'' باپ کو نفی میں جواب دینا ہی تھا۔ جوابی طور پر میرا والد ہمیں طویل عرصے کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ نائجر اور مالی جانے والے ان کاروانوں کے ساتھ گیا جو صحرا پر نقش بناتے جاتے ہیں۔ جہاں وہ البشناALBishna (ایک قسم کی گندم اور کیڑے) کا تبادلہ نمک اور شیہیShiehi (چائے کی ایک بوٹی) سے کرتے۔ دراصل باپ ہمیں جلد از جلد بیاہ کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب میں چودہ سال کی ہوئی تو اس نے اپنی پسند کے ایک مرد سے شادی کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ میرے والد نے زبردستی نہیں کی مگر شادی کے لیے اس کا دباؤ بڑھتا چلا گیا اور آخر کار وہ ایک ''زبردستی کی ہاں'' کہلوانے میں کامیاب ہو گیا۔ بہر طور میں نے اس مرد کے ساتھ صرف ایک رات گذاری .....اور باپ کے گھر کو کبھی نہیں چھوڑا۔ الطّوارق میں تمام عورتیں شادی کا پہلا سال ماں کے گھر میں گذارتی ہیں (ماں کے گھر سے مطلب ہے والدین کا گھر یا میکہ) اس لئے کہ اس عرصے میں نو بیاہتا جوڑا اپنا گھر (خیمے) وغیرہ بنا لے، سجا لے اور صحیح معنوں میں آئندہ کی شادی شدہ زندگی کیلئے تیاری کر لے۔ الطّوارق میں عورتوں کا پہلا بچہ میکے میں پیدا ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی بڑی تعداد اپنے پہلے شوہر کے گھر منتقل ہی نہیں ہوتی کیونکہ سال گذارنے سے پہلے ہی ان کو طلاق ہو جاتی ہے اس کی یہ وجہ نہیں کہ والدین عموماً اپنی بیٹیوں کے معاملے میں مداخلت کرتے رہتے ہیں۔ جب طرقوئی عورت پہلی بار طلاق حاصل کر لیتی ہے تو پھر وہ کسی سے بھی صلاح مشورہ کئے بغیر اپنی پسند کے مطابق کسی سے شادہ کرنے میں آزاد ہوتی ہے اس میں منطق (بہت سے والدین نے بعد میں مجھ سے یہ

وضاحت کی) یہ ہے کہ نوعمر لڑکیوں نے بڑی قریب سے مردوں کو تو دیکھا نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنے خاوند کا مناسب انتخاب نہیں کرسکتیں۔ جب انہیں مرد کے ساتھ پہلا تجربہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنے معاملات خود ہی بخوبی طے کرسکتی ہیں۔'' چنانچہ'' تیتا نے بات جاری رکھی'' یہاں پہلی شادی اس لئے ہوتی ہے کہ میکے کا تحکم یا اتھارٹی ختم کی جائے اور اپنی مرضی کے مرد سے شادی کی جائے۔

لیکن شادی اور طلاق ہوتی کس طرح ہے، طریق کار کیا ہے'' میں بے تابی نہ چھپا سکی اور پوچھ لیا۔

''شادی اور طلاق کا طریقہ کار بڑا سادہ ہے۔ ہم اپنی شادیوں کا اندراج سرکاری دفتروں میں نہیں کراتے۔ صرف چار گواہ قریبی طالب (قبیلے کا مذہبی سربراہ) کے پاس جانا ہوتا ہے۔ اور اس کے سامنے یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ میں فلاں مرد سے شادی کررہی ہوں یا اسے طلاق دے رہی ہوں۔''

پہلے خاوند کو طلاق دینے کے بعد ایک اور آدمی نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے وہ زیادہ پسند تو نہیں تھا مگر میں اپنے آپ کو بڑا اکیلا محسوس کررہی تھی چنانچہ میں نے اس سے شادی کرلی۔ تقریباً ایک سال کے بعد میں اپنے ایک ہمسائے کے عشق میں ڈوب گئی۔ ظاہر ہے کہ مجھے دوسرے خاوند کو طلاق دینا تھی۔ اور پھر اپنے پہلے محبوب سے شادی کرنی تھی، میں نے یہی کچھ کیا۔ تیسرے خاوند کے ساتھ میں نے خوشیوں بھرے دو سال گذارے اس عرصہ میں دو بچے بھی ہوئے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور میری بدقسمتی کہ اس کی زندگی میں ایک خوبصورت جوان عورت طلوع ہوئی اس نے مجھے طلاق دی اور اس عورت سے شادی کرلی۔ میں اسے اس لئے قصوروار نہیں کہتی کہ خود میں نے اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ یہی کچھ کیا تھا مگر میرا حال بہت خراب ہوا۔ مجھے یاد ہے میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اب میں کبھی شادی نہیں کروں گی کیونکہ اب میں مزید چرکے نہیں کھا سکتی۔ دو سال گذرے اور میں نے یہ عہد توڑ دیا اور ایک ایسے مرد سے شادی کرلی جسے میں بہت کم جانتی تھی۔ ہم چند ماہ ہی اکٹھے رہے تھے کہ وہ لبیا چلا گیا اور واپس نہیں آیا۔ تشفی صرف اس بات کی تھی کہ میں ہر مرتبہ اپنے بچوں کو پاس رکھنے میں کامیاب رہی۔''

ایک اور طرقوئی عورت بھی تتیا کی کہانی سن رہی تھی اس نے اس کی بہن کا پوچھا اور کہا اس کا

بیٹا ہے یا بیٹی ..... تیتا نے موضوع تبدیل کرنے کے لیے مختصراً جواب دیا۔

''بیٹی۔''

صاف نظر آتا تھا کہ وہ جھینپ گئی ہے، مجھے بھی تجسس پیدا ہوا اور میں نے پوچھ لیا'' تمہاری بہن شادی شدہ ہے؟''

''نہیں'' اس نے ہاتھ رگڑتے اور ان پر اداس نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اس کا بچہ کیسے ہوا'' میں نے بھول پن میں پوچھا۔ میرے خیال میں میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ ایک عرب ملک میں شادی کے بغیر وہ بچہ کیسے پیدا کر سکتی ہے۔

''ہاں'' تیتا نے جواب دیا'' اس کا ایک مرد سے معاشقہ چل رہا تھا جو بہت ہی غیر ذمہ دار تھا میری بہن ان تعلقات کے بارے میں بڑی سنجیدہ تھی جب کہ وہ صرف خوش گذران کر رہا تھا۔ وہ حاملہ ہوگئی اور بچہ پیدا ہوگیا'' وہ اور کیا کرتی؟ اب وہ میرے بچوں کے ساتھ ساتھ اپنے بچے کی پرورش کر رہی ہے۔

''مگر لوگ باگ اس کے بارے میں کیا باتیں کرتے؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی کچھ نہیں۔ وہ کیا کہہ سکتے ہیں بچی کو دیکھ کر ممکن ہے کچھ منمناتے ہوں'' بے شرمی کی بات۔ بچی کو باپ کی ضرورت ہے۔'' یہاں ہمارے ہاں مجموعی طور پر لوگ اس مرد سے شدید نفرت کرتے ہیں جو ایک عورت کو حاملہ تو کر دیتا ہے اور پھر شادہ کر کے اس کی پیدائش کو قانونی اور اخلاقی نہیں بناتا۔ اگر ایسے واقعے پر کسی کو ندامت ہونی چاہیے تو وہ مرد ہوتا ہے نہ کہ عورت۔

میں جو کچھ سن رہی تھی اس پر حد درجہ حیران تھی مگر میں نے اپنی حیرانی کو چھپانا چاہا تا کہ ہماری گفتگو جاری رہے'' گویا عورت کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا'' میں نے کہا۔

'' بھلا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ ہم بچے کے پالنے پوسنے میں اس کی مدد کرتے ہیں'' تیتا نے کہا۔

میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی'' میرا مطلب ہے کہ بعض دوسرے عرب ممالک میں تو ناجائز اولاد کی سزا ماں کی دی جاتی ہے، اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اس نے سارے خاندان کی عزت خاک میں ملادی۔ اور اگر آپ یہ سمجھیں کہ اس نے وہ جرم کیا ہے تو پھر اس صورت میں سزا دینے کی کاروائی کرتے ہیں ہمارے قبیلے میں ہمیشہ تعزیزی راستے کی بجائے اصلاح کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ بن بیاہی ماں معاشرے کی بڑی اچھی رکن بھی ہوسکتی ہے اور

بڑی اچھی ماں بھی۔''

عالم عرب میں ایک ایسی جگہ کا ہونا بھی بڑا تعجب انگیز تھا جہاں کا معاشرہ بن بیاہی ماؤں کے گروپ کو سماجی روائت کے مطابق مناسب انداز سے زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ بہرطور میں نے جو کچھ سنا وہ سراسر خلاف توقع ہے۔ میں یہ سننے کی اُمید لے کر یہاں نہیں آئی تھی۔ مگر اسلام کا یہ روپ بڑا سادہ ہے اور انسانیت نوازی اور محبت اور پیار کی اخلاقیات سے کہیں متصادم یا متضاد نہیں۔ صحارا روئے ارض پر ایک خوبصورت پیوند ہے اور اس صحارا میں ہر چیز خالص پاک اور قابل فہم لگتی ہے۔

جنوبی صحارا کے شہر اوطول Otool میں میرے استقبال کیلئے طرقوئی لباس میں ملبوس آنے والی خواتین میں سے ایک انتہائی خوبصورت اور نوجوان عورت میری نظروں میں سج گئی۔ وہ خاموش اور خیال مست نظر آتی تھی چنانچہ میں کوشش کر کے اس کے قریب بیٹھی۔ ہنس ہنس کر اس سے باتیں کیں اور سادہ سوال پوچھنے شروع کئے جب اس نے مجھ سے گفتگو شروع کی تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ پیاری لگی۔ کھجوروں کی چائے پینے اور دہی کھانے کے بعد اس سے کہا کہ وہ اپنی کہانی سنائے۔

فاطمہ نے گہرا سانس لیا'' میری زندگی واقعی بڑی مشکل ہے میں شاید زیادہ عمر کی نہیں لگتی مگر مجھے لگتا ہے کہ میں سو سال کی بڑھیا ہو چکی ہوں جب میرے والد کا انتقال ہوا میری عمر ایک برس کی تھی میری ایک بڑی بہن تھی، ماں تھی اور میں تھی۔ ہم جب جوان ہوئیں تو خوبصورت بھی تھیں اس لئے ماں کو فکر تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں بیاہ دے۔ جب میں چودہ سال کی ہوئی تو میری شادی مجھ سے تیس سال بڑے مرد سے کر دی گئی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے صرف ایک بات بڑی اچھی طرح علم تھا اور وہ یہ کہ میں اس مرد سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ میں انتہائی ابتر حالت میں دو برس اس کے ساتھ رہی یہ دو سال کا عرصہ میرے لیے ایک بھیانک خواب ہے۔ بعض اوقات میں حیران ہوتی ہوں کہ ہمارے قبیلے میں طلاق لینا بڑا آسان ہے۔ اس کے باوجود میں کیوں دو سال اس کے ساتھ رہتی رہی ..... کچھ پتہ نہیں لگتا۔ میں چھوٹی تھی اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ آخر کار میں بچے کو لے کر وہاں سے اُٹھ آئی اور پھر واپس نہیں گئی۔

''تم اس سے اس قدر نفرت کیوں کرتی تھیں؟ وہ متشدد مزاج تھا؟

''نہیں، کبھی نہیں، لیکن میں تو اس کی جھلک تک سے بیزار تھی۔ وہ بد بخت، خود غرض، اور بوڑھا شرابی تھا جس نے میری اور میری ضرورتوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ہمارا مسلسل جھگڑا رہتا تھا اور اس کے ساتھ زندگی عذاب سے کم نہ تھی۔

''اس نے کبھی تمہیں مارا بھی تھا؟''

''مجھے مارا؟ اوہ اللہ، کبھی نہیں''

ایک بوڑھی عورت قریب بیٹھی ہماری گفتگو سن رہی تھی بول پڑی ''کوئی طرقوئی مرد اپنی بیوی پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھاتا میں نے ایک طرقوئی مرد کے بارے میں سنا ہے کہ بیوی سے شدید ناراض ہوا اور بیوی کو تھپڑ مار دیا۔ وہ الطالب کے پاس گئی جس نے مرد کو حکم دیا کہ وہ معاوضے کے طور پر بیوی کو ایک بکری دے اور ایک دستاویز پر بھی دستخط کرے جس میں لکھا تھا کہ اگر اس نے دوبارہ یہ ناپسندیدہ حرکت کی تو اس کا فوری نتیجہ طلاق ہوگا۔''

''طرقوئی عورت مار پیٹ کو کبھی قبول نہیں کرتی۔ مار پیٹ تو ہمارے دوسرے قبائل میں بھی نہیں پائی جاتی۔ ہم نے تو پہلی بار بیویوں کو مارنے کے بارے اس وقت سنا جب شہری زندگی سے شروع شروع رابطہ ہوا تھا۔ طرقوئی عورتوں اور مردوں سب کے نزدیک یہ شرمناک حرکت ہے۔ یہاں اگر کوئی طرقوئی مرد کسی بھی سبب اپنی بیوی کو مارے تو قبیلے کا ہر فرد اس پر نفرتیں بھیجتا ہے حتیٰ کہ اس کا جینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سماجی طور پر اسے اتنا بے عزت کیا جاتا ہے کہ وہ خیر اسی میں سمجھتا ہے کہ قبیلہ ہی چھوڑ دے۔ میری ماں کہا کرتی تھی کہ جب میں تمہارے باپ کیلئے کھانا پکایا کرتی تھی تو مجھے یہ حق تھا کہ میں الطالب کے ذریعے اس کا معاوضہ طلب کروں الطالب اس کے شوہر سے کہا کرتا تھا کہ تمہاری بیوی، بیوی ہے تمہاری خانساماں نہیں، پھر وہ اسے یہ کیوں کہتا ہے کہ اس کیلئے کھانا تیار کرے؟ بہرحال یہاں اب عورت اور مرد دونوں کھانا بھی پکاتے ہیں، کھیتوں میں ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور بکریاں اور اونٹ بھی چراتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں ہماری مائیں اور دادیاں نانیاں زیادہ سکھی تھیں اور لگتا ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں سے زیادہ سکھی ہیں۔

میں نے ایک اور بزرگ عورت کولا Kolla سے پوچھا کہ الطّوارق قبیلے میں تعداد ازواج بھی ہے؟

کولا نے سوچا اور بڑے آسانی سے کہنے لگی ''قرآن کے مطابق تو اس کی اجازت ہے لیکن

کوئی طرقوئی عورت شادی شدہ مرد سے شادی نہیں کرے گی اور جب کبھی عورت کو یہ پتہ چل جائے کہ اس کا خاوند کسی اور عورت میں دلچسپی لے رہا ہے تو وہ عورت اپنے خاوند کے پاس پل بھر کیلئے نہیں ٹھہرے گی۔ چنانچہ عملاً زیادہ بڑے اور ممتاز قبائل میں تو تعداد ازدواج کا نام بھی نہیں ہے۔ چھوٹے قبلیوں میں اکا دکا مثال ہوگی۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے طرقوئی مرد سے واقف نہیں جس کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ جن مردوں کی بیویاں مریض ہوتی ہیں۔ اور جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی وہ بھی یا تو ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں یا ان سے طلاق لے کر پھر شادی کرتے ہیں۔

''کیا طلاق لینے کے طریقے آسان ہیں؟''

''ہاں'' فاطمہ ہماری گفتگو میں پھر شریک ہونے کے لیے درمیان میں ٹپک پڑی ''اگر آپ کو اپنا شوہر ہرگز پسند نہیں تو آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جوتے پہنیں اور گھر سے چلی جائیں۔ بعد میں آپ اپنے گواہ الطالب کے سامنے پیش کر کے اپنا فیصلہ بتا سکتی ہیں۔ جب مجھے طلاق دی گئی تھی۔ وہ زندگی کا بہترین وقت تھا۔ ہماری روایات کے مطابق مطلقہ کی ماں قبیلے کے سارے بڑے لوگوں کو اطلاع دیتی ہے۔ کہ اس کی بیٹی کو طلاق ہوگئی ہے اور وہ فلاں تاریخ کو طلاق کی تقریب منعقد کرے گی۔ اس روز مطلقہ اپنا بہترین لباس اور چاندی کے زیور پہنتی ہے ہار سنگھار کرتی ہے اور اس تقریب تیندی (Tendi) (طلاق لینے پر یا لڑکیوں کے ایام شروع ہونے پر خوشی کی اجتماعی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے اسے تیندی کہتے ہیں) میں سب کی آنکھ کا تارا بنی ہوتی ہے۔ یہ تقریب بھی شادی کی تقریب سے کسی صورت کم نہیں ہوتی سبھی قبیلوں سے لوگ بہترین کپڑے پہن کر آتے ہیں مطلقہ کے لیے تحائف لاتے ہیں اور چاندی کے زیور بھی۔ روائت یہ ہے کہ مطلقہ یہ تحائف گھر نہیں لے کر جاتی ضرورت مندوں اور غریبوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اکثر تحائف شادی کی خواہش رکھنے والے مردوں کی طرف سے آتے ہیں اور جو اس بات پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ قبیلے میں شادی کے قابل عورتوں میں ایک اور اضافہ ہوگیا۔ میری تیندی (طلاق پارٹی) پر مجھے دو اونٹ تحفہ کے طور پر دیئے گئے تھے۔ یہ کسی بھی عورت کے لیے سب سے بڑھیا تحفہ شمار ہوتا ہے ایک اونٹ میں نے سنار کو دے دیا جو اپنے پیشے کے لحاظ سے مویشی نہیں پالتا اور دوسرا ایک بہت ہی ضرورت مند خاندان کو۔ ایسے موقع پر ہی کوئی مرد مطلقہ تک پہنچتا ہے۔ اور پھر یہی بعد میں اسے شادی کرنے کی تجویز دیتا ہے مذہبی تعلیمات کے مطابق

صرف ایک بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ عورت طلاق لینے کے بعد سو دن تک شادی نہیں کرے گی۔ظاہر ہے کہ اتنا وقت یہ جاننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اگر مطلقہ کے حمل ٹھہر گیا ہے تو اس کا باپ کون ہے۔

اس تینتدی پارٹی کے بعد چار مرد آئے اور مجھ سے کہا کہ کسی ایک کا انتخاب کرلوں ان میں سے جسے میں زیادہ جانتی تھی اسے چن لیا اور مجھے اس انتخاب پر بڑی خوشی ہے۔اب وہ میرا خاوند ہے،ہم گذشتہ پندرہ سال سے اکٹھے ہیں۔رب کا شکر ہے کہ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں مگر ایک بات ہے کہ اس کے نطفے سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا البتہ پہلے خاوند سے میرا ایک لڑکا ہے۔

''بچے نہ ہونے پر وہ گلہ تو نہیں کرتا؟''

''تو میں یہ سمجھ لوں کہ تم طرقوئی عورت کی حیثیت سے اپنے حالات پر خوش ہو یا تم چاہو گی کہ ان شہری عورتوں کی طرح رہو،جنہیں تم شہروں میں ملتی ہو یا ٹیلی ویژن پر دیکھتی ہو۔''

ہاں طرقوئی عورت کی حیثیت سے میں اپنی زندگی سے خوش ہوں لیکن جب میں استانیوں اور دوسری پیشہ ور خواتین کو دیکھتی ہوں تو اپنے کبھی سکول نہ جانے پر بڑا افسوس ہوتا ہے۔مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ اگر میں پڑھی لکھی ہوتی تو میں بھی اپنی زندگی کا شایان شان مصرف نکالتی ۔1962ء میں الجزائر کی آزادی سے پہلے ہمارے نواح میں کوئی سکول نہیں تھا۔ہمیں ہماری مائیں صرف تیفینار Tifinar (الطّوارق کی تحریری زبان) میں لکھنا سکھاتی تھیں اور ہم طرقوئی زبان بولتے تھے مگر یہ نہ تو قومی زبان ہے نہ ہی درس و تدریس کی زبان ہے اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔میں چاہتی ہوں کہ طرقوئی عورتیں اپنی روایات،اقدار اور رسومات کو قائم رکھیں مگر سکولوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کریں اور ملازمتیں اور پیشے اختیار کریں۔

تم شہری معاشرے کی کون کون سی باتوں کو ناپسند کرتی ہو؟

اس کے بارے میں بھی بتاتی ہوں اگلے روز میں تمزاسیت گئی۔وہاں ایک طرقوئی دوست سے بھی ملنے گئی،جب ہم لوگ چائے پی رہے تھے اور خوش گپیاں چل رہی تھیں کہ ایک ہمسائی جو الجزائر کی رہنے والی ہے۔روتی ہوئی آئی میری دوست کے گلے مل کر روئی اور پھر اس کو اپنی رانیں دکھائیں تھیں جن پر ضربیں لگنے سے نیل پڑ چکے تھے۔اس نے ہمیں بتایا کہ اس کا شوہر اس روز کام سے ذرا جلدی آ گیا وہ گھر میں نہیں تھی،اس نے بتایا کہ وہ ایک سہیلی سے ملنے گئی ہے

لیکن اس نے یہ بات نہیں مانی اور بہت سخت مار پیٹ کے بعد گھر سے باہر دھکیل دیا۔ میں اور میری دوست اس صدمے کے باعث رونے لگیں۔ ہم نے جو سنا اور دیکھا کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا ۔ ہمارے معاشرے میں اس قسم کا وقوعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً اگر میرا خاوند اس وقت گھر پر آئے اور دیکھے کہ اس کا لنچ تیار نہیں ہے تو پھر اسے یا تو انتظار کرنا پڑے گا یا جو کچھ اسے گھر میں ملتا ہے وہی کچھ کھائے گا اور واپسی پر جب اسے بتاؤں گی کہ میں سہیلی سے ملنے گئی تھی۔ وہ میری بات پر ہرگز شک نہیں کرے گا۔

میں نے اپنی شہری خواتین سے پہلی بار غیر شادی شدہ عورتوں کے باکرہ ہونے کی اہمیت کی باتیں سنیں ہم تو اس قسم کی باتوں کو بہت شرمناک سمجھتے ہیں۔ یہ معاملہ تو صرف میاں اور بیوی کے درمیان ہوتا ہے بالکل نجی مگر یہی معاملہ جب کسی خاندان کا حق بن جائے اور اس کے بارے میں سرعام باتیں اور چرچے ہوں اور اسے خاندان کی ناک سمجھ لیا جائے تو ہمارے نزدیک یہ بہت بری بات ہے۔ طرقوئی عورت باکرہ ہے یا نہیں اس کا کوئی اثر اس کی شادی شدہ زندگی پر نہیں پڑتا۔

طرقوئی عورت کی حیثیت سے مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ ہمارا طلاق کا طریقہ بہت سہل ہے طلاق نہ تو معاشرتی خرابی سمجھی جاتی ہے نہ اسے کردار پر داغ دھبہ تصور کیا جاتا ہے۔ جس عورت نے پانچ مرتبہ طلاق حاصل کی ہے اس کے لیے اور اس جیسی غیر شادی شدہ عورت کیلئے شادی کے امکانات برابر کے ہیں۔ کانسٹینٹائن کی ایک سکول ٹیچر میری اچھی دوست تھی وہ طلاق کے لیبل سے بچنا چاہتی تھی ان کے معاشرے میں طلاق کا لیبل یقیناً بڑا خوفناک ہوگا۔ طرقوئی عورتیں سمجھتی ہیں کہ طلاق شادی شدہ زندگی کا بھی ایک روپ ہے۔ اس سے طلاق یافتہ جوڑے کے کردار کا حسن و قبح کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس سے صرف ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ اس جوڑے کا آپس میں گذارا مشکل تھا۔ ایک مطلقہ عورت یہ نہیں سمجھتی کہ وہ ناکام ہوگئی ہے یا اس نے کوئی سماجی یا اسی قسم کی غلطی ارتکاب کیا ہے اور تو اور کنواری اور بن بیاہی ماؤں کے بیاہے جانے کے بھی خاصے امکانات ہوتے ہیں ایسے شخص کے ساتھ جوان کے بچوں کو پالنے کا ذمہ لے لے۔ کئی مردوں نے بن باپ کی بیٹوں کو پالا پوسا جو بہترین مرد ثابت ہوئے اور ایسی بن باپ کی بچیاں بہترین عورتیں بن گئیں۔ آپ کو عورت کی حیثیت سے اپنی اور یورپی عورت میں کیا فرق نظر آتا ہے۔

MashalBooks.org

''گذشتہ بیس سال سے ہمارا علاقہ سیاحوں کی دلچسپی کا علاقہ بن گیا ہے خصوصاً فرانس اور جرمنی کے لوگ اپنی سالانہ چھٹیاں یہاں گذارتے ہیں۔ میرا بھائی ایک فرانسیسی خاتون سے بیاہا ہوا ہے میں نے پیرس میں تین مہینے گذارے ہیں جہاں میں نے اپنے بانجھ پن کے بارے میں ڈاکٹروں سے مشورے لئے۔ مجھے یہ ساری صورت حال انتہائی خوفناک نظر آئی جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عورتوں کو بے یارو مددگار جنسی شئے سمجھا جاتا ہے۔ میرے معاشرے میں عورتیں اپنے آپ کو صرف جنسی شئے نہیں سمجھتیں، انہیں دوست اور شریک سفر سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے قبائل میں زبردستی عصمت دری کا کسی نے سنا تک نہیں۔ یہ تو اتنا دردناک اور تذلیل آمیز معاملہ ہے اور میں سوچتی ہوں کہ دُنیا کا کوئی بھی معاشرہ اسے برداشت کس طرح کرسکتا ہے۔

پیرس میں تین ماہ کے قیام کے دوران مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ جن عورتوں پر تشدد کیا جاتا ہے انہیں رکھنے کیلئے ادارے بھی ہیں۔ مجھے یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ پیرس میں بلکہ یورپ کے سبھی ملکوں میں ہر شعبے میں اتنی بے مثالی ترقی کرنے کے باوجود عورتوں کو مارا پیٹا جاتا ہے۔ مجھے تو اس معاملہ کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ یقین نہیں آتا کہ اس معاشرے میں عورت کا حصہ کس قدر ہے مگر وہ تو اپنے بنیادی حقوق بھی بس معمولی سے ہی حاصل کرسکی ہیں۔ میری رائے میں عورت کا سب سے پہلا اور اہم حق یہ ہے کہ وہ محسوس کرے کہ وہ آزاد اور برابر کی فرد ہے اور جس کی جنس نہ تو کوئی لعنت ہے اور نہ ہی کوئی اعلیٰ استحقاق۔ یہ درست ہے کہ میں ایک عورت کی حیثیت میں ایک خاص صفت کی مالک ہوں، یہ صفت میرے محض ایک خاص جنس سے وابستگی کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی مگر اس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس کا رشتہ معاشرے میں عورت کے کردار کی عظمت سے بھی بندھا ہوا ہے۔ ہماری ماں بننے کی صلاحیت بڑی مقدس شئے ہے۔ تن حنان Tin Hinan الطّوارقی قبائل کی بانی تصور ہوتی ہیں ان کے وقتوں سے لیکر اب تک ہماری ثقفت ہماری ماؤں ہی کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ الطّوارق والوں کی نظر میں تاریخ ثقافت، تعلیم اقدار اور اخلاقیات کا سرچشمہ مائیں ہی تو ہیں۔ وہ ہماری ایک ضرب المثل ہے'' آپ کسی قوم کی ثقافت جاننا چاہتے ہیں تو اس کی عورتوں کی ثقافت کو سمجھئے'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم عورتیں پیار نہیں کرتیں، ہم یقیناً پیار کرتی ہیں، لطف بھی لیتی ہیں مگر ہمیں صرف خوبصورت جسموں کی مالک کی حیثیت سے نہ سراہا جائے بلکہ ہمیں ہوشمند، ذمہ دار اور نفیس افراد سمجھا جائے جو مخلوق انسانی کے برابر ہیں۔ جانتی ہو کہ قبیلے میں شجرہ نسب باپ کی بجائے ماں کی طرف سے چلتا ہے مثلاً اگر

ایک شخص کی ماں کا تعلق محترم قبیلے سے ہے تو اس کا باپ خواہ کتنے ہی چھوٹے قبیلے سے کیوں نہ ہو الہوغر Al Hogger میں جس مرتبہ کیلئے چاہے امیدوار بن سکتا ہے۔ لیکن جس کی ماں غریب قبیلے سے ہے اور جس کا باپ بلاشبہ بڑے اور واجب الاحترام قبیلے سے ہے، قبیلے میں کوئی اہم مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ سو یہ عورتیں ہی ہیں جو معنی رکھتی ہیں چنانچہ میں طرقوئی عورت کا مقام چھوڑ کر میں یورپی عورت یا الجزائر کی شہری عورت کا مقام قبول نہیں کروں گی۔ میں طرقوئی عورت کی حیثیت سے بے حد خوش ہوں البتہ جیسے میں نے پہلے کہا ہے کہ میں چاہوں گی کہ طرقوئی لڑکیاں اپنی روایات، عادات اور مذہب کی مراعات کے ترک کئے بغیر تعلیم حاصل کریں اور اعلیٰ پیشے اختیار کریں۔

جب فاطمہ طرقوئی عورتوں کی بالادستی کے بارے میں مزے لے لے کر مجھے یہ شاندار سبق سکھا رہی تھی میری نظریں سامنے دیوار پر ٹنگے چمڑے کے رنگا رنگ بیگوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا بیگ۔ یہ بیگ بنانے میں اس قدر نفاست آرٹ ذوق اور چابکدستی نظر آتی تھی کہ میں نے ان کے بنانے والوں سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ گھر لے جانے کے لیے کوئی نمونہ خرید بھی لوں۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا ''یہ بیگ طرقوئی عورتیں ہی بناتی ہیں۔ ساری طرقوئی عورتیں تو یہ نہیں بنا سکتیں مگر بہت سی عورتیں یہ بنا لیتی ہیں۔ آپ کو یہ بات جاننے میں دلچسپی ہوگی کہ یہ عورتیں خیمے، سوٹ کیس اور مٹی کے پائپ بھی بنا لیتی ہیں۔ وہ خود خیمے لگاتی ہیں اور وہ بہت سے کام بھی کرتی ہیں جن میں جسمانی طاقت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ مرد زیادہ تر نازک کام کرتے ہیں مثلاً چاندی کے چوڑے، انگوٹھیاں، لیکلیس اور کانٹے اور بندے بناتے ہیں۔

''جان من'' میں واپس روانہ ہونے والی تھی تو بے دھیانی میں ہڑبڑائی ''حیرت ہوتی ہے یہاں کے معاملات کے حوالے سے مردوں اور عورتوں کے بارے میں ہمارے پکے پکائے نظریئے ہمیں کہاں پہنچائیں گے؟''

جب صحارا سے واپسی کا وقت آیا تو مجھے یہاں پر بنائے گئے رابطوں سے رخصت کے وقت بڑا دکھ ہوا۔ تین عورتوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں آئندہ جب کبھی ادھر آئی سیدھی ان کے گھر آؤں گی اور ہوٹل کا دل میں خیال تک نہ لاؤں گی جب وہ مجھے ہوائی اڈے پر الوداع کہنے

آئیں تو ہماری آنکھوں نے ایک دوسرے کو محبت اور گرم جوشی کا پیغام دیا۔ جب میں طیارے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں تو میرے دل میں یہ خیال ابھر رہا تھا کہ صحارا جیسے علاقے میں بھی ان لوگوں سے اتنی تیزی اور آسانی کے ساتھ دوستی کے پل بنائے جا سکتے ہیں۔ جو پہلی نظر میں ہم سے کس قدر مختلف نظر آتے ہیں۔ لگتا تھا یہ بڑی نا قابل یقین بات ہے۔ شاید انسانیت یا انسان ہونا اسی کا نام ہے طیارے میں بیٹھے بیٹھے میں نے عربی میں ایک نظم لکھی: یہ نظم بڑے طویل عرصے کے بعد لکھی گئی تھی۔ ایک بار پھر الفاظ مکمل طور پر میرے قابو میں تھے۔ اور لگتا ہے کہ ان شاندار لوگوں کی نسبتاً سادہ زندگی اور برمحل کارناموں نے میرے ان زخموں پر پھاہے رکھنے شروع کر دیئے ہیں جو میرے اندر برسوں سے رستے چلے آئے تھے۔ خیموں اور جھگیوں میں رہنے والوں نے اپنی انسان دوستی، محبت، پیار اور اپنی اعلیٰ اقدار سے انسانیت کے بارے میں ایک نیا سبق سکھایا تھا اور میری اندر نسل اور جنس کی بنیاد پر امتیازات کے خلاف نفرت اور شدید ہو گئی ۔

اس سفر میں مجھے زندگی کا ایک انتہائی اہم تجربہ ہوا عورت کی حیثیت سے میں نے دیکھا کہ الطّوارق سوسائٹی میں عورتوں کو ایک نادر قسم کی آزادی حاصل ہے اور بلاشبہ اس آزادی اور اس کے منطقی جوازوں کا تاریخی سرچشمہ بھی جو تمام عرب ممالک کے قوانین کا سرچشمہ ہے یعنی قرآن کریم اور پیغمبر اسلام کی احادیث۔ مگر دوسرے ان عرب ممالک کے مقابلے میں جہاں میں گئی ہوں، یہاں مردانہ غلبہ کو اس امر کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ ہماری قدیم تعلیمات کو اس طرح منسخ کرے کہ وہ عورتوں کے مفادات کو نقصان پہنچانے لگیں۔ میں نے ایک ایسا مسلم معاشرہ دیکھا جہاں عورتیں نہ تو نوکرانیاں ہوتی ہیں نہ مردوں سے کم تر، جہاں بچے جننے کی صلاحیت کو جبر اور غلامی کی آڑ بنانے کی بجائے قابل فخر اور عظمت مآب سمجھا جاتا ہے۔

MashalBooks.org

پس چہ باید کرد

میں نے جن خواتین کے انٹرویو کئے ہیں اگر دس برس پیشتر ان سے گفتگو کی گئی ہوتی تو ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے والد یا شوہر کے خلاف بات تک نہ کرتی کیونکہ اس بات کو پورے خاندان کے لیے باعث ننگ قرار دیا جاتا۔ مگر اب وہی عورتیں اپنے آپ کو باپوں اور خاوندوں سے الگ کر کے اپنے وجود کو ان سے الگ اور آزاد حیثیت میں دیکھنے کی اہل ہوگئی ہیں۔ یہ نیا روز افزوں شعور اور عورتوں کی طرف سے اپنی شناخت، حقوق اور صبر آزما مصائب پر زور دینا دراصل عورتوں کو مجبور و مقہور رکھنے والی طاقت کو للکارنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ مشاہدہ اور تحقیق دونوں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بڑھتا ہوا شعور عرب خواتین میں تیزی سے عام ہو رہا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں ان کے رویوں میں قابل ذکر تبدیل بھی آئی ہے۔ جب 1981ء میں" چھ برس پیشتر) میں نے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کر لی تھی تو مجھے معاشرہ نے اچھوت بنا دیا تھا۔ اور تو اور دمشق یونیورسٹی میں الادب کالج کے ڈین نے مجھے کہا "تمہیں کس نے مجبور کیا کہ اپنے خاندان کو چھوڑ دو اور ایک عراقی سے شادی کر لو۔" لیکن اب 1987ء میں میں ان عورتوں کیلئے صرف توصیفی کلمات اور حوصلہ افزا باتیں سنتی ہوں جنہوں نے خاندان کے دباؤ یا سماجی مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی سے شادی کی۔

میں نہیں چاہتی کہ اس تبدیلی کو اپنی ان بزرگ خواتین کی طرح جنہیں میں نے انٹرویو کیا ہے حرف آخر سمجھ لوں۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ شام کی عورت پہلے ہی تمام لڑائیاں لڑ کر جیت بھی چکی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اب انہیں صرف یہ کرنا ہے کہ وہ گھروں کے اندر والی جنگ پر ڈٹ جائیں۔ یہ بہت بڑی خوش فہمی ہے میں نے جن چار عرب ممالک کا جائزہ یہاں پیش کیا ہے وہاں کی خواتین کو برابر کی تنخواہ اور برابر کے مواقع کی یقین دہانی تو کرائی گئی مگر انہیں ایک باوقار اور باعزت زندگی گذارنے کے لیے برابر کے حق کی ضمانت نہیں دی گئی۔ شام لبنان اور مصر میں پرسنل سٹیٹس لا کی دفعہ 70 میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر نکاح نامہ میں خصوصی اندراج نہیں ہے یا کسی

جج کو اس کے سفر نہ کرنے کے لیے وزنی جواز مل گیا ہے تو اس استثناء کو چھوڑ کر بیوی خاوند کے سفر کی پابند ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ خاوند جہاں بھی جائے بیوی کا فرض ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جائے۔ آرٹیکل 73 فیصلہ صادر کرتا ہے کہ بیوی خاوند کی مرضی کے بغیر کام کاج (ملازمت وغیرہ) کی خاطر گھر سے باہر نہیں جاسکتی۔ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو خاوند مجاز ہے کہ اس کا نان نفقہ بند کردے، اسے نظر انداز کردے اسے قانونی طور پر ناشیز Nashez (نافرمان) قرار دے دے اور یہ بات عدالت میں اس کی طرف سے طلاق لینے کے امکانات پر سنگین اثرات ڈالے گی۔ آرٹیکل 307 کا پیراڈی بتاتا ہے۔ کہ مرد جس عورت کے ساتھ شادی کر رہا ہے وہ کنواری نہ نکلی تو اسے یہ حق ہے کہ فوری طور پر اسے طلاق دے دے اسے جہیز (بری) واپس لینے کا بھی حق ہے۔ ..... تعزیزی قانون میں ایک اور آرٹیکل ہے ..... یہ تمام عرب ممالک میں لاگو ہے اور عرب عدالتوں میں بڑا موثر بھی ..... اس آرٹیکل کے مطابق اگر کوئی مرد اپنی بہن یا ماں کو کسی مرد کے ساتھ (جنسی اعتبار سے) قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر اسے قتل کر دیتا ہے تو اس کی سزائے قید چھ ماہ سے زائد نہیں ہوگی کیونکہ اس نے اپنا ناموس بچانے کیلئے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس آرٹیکل میں دو اور غیر تحریر شدہ اضافے ہیں جو عدالتی کاروائی میں موثر قرار دیئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ اگر مرد بہن یا ماں کی اس حرکت سے باخبر ہونے کے ایک سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گذرنے پر قتل کا مرتکب ہوتا ہے۔ (قانون یہ کہتا ہے کہ جیسے ہی وہ اس حرکت کی خبر پاتا ہے اس لمحے قتل کا ارتکاب کرے تو .....) تو پھر بھی اس کو یہی رعایت دی گئی ہے۔ دوسرا اضافہ یہ ہے قتل کا یہ اختیار بظاہر صرف بھائی اور باپ کو دیا گیا ہے لیکن ان خاوندوں پر بھی لوگو ہوتا ہے جو اپنی بیویوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

ان کھلی اور واضح قانونی جنگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے باریک مگر اہم معاملات ہیں جن کے بارے میں عرب خواتین کو جدوجہد کرنا ہے۔ ملازمت پیشہ، کارکن، اور پڑھی لکھی خواتین کی بہت بڑی شرح ہے جسے انتخاب کرنے اور آزاد زندگی گذارنے کا حق حاصل نہیں۔ مثلاً گھر کے سارے کام کاج کا بوجھ ان کی ذمہ داری ہی کیوں ہو، ایک مشکل کیریئر کے حصول کی تگ و دو میں اپنا استحقاق نہ سمجھنے کا احساس ندامت۔ اور یہ وہ حق ہے جس کا حصول تعلیم اور ملازمت کے حق سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ عرب عورتوں نے اس کتاب میں جن گھریلو ناانصافیوں اور بدسلوکیوں پر زور دیا ہے ان کا خاتمہ اس لئے بھی مشکل کام ہے کہ مرد کا نسائت

کے بارے میں جو تصور ہے۔ یہ ناانصافی اور بدسلوکی اس کا بہت گہرا اور مضبوط حصہ ہے۔

اگر یہ خیال کیا جائے کہ میں نے شام، لبنان، فلسطین اور الجزائر کی عورتوں کے معاملات کا ایک ہی ڈھیر بنا دیا ہے تو اس لئے کہ ان کے حالات بتاتے ہیں کہ قومی اور مقامی اختلافات کے باوجود ان سب کے مسائل اصلاً ایک سے ہیں۔ ان ملکوں میں عورتوں کے تجربات سے یہ بات ہویدا ہوتی ہے کہ عورتیں جب تک اپنے حقوق کی جنگ جاری نہیں رکھتیں اس وقت تک انہیں قومی جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ ماضی میں یہ قاعدہ خود عورتوں نے ہی بنالیا تھا کہ وہ گمنام سپاہی ہی رہیں گی جس کی جدوجہد کا واحد صلہ ذاتی اطمینان اور روحانی سکون ہے۔ شام، الجزائر، فلسطین اور لبنان کی تمام قومی جنگوں میں عورتوں نے حصہ لیا ہے مگر انہوں نے سیاسی اقتدار، اعلیٰ مقام یا وقار حاصل کرنے میں کہیں بھی دلچسپی نہیں لی چنانچہ وہ اپنی ہی محنت کے پھل سے مستفید ہونے میں ناکام رہیں۔ مثلاً لبنان کی عورتوں نے اسرائیلی غاصبوں کے مقابلے کے لیے ایسے ایسے طریقے سوچے اور آزمائے کہ وہ روائتی تصور بھی چکنا چور کر دیا کہ عورت کمزور اور بزدل ہوتی ہے۔ لبنان کی جن خواتین سے میں نے انٹرویو کئے انہیں یقین کامل ہے کہ جو معرکے وہ سر کر چکی ہیں وہاں سے انہیں پیچھے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ اس اعتماد کے باوجود حال ہی میں بیروت میں عورتیں ہی مذہبی انتہا پسندوں کا نشانہ بنیں۔ ان انتہا پسندوں کو تھوڑا سا سیاسی اقتدار حاصل ہوا تو اُنہوں نے ان خواتین کو گھر بھیجنا شروع کر دیا جو ترقی یافتہ تھیں، پتلونیں پہنتی تھیں پھر انہیں یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ چادر کے بغیر کبھی گھر سے نہ نکلیں۔

میرے خیال میں یہی وقت ہے کہ عرب عورتیں یہ سبق سیکھ لیں کہ وہ اپنا نقصان کر کے مردوں کی جنگیں نہیں لڑیں گی۔ میرے خیال میں مستقبل میں ہمیں جو جدوجہد کرنی ہے اس کے لیے اولاً ہر شعبہ اور ہر طبقہ میں عورتوں کے حقوق و مقام کے بارے میں بیداری پیدا کی جانی چاہیے۔ مجھے اُمید ہے کہ جب میری بچیاں جوان ہوں گی اس وقت تک اس کتاب میں بیان کئے گئے دردناک واقعات قصہ پارینہ بن چکے ہوں گے۔

MashalBooks.org